آئینۂ ایام

از

کرنل غلام سرور

یشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد ۔ کراچی ۔ لاہور ۔ پشاور ۔ کوئٹہ ۔ سکھر ۔ ملتان

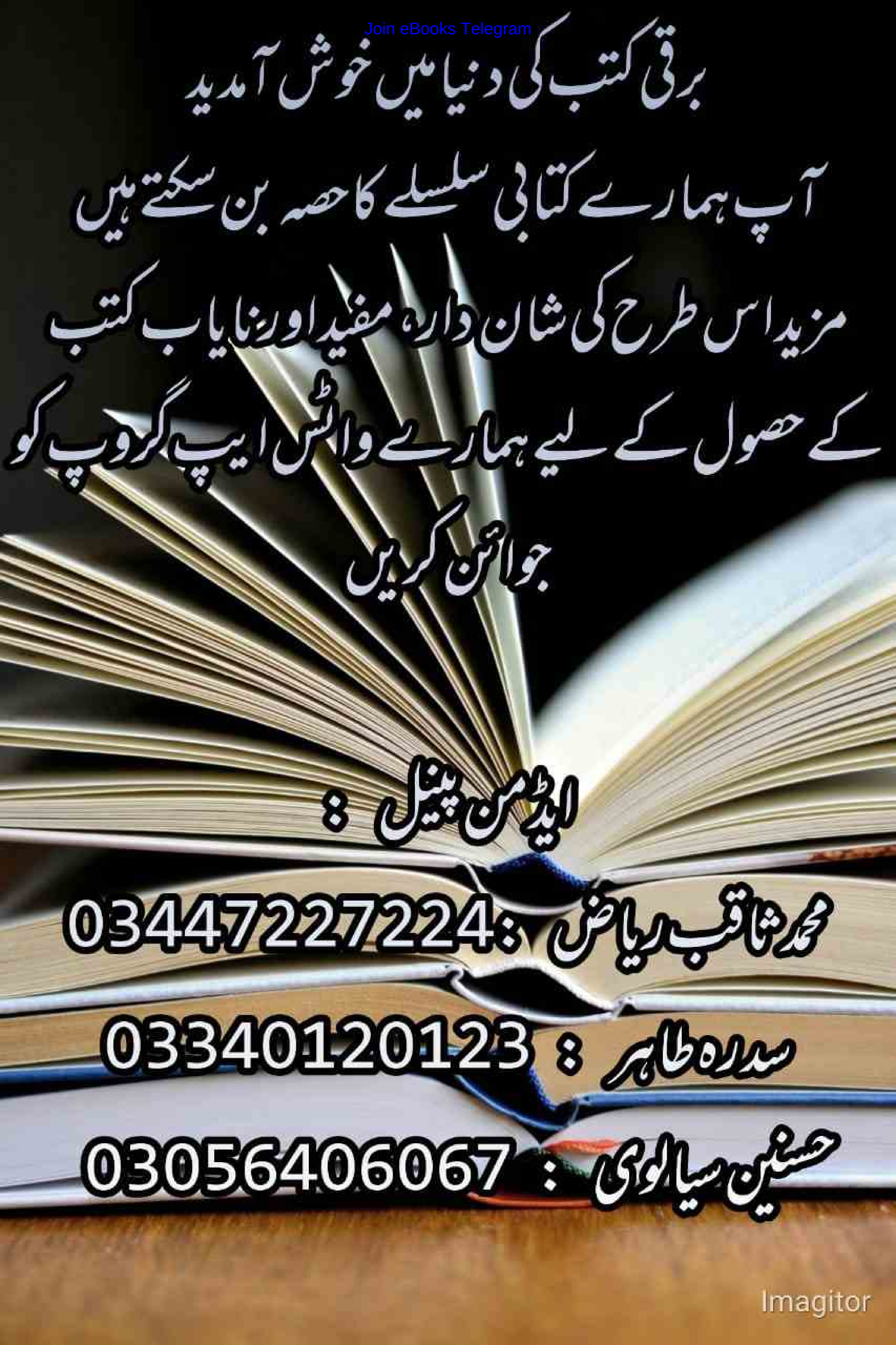

برقی کتب کی دنیا میں خوش آمدید
آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں
مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب
کے حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو
جوائن کریں

ایڈمن پینل :

محمد ثاقب ریاض : 03447227224
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

Imagitor

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول —— ۱۹۸۱ء
تعداد —— ایک ہزار
قیمت —— مجلد -/۵۵ روپے
غیر مجلد -/۵۰ روپے

ناشر:- نیشنل بُک فاؤنڈیشن، کراچی
طابع :- آئیڈیل پیکیجز کراچی ۱

انتساب

ننھے نواسے کاشف
عرف مٹھو کے نام
جس کی ولادت باسعادت نے
مجھے
ایک ولولۂ تازہ
عطا کیا۔

اظہارِ تشکر

"آئینہ ایام" کی چند قسطیں وقفے وقفے سے ملک کے نامور جریدوں میں شائع ہوئی ہیں۔ میں ان ہزارہا قارئین کا تہ دل سے ممنون ہوں، جنہوں نے مجھے مبارکباد کے خطوط لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

جناب احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر محمود الرحمٰن، جناب محمد علی صدیقی، جناب ریاض فرشوری کے زریں خیالات اس کتاب میں شامل ہیں۔ میں ان کی کرم فرمائی کا بے حد شکر گزار ہوں۔

برادرم پروفیسر سید علین الدین علوی کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوشگوار فریضہ ہے۔ آپ نے کتاب کے مسودے کو گہری نظر سے دیکھا اور اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے نوازا۔ محترمہ ڈاکٹر صفیہ بانو، محمد اسلم ڈوگرا اور پروفیسر شفقت اقبال کے قیمتی مشوروں نے میری رہنمائی کی۔ ان سب کا میں تہ دل سے ممنون ہوں۔

حرفِ آغاز

"آئینۂ ایام" کا بیشتر حصّہ میرے کھانے کی میز پر ترتیب دیا گیا۔ تفصیل یہ کچھ یوں ہے کہ میری بے ہنگم مصروفیات، مجھے ہر لحظہ الجھائے رکھتی ہیں اور اتنی مہلت نہیں دیتیں کہ میں اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ کر سکون اور یکسوئی کے ساتھ کسی مسئلہ پر گفتگو کر سکوں۔ زندگی ہے جو دیوانہ وار دوڑے چلی جا رہی ہے اور اپنی حالت یہ ہے کہ "نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

ان حالات میں مجھے فراغت کی جو چند ساعتیں میسر آتی ہیں۔ ان سے میں بھرپور فائدہ اٹھاتا ہوں۔ ایک طویل عرصہ تک میرا معمول یہ رہا ہے کہ کھانے سے فارغ ہو کر میں ہر روز بچوں کو اپنے بچپن کے حالات سنانا شروع کر دیتا۔ وہ اس کہانی میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے۔ گاہے، ان کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی، گاہے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ کہانی، دھیرے دھیرے اسی طرح آگے بڑھتی رہی۔

پھر مجھے معاً یہ خیال آیا۔ اگر اس کہانی کو کتابی شکل دے دی جائے۔ تو شاید پڑھنے والوں کو اس میں اپنی دلچسپی کا بھی کچھ مواد مل سکے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے اپنی کہانی کو ضبطِ تحریر میں لانے کا پروگرام بنایا۔ میں سمجھتا تھا، یہ کافی آسان کام ہے۔ مگر اس کوچے میں قدم رکھا ہی تھا کہ عملی مشکلات نے چاروں طرف سے آن گھیرا۔ اور پھر مجھے اس بات کا شدت سے احساس ہوا۔ کہ سچ بولنا واقعی بہت مشکل کام ہے۔ اصل میں یہ سوئی کے ناکے سے گزرنے کا عمل ہے۔ اور پھر لفظوں کی دیانت تو سوا نیزے سورج کا عذاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر ادب تخلیق کرنے والوں کی غالب اکثریت، اتنے نیچے سورج تلے کھڑے ہو کر، اپنے آپ کو بھسم کر ڈالنا پسند نہیں کرتی۔

اُدھر میں نے اپنے لئے عمداً ایک مشکل راستے کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے اپنی کسی کمزوری کو ”اورکوٹ“ تلے ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی۔ اورکوٹ پہنانا تو دور کی بات ہے۔ میں نے تو تانگے کے پائیدان پر کھڑے ہو کر اور اپنا گریباں چاک کر کے، لوگوں کو اپنے قریب بلایا ہے۔ تاکہ وہ میرے زخمی دل کی کیفیات اچھی طرح سے دیکھ سکیں۔

”آئینہ ایام“ بنیادی طور پر میری ذات کے اردگرد گھومتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ اپنے معاشرے کی سچی تصویر بھی پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی پچاس سالہ کینوس پر محیط ہے۔ آپ اس میں ان قدروں کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ جو اب تیزی سے مٹتی جا رہی ہیں۔ اور ان قدروں کا دھندلا سا خاکہ بھی آپ کو دکھائی دے گا۔ جو اب صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو رہی ہیں۔ مٹنے والی تہذیب اور ابھرنے والی تہذیب کا تقابلی مطالعہ ہی ”آئینہ ایام“ کا اصل موضوع ہے۔

نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی   کرنل غلام سرور

پیشِ کلام

کرنل غلام سرور سے میری محاورے والی یاد اللہ بھی نہیں ہے۔ ایک رسمی اور مختصر سی تعارفی ملاقات کے سوا ان کے اور میرے درمیان کبھی کوئی رابطہ نہیں رہا۔ ہاں میں نے ان کے بعض اردو انگریزی مضامین پڑھ رکھے تھے اور جانتا تھا کہ یہ صاحب اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ پھر ایک دن راولپنڈی سے ان کا خط آیا کہ انہوں نے آپ بیتی لکھی ہے اور ان کی خواہش ہے کہ میں اس آپ بیتی کے بارے میں بطور پیشِ کلام اپنے تاثرات کا اظہار کروں۔ اس فرمائش میں اتنی معصومیت اور بے ساختگی تھی کہ میں نے ان سے آپ بیتی کا مسوّدہ، طلب کر لیا۔ ایک لمبا چوڑا بھاری بھرکم پارسل میرے نام پہنچا تو میں سمجھا کسی مہربان نے مجھے کسی قیمتی تحفے سے نوازا ہے، مگر پارسل کھولا تو اندر سے مسوّدہ نکلا۔ کتابوں کے مسودے اتنے وزنی نہیں ہوتے کہ عمر بھر مسوّدات اٹھائے رکھنے والے ہاتھ دھوکا کھا جائیں مگر یہ مسودہ ہی تھا۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ

بیشتر وزن دونوں حصوں کی موٹی موٹی جلدوں کا تھا۔ میں نے مسودہ ایک طرف رکھ دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ جب میں ”فنون“ کے لئے موصول ہونے والے مضامین اور افسانے پڑھنے کے لئے بھی مہینوں تک وقت نہیں نکال سکتا تو ۵۹۴ صفحات پر مشتمل اس آپ بیتی کا مطالعہ کرنے اور پھر اپنے تاثرات قلم بند کرنے کا وقت مجھے کہاں سے ملے گا۔ کرنل صاحب کے خطوط آتے رہے اور میں سلیقے سے ٹالتا رہا، مگر پھر ایک رات جب میں لکھنے پڑھنے کا معمول نمٹا چکا تھا اور نیند ابھی نہیں آئی تھی تو میں نے کرنل سرور کے اس مسودے کی پہلی جلد اٹھالی، اس کی گرد جھاڑی اور ابتدائی صفحات پر نظر ڈالی تو میں سنبھل کر بیٹھ گیا کچھ ایسا لگا جیسے کرنل سرور نے آپ بیتی لکھنے کے بہانے میرے سوانح لکھ ڈالے ہیں۔ مجھے اس روداد سے اتنی اپنائیت محسوس ہوئی کہ پورے کا مطالعہ میں نے رات تین چار بجے تک ختم کر لیا اور جب سویا تو گو میں بہت منتشر خواب دیکھتا ہوں مگر اس رات اپنے بچپن کے، اپنے گھر کے، اپنے بزرگوں کے، اپنے اسکول اور کالج کے، اپنے دوستوں اور استادوں کے نہایت مربوط خواب دیکھے۔ کرنل سرور کی آپ بیتی کے ماحول اور واقعات نے میرے اندر اپنے ماضی کی بازیافت کی فلم چلا دی تھی۔ دوسرے روز میں نے اپنے تاثرات کے چند عنوانات ایک کاغذ پر لکھے اور اس کے بعد اپنی ادبی اور غیر ادبی مصروفیتوں کے جنگل میں بھٹک گیا۔

چند روز پہلے کرنل غلام سرور لاہور آئے تو میرے ہاں بھی تشریف لائے۔ میں نے وعدہ کیا کہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے اندر مختصر تاثرات لکھ دوں گا مگر یہ ایک ہفتہ بھی میری مصروفیات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آج مسودہ سامنے میز پر پڑا دیکھا تو سخت ندامت محسوس ہوئی۔ اپنے تاثرات کی سرخیوں کی سلپ بہزار دقت ڈھونڈ نکالی مگر ان تاثرات کو تازہ کرنے کے لئے مسودے پر شروع سے آخر تک

ایک بار پھر نظر دوڑائی اور اب لکھنے بیٹھا ہوں تو محسوس کر رہا ہوں کہ میں اس تحریر سے کما حقہ انصاف نہیں کر سکوں گا۔ میرے پیش نظر اختصار ہے کیونکہ میری رائے میں کتابوں کی بہت طویل تمہیدیں اس امر کا اعلان ہوتی ہیں کہ تمہید نگار اور مصنف کو ان کتابوں کے قارئین کے ذوق اور لگن پر کچھ زیادہ اعتماد اور اعتبار نہیں ہے مگر واقعات سے اٹی ہوئی ایک زندگی پر سے طائرانہ گزرنا بھی بے انصافی ہے۔ بہرحال میں اس بے انصافی کے لئے تیار ہوں کیونکہ مجھے اردو ادب کے قارئین پر ہمیشہ بڑا اعتماد رہا ہے اور میرے نزدیک یہ حضرات ہماری تہذیبی زندگی کا نہایت معتبر عنصر ہیں۔ میرا کام اس آپ بیتی کا صرف تعارف ہے۔ آپ بیتی کے معیار و خوبی کے بارے میں فیصلہ خود قارئین کریں گے۔

شاید کوئی پندرہ برس پہلے کا ذکر ہے، میں نے ایک ادبی کالم میں پاکستان کے اہل قلم سے پوچھا تھا کہ ہمارے ہاں آپ بیتیاں کب لکھی جائیں گی۔ کرنل سرور کی یہ آپ بیتی میرے اس سوال کا ایک مثبت جواب ہے۔ آپ بیتی کوئی بھی لکھے، وہ بادشاہ ہو یا کسان، وزیر ہو یا مزدور، ملکہ ہو یا طوائف، فوجی افسر ہو یا خوانچہ فروش ادیب ہو یا پٹواری، میں سمجھتا ہوں کہ ہر آپ بیتی ایک صحیفۂ حیات ثابت ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ بیتی سنانے والا سچ بول سکتا ہو، اور اظہار پر کسی حد تک قدرت رکھتا ہو۔ ادب میں آپ بیتیوں کے اضافے سے ادب زیادہ پُرمایہ اور متنوع اور بوقلموں ہو سکتا ہے اور کرنل سرور کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے ”آئینہ ایام“ لکھ کر اس فراموش شدہ صنف ادب کو نہ صرف زندہ کیا ہے بلکہ اسے خاصا باثروت بنا دیا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ”آئینہ ایام“ میں کرنل سرور نے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ بلاشبہ ان کی زندگی کے بعض گوشے سامنے نہیں آسکے

ہوں گے مگر انہوں نے اپنی زندگی کے جن گوشوں کے بارے میں لکھا ہے ، وہ اپنی پوری جزئیات کی تفصیل کے ساتھ واضح ہو گئے ہیں۔ مصنف نے ان کے سلسلے میں کوئی لگی لپٹی نہیں اٹھا رکھی۔ اگر انہوں نے بچپن افلاس میں بسر کیا تو اسے چھپایا نہیں ہے اور یوں نمود و نمائش کے مصنوعی معیاروں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ اگر انہوں نے چوری کی مونگ پھلی سے اپنی جیبیں ٹھونس لی ہیں تو صاف صاف کہہ دیا ہے کہ انہوں نے چوری کی۔ اگر طفلی میں ان کی ماں انہیں افیم کھلاتی رہی ہیں تو اس ذکر کو انہوں نے گول نہیں کیا۔ بظاہر یہ ننھی ننھی سی باتیں ہیں .. مگر "بڑے بڑے لوگ" ان ننھی ننھی باتوں سے کترا کر نکل جاتے ہیں کہ کہیں وہ چھوٹے نہ نظر آنے لگیں، حالانکہ انسانی اور ماحولی کمزوریاں سبھی میں ہوتی ہیں اور ہم آدمی اس لئے ہیں کہ فرشتے نہیں ہیں۔ آج کرنل سرور فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں مگر یہ اعلیٰ عہدہ انہیں گمراہ نہیں کر سکا چنانچہ سچ بولنے سے نہیں روک سکا۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے سچ بول کر وہ میری نظر میں بہت بڑے ہو گئے ہیں۔

اپنے والدین، اپنے بھائیوں بہنوں، اپنے بیٹوں بیٹیوں اور اپنے دوستوں ساتھیوں کا ذکر وہ اتنی بے حدود محبت سے کرتے ہیں کہ ان کی شرافت اور نجابت پر پیار آنے لگتا ہے۔ موجودہ زر پرست معاشرے میں یہ رشتے اپنی اہمیت کھو رہے ہیں اور رشتہ داری بھی کاروباری نوعیت اختیار کرتی جا رہی ہے چنانچہ اس صورت حال میں کرنل سرور کا اپنوں کے ساتھ یہ والہانہ عشق، انسانی سیرت کے ایک نہایت حسین پہلو کو زندہ رکھنے کا ایک ایسا عمل ہے جس سے مغرب کا مشین زدہ معاشرہ تیزی سے دست کش ہو رہا ہے اور مشرق بھی آہستہ آہستہ مغرب ہی کی پیروی کی راہ پر گامزن ہے، حالانکہ رشتوں کے تقدس کا خاتمہ انسانیت کے چہرے کے سارے حسن کو نوچ اور نچوڑ کر پھینک سکتا ہے۔ اپنے عزیزوں اور دوستوں اور

استادوں اور رفیقوں کے ساتھ یہ غیر مشروط اپنائیت کرنل سرور کی آپ بیتی کے حسن میں بے پناہ اضافے کا موجب بنی ہے۔

کرنل سرور نے اپنے دینی اور سیاسی اور معاشرتی نظریات کا اظہار بھی دو ٹوک انداز میں کیا ہے۔ جب وہ اپنے نظریات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں کسی قسم کے تحفظات نہیں ہوتے، نہ وہ ان نظریات کے مضرات سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ یہ بڑی حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کی بات ہے۔ آپ کو ان سے اختلاف ہو سکتا ہے مگر ان کے خلوص نیت پر اعتراض نہیں ہو سکتا اور آپ بیتی وہی کامیاب ہوتی ہے جس کی بنیاد خلوص و صداقت پر ہو۔

"آئینہ ایام" میں بے شمار اشخاص چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس آپ بیتی کے نصف آخر پر تو اشخاص ہی اشخاص چھائے ہیں۔ میں نے انہیں شخصیات نہیں لکھا کہ کہیں ارباب فکر و دانش خفا نہ ہو جائیں حالانکہ ہر انسان کا اپنا ایک منفرد تشخص ہوتا ہے چنانچہ ہر شخص ایک شخصیت ہے۔ مگر اس بحث میں الجھنے کا یہ محل نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کرنل سرور کی آپ بیتی میں اشخاص کی فراوانی ہے۔ ان اشخاص کے آئینے میں مصنف نے گزشتہ نصف صدی کا پورا معاشرہ اور اس کی پوری تہذیب زندہ کر دکھائی ہے۔ اشخاص کی طرح مصنف نے بعض بظاہر معمولی واقعات بھی درج کر دیئے ہیں اور بعض بظاہر غیر اہم باتوں کو بھی کھل کر بیان کیا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے بغیر نصف صدی کے تہذیب و تمدن اور معاشرتی و معاشی ماحول کی وہ تصویر مکمل ہی نہیں ہو پاتی جس کا کینوس "آئینہ ایام" کی صورت میں ہمارے سامنے پھیلا دیا گیا ہے۔ خاقان خاور نے کیا عمدہ شعر کہا ہے ؎

چھوٹے لوگوں نے بڑے لوگ بنائے خاور
ندیاں جیسے جنم دیتی ہیں دریاؤں کو

کرنل سرور کا اسلوب بیان نہ صرف رواں ہے بلکہ شگفتہ بھی ہے۔ وہ پڑھنے والے کو کہیں بھی اکتانے نہیں دیتے اور پھلجھڑیاں سی چھوڑتے چلے جاتے ہیں بے شک ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں مصنف کے مزاح کا معیار زیادہ اونچا نہیں ہو پاتا مگر ان کی یہی خوبی کیا کم ہے کہ شروع سے آخر تک ان کے لبوں پر مسکراہٹ رہی ہے۔ آزمائشوں میں سے گزرتے ہوئے بھی ان کی مسکراہٹ نہیں بجھ سکی اور اس مستقل مسکراہٹ پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جسے زندگی سے پیار بھی ہو اور اپنی توانائیوں پر اعتماد بھی ہو۔

اتنی سلیس سادہ، سچی اور کھری آپ بیتی لکھنے پر میں کرنل سرور کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی

۲- اپریل ۱۹۸۱ء، لاہور

چند مشاہیر کی آرا

ڈاکٹر جمیل جالبی

"آئینہ ایام" ایک ایسے شخص کی کہانی ہے۔ جو سچائی کے ساتھ، اپنی محنت اور جد و جہد کی کہانی سنا کر دوسروں میں بھی عزم و محنت کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ اس کہانی میں ایک اخلاقی درس چھپا ہوا ہے۔ جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے۔ پھر یہ آپ بیتی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ واقعات کے ساتھ ماحول اور گرد و پیش کی زندگی کی واضح اور گہری تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

کرنل غلام سرور نے "آئینہ ایام" میں اپنی زندگی کو موضوع بنا کر ایک ایسا ناول لکھا ہے۔ جو دلچسپ بھی ہے اور رنگارنگ بھی، اس کی عبارت ایسی رواں دواں ہے، جیسے اونچے پہاڑ کی ڈھلوان سے بہنے والا چشمہ۔

ڈاکٹر وحید قریشی

"آئینۂ ایام" کرنل سرور کی آپ بیتی ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے تو جگ بیتی بھی ہے۔ انہوں نے اپنا کچا چھٹا ہی بیان نہیں کیا۔ دوسروں کے نفسیاتی پوسٹ مارٹم بھی کر دیئے ہیں۔ سختی اور نرمی کا امتزاج "آئینۂ ایام" کے اسلوب کا امتیازی وصف ہے۔ ان کا یہ دھیما، لیکن کھردرا اسلوب اپنی الگ شان رکھتا ہے۔

کرنل غلام سرور کی زندگی نمود و نمائش سے خالی ہے۔ جہدِ مسلسل کی زندگی ہے۔ انہوں نے اپنی قوتِ بازو سے اپنا مستقبل بنایا ہے۔ اور اپنے ہی تیشے سے جوئے شیر نکالی ہے۔ ان کے ہاں، مبلغین کا جوش و خروش نہیں۔ ایک دھیما پن ہے۔ استدلال میں مزاح کی ہلکی ہلکی آمیزش رکھتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پہ انسانی نفسیات کی تصویر کشی کے ماہر ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس وسیع کائنات میں ایک فرد کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جو سارے زمانے کی خوشیاں سمیٹ کر دوسروں کے حوالے کرتا ہے۔ اور اپنے غم ہی اکیلے برداشت کرنے کی کوشش میں مبتلا ہے۔ وہ اپنی خامیوں سے بھی آگاہ ہے اور انہیں چھپانے یا ان کی تاویل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

"آئینۂ ایام" کا بنیادی وصف یہ ہے کہ جب اسے کرنل غلام سرور کے آئینۂ گفتار میں رکھ کر دیکھئے تو یہ محض خود نوشت نہیں رہتی۔ بلکہ سادہ و پرکار لہجہ کی غزل کا ایسا ساز بن جاتی ہے کہ عمرِ رفتہ کو آواز دینے کو

کو جی چاہتا ہے۔ ان کے قلم میں بلا کا جادو ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں خواہ اس کا تعلق فلسفہ و نفسیات کے گہرے اور پیچیدہ مسائل سے کیوں نہ ہو۔ بے تکلف کہتے چلے جاتے ہیں اور کچھ ایسے میٹھے، نرم، دھیمے رواں اور طلسمی انداز سے جیسے کسی الف لیلوی شہزادے کی کہانی سنا رہے ہوں۔ یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ خود نوشت نہیں لکھ رہے۔ سامنے بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ باتیں بھی کیسی، جنہیں سننے کے بعد آدمی سر دھننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

محمد علی صدیقی

کرنل غلام سرور کی یادداشتوں کا مجموعہ "آئینہ ایام" اپنی گوناگوں صفات کی وجہ سے ایک اہم دستاویز شمار ہو گی۔ کرنل صاحب نے اس بے تکلف اسٹائل کی یادداشت میں اپنی زندگی کے مختلف ادوار پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ بلاشک و شبہ صاحبِ اسلوب سوانح نگار کے طور پر ابھرے ہیں۔ وہ سب کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں اور "حدود" سے متجاوز ہونا بھی نہیں چاہتے۔ اس طرح یہ کتاب محض ایک شخص کی ورق ورق زندگی کی شیرازہ بندی نہیں رہ پاتی۔ بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے زندگی ـــ گزری ہوئی زندگی ـــ اپنی چھب دکھلانے واپس آگئی ہو۔ ایک دور اپنی تمامتر مفید مطلب جزئیات کے ساتھ زندہ ہو جاتا ہے۔ دلچسپی کا دائرہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور ہم ایک فرد کے حوالے سے پورے ماحول کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔

ریاض فرشوری

کرنل غلام سرور کا شمار برِصغیر میں اردو ادب کے ان علم برداروں میں

ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنے لہو سے اردو زبان کے چراغوں کو نہ صرف روشن رکھا، بلکہ ان کی لو اتنی تیز کر دی کہ پڑھنے والوں کو ان کی تحریریں اپنی ہی زندگی کا ایک تجربہ محسوس ہوتی ہیں۔ کرنل غلام سرور کی کتاب ”آئینہ ایام“ آپ کی، میری، سب کی آپ بیتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی آدمی چالیس، پچاس برس کا تھکا دینے والا سفر طے کرتے ہوئے جب پیچھے مڑ کر دیکھے تو رنگ برنگی تتلیوں کی طرح ماضی کی آوازیں چاروں طرف سے آ کر گھیر لیں اور کچھ دیر ماضی کے ان خوشگوار لمحوں کے ساتھ گزار کر آدمی مسکراتا ہوا ایک نئے عزم کے ساتھ پھر ان دیکھی منزلوں کی طرف چل پڑے۔

باب — ۱

بچپن

اللہ بخشے، خالہ جان ایک خواب کا ذکر مزے لے لے کر کیا کرتیں۔ یہ خواب "این جانب" سے متعلق ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔ خالہ جان خواب میں کیا دیکھتی ہیں۔ ایک باریش بزرگ سرتاپا سبز لباس میں ملبوس، ہاتھوں میں کشکول لیے، ہمارے گھر وارد ہوتے ہیں۔ اور باآوازِ بلند ابا جان سے "راہِ خدا" حسبِ توفیق "نذر" طلب کرتے ہیں۔ اُدھر والد صاحب، کسی گہری سوچ میں غلطاں ہیں۔ انہیں درویش کی آمد کا علم ہی نہیں ہو پاتا۔ مگر جب درویش کی آواز میں شدّت اور خفگی ابھرنے لگتی ہے۔ تو وہ چونک پڑتے ہیں۔ اور حسبِ توفیق درویش کو نذرانہ پیش کرنے کے بعد پھر گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ "سائیں بابا" والد صاحب سے پریشانی کا

سبب پوچھتے ہیں۔ اوّل لیت و لعل سے کام لیتے ہیں مگر قبلہ کا اصرار غالب آجاتا ہے۔ ناچار، والد صاحب اپنی داستانِ غم یوں بیان کرتے ہیں۔

”اے اللہ کے نیک بندے! تو نے میرے دل کے زخمی تاروں کو چھیڑ ہی دیا ہے۔ تو سُن، مجھے اللہ نے دو بیٹے عطا کیے تھے۔ ایک تین سال کی عمر کو پہنچ کر مجھے داغِ مفارقت دے گیا۔ دوسرا بچہ بن کھلے مرجھا گیا۔ پیدائش کی چند ساعتوں کے بعد ہی اس نے آنکھیں موند لیں۔ اب میرے لئے دنیا اندھیر ہے۔ بیٹوں کی جدائی مجھے نڈھال کئے ہوئے ہے۔“

مردِ درویش بڑے غور اور توجہ سے یہ باتیں سنتے ہیں۔ پھر معًا ان کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ یوں گویا ہوتے ہیں۔

”میرے بھائی، فکر مت کر۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاکؐ کے صدقے اور نیک بندوں کی دعاؤں کے طفیل تجھے ایک بیٹا عطا کرے گا جو بڑے نصیبوں والا ہوگا۔ وہ بڑا نیک اور سعادت مند ثابت ہوگا۔ اور تیرے خاندان کو چار چاند لگائے گا۔ جا اٹھ۔ نماز پڑھ۔ اللہ کی راہ میں خیرات دے۔ تیرے نصیب جاگ اٹھے ہیں۔“

والد صاحب نے یہ باتیں سنیں۔ تو ان کے دل کی مرجھائی ہوئی

کلی کھل اٹھی۔ طبیعت شاداب ہو گئی۔ جی میں آیا۔ سائیں بابا کی کچھ خدمت کی جائے۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہ بزرگ غائب تھے۔ تلاشِ بسیار کے بعد بھی ان کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان خدا رسیدہ بزرگوں کا کیا پوچھنا۔ ان کے پاؤں میں چکر ہوتا ہے۔ زنجیر کا وہاں کیا واسطہ؟

پھر اللہ نے اپنا خصوصی فضل و کرم فرمایا۔ اور بزرگ کی بشارت کے مطابق ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء کی رات میرے والدین کے ہاں ایک "چاند سا مکھڑا" تشریف فرما ہوا۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ میں اپنی "شانِ نزول" کی بات کر رہا ہوں۔ خیال رہے۔ میں نے "چاند کا مکھڑا" واوین میں لکھا ہے۔ کہیں آپ سچ مچ ہمیں چاند کا ہم سر ہی نہ سمجھ لیں۔

خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ بات اپنے "ورودِ مسعود" کی ہو رہی تھی۔ میرے ابا جان اور امی جی کا کہنا تھا۔ میں پیدا ہوا تو بے پناہ خوشی کا اظہار کیا گیا۔ گاؤں کے رسم و رواج کے مطابق سارے گاؤں میں بتاشے، شکر تقسیم کی گئی۔ اور مبارک، سلامت کے پیغام چار سو سے موصول ہونا شروع ہو گئے۔

امّی جی بڑی اللہ والی خاتون تھیں۔ خیر اور نیکی کا عنصر ان کے ہاں اتنا غالب تھا کہ سارے گاؤں میں ان کا نام عزت و تکریم سے لیا جاتا تھا۔ اور ان کی شرافت کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔ میں

بڑا خوش نصیب ہوں کہ میری پرورش اتنی عظیم خاتون کی گود میں ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ماں کے صالح دودھ کا کرشمہ ہے، کہ اللہ کے فضل سے میں آج ایک باعزت مقام پر فائز ہوں۔

امی جان بتایا کرتی تھیں کہ میری طبیعت میں بھولپن شروع سے ہی بہت نمایاں تھا۔ میں جب کبھی رونے کی مشق "فرماتے" لگتا، فوراً کھلونے دے کر مجھے بہلا دیا جاتا۔ اور میری خفگی، خوشی میں تبدیل ہو جایا کرتی۔ ضد کا میرے ہاں گزر ہی نہیں ہوا تھا۔ یہ صفت خدا کے فضل سے میری شخصیت کا جزو بن چکی ہے۔ اب جب کہ میں نے "فہم و فراست" کی کئی منزلیں سر کر لی ہیں، ضد اور ہٹ دھرمی سے میں کوسوں دور بھاگتا ہوں۔ اپنی رائے سوچ سمجھ کر مرتب کرتا ہوں۔ پھر نتائج کی پروا کئے بغیر اس پر ثابت قدم رہتا ہوں۔ مگر جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے تو اپنی رائے سے رجوع کرنے میں مجھے کبھی تامل محسوس نہیں ہوتا۔ میں کھلے دل سے حقائق قبول کرنے کا عادی ہوں۔ اسے انا اور بقا کا کبھی مسئلہ نہیں بنایا۔

بات بچپن کی ہو رہی تھی اور تان "عارفانہ" کلام پر جا ٹوٹی۔ مرغِ تخیل کے بھی انداز خوب ہیں۔ پرواز پر آتا ہے تو سمت کا پابند نہیں ہوتا۔ ہاں تو امی بتاتی تھیں، میں بچپن میں اکثر بیمار رہا کرتا۔ کبھی بخار، کبھی نزلہ زکام، کبھی پیٹ کا عارضہ۔

اس زمانے میں دیہاتوں میں ہسپتالوں، ڈسپنسریوں کا نام تک نہ تھا۔ سارا کام تعویذ، گنڈے پر ہی چلتا۔ معاملہ بہت بگڑتا دکھائی دیتا تو ایک سکھ حکیم لابھ سنگھ نامی کی خدمات حاصل کر لی جاتیں۔ جو ہر مرض کو ایک ہی آنکھ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ یعنی آپ کسی قسم کی تکلیف بتائیں، سردار جی ایک ہی قسم کی مخصوص پڑیا آپ کو تھما دیں گے۔ اور تمام دوا کی قیمت صرف دو پیسے وصول کریں گے۔ یہ سکہ بند ریٹ تھا، جس میں کوئی رعایت ممکن نہ تھی۔ باری کے بخار کے لئے ہمارے محلے کے مستری فضل الٰہی خاصی شہرت رکھتے تھے۔ سائل اپنی تکلیف لے کر ان کے ہاں حاضری دیتے اور وہ سوت کے دھاگے پر گرہیں ڈال کر مریض کے گلے میں لٹکانے کی تلقین کرتے۔ دور دراز سے حاجت مند ان کے ہاں حاضری دیتے اور "گت" وصول کر کے انہیں دعائیں دیتے رخصت ہوتے۔ کچھ لوگ، اصغر شاہ کی بیری کے ڈھائی پتے بھی مریض کو کھلاتے۔ ان پتوں کی "معجزانہ صلاحیتوں" کا بھی بہت چرچا تھا۔ پتے اندر بخار باہر۔ بس اسی طور زندگی کا کاروبار چل رہا تھا۔ امی بتاتی تھیں میں جب بھی بیمار پڑتا۔ ان بزرگوں کی دعاؤں اور "دواؤں" سے ہی شفایاب ہوتا۔ ہمارے گاؤں سے ڈھائی تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے...... میانی سیداں۔ وہاں کے شاہ جی بچوں کے امراض کے خصوصی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ پتھر کا "منکا" پانی

میں رگڑ کر اس پر "دم" کیا کرتے۔ بچے کے لئے یہ پانی گرائپ واٹر کا بدل تھا۔ بچے کو ذرا سی پیٹ کی تکلیف ہوئی، جھٹ اس کی چند بوندیں اس کے حلق سے نیچے اتار دی جاتیں۔ پھر بیماری سرپٹ بھاگتی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کا نام نہ لیتی۔

میں بہت چھوٹا تھا، جب ایک بار امی مجھے میانی سیّداں شاہ جی کے ہاں اٹھا کر لے گئیں۔ سفر طویل تھا اور جون کا مہینہ۔ اوپر سے سورج آگ برسا رہا تھا۔ ہم لوگ چھ سات میل کی مسافت چلچلاتی دھوپ میں طے کر کے لوٹے، تو میں بُری طرح جھلس چکا تھا۔ اور امی جی کی طبیعت بھی بہت خراب ہو گئی تھی۔ پھر دونوں ماں بیٹا، ایک ساتھ بیمار پڑ گئے۔ خالہ جان نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا۔ اُدھر والد صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ مجھے اس تکلیف کے عالم میں دیکھ کر وہ بے حال ہوتے جا رہے تھے۔ اب انہیں ڈر تھا کہ خدانخواستہ ان کا تیسرا "ماہ رخ" کہیں اچانک ہاتھوں سے پھسل نہ جائے۔ اللہ نے کرم کیا۔ ماسی جی کی شب و روز کی محنت اور ابا جی کی دعائیں رنگ لائیں اور اسطرح ہم موت کے منہ سے بچ کر پھر گلوں میں رنگ بھرنے لگے۔

امی جی بہت سادہ مزاج خاتون تھیں۔ بیماری کے بعد میں سخت نڈھال ہو گیا تھا۔ اور مجھے ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی تھی۔ بس یونہی، دن رات پہلو بدلتا تھا۔ رونے، دھونے کا دھندا

بھی جاری رہتا۔ کسی "بڑی بی" نے امی کو مشورہ دیا۔ "گُلّو" (بچپن میں مجھے اسی نام سے پکارا جاتا) کے ہونٹوں سے ہلکی سی افیون لگا دیا کرو۔ پھر یہ سکون سے سو جایا کرے گا۔ امی جی نے ایسا ہی کیا۔ اور اس کے "خاطر خواہ" نتائج بر آمد ہوتے بھی دیکھے۔ بس پھر کیا تھا۔ یہ "چنیا بیگم" ہماری غذا کا جزو بن گئی۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں، اس کا ذائقہ کیسا تھا۔ یقیناً کڑوا ہوگا۔ مگر اس سے مجھے سکون بہت ملتا تھا۔ یہ عمل کئی ماہ جاری رہا۔ اب امی جی کو خیال آیا کہ کہیں یہ نشہ نقصان ہی نہ دے۔ انہوں نے ہاتھ روک لیا۔ افیون کا داخلہ بند۔ مگر ٹھہریئے۔ بات یہاں نہیں رکتی۔ افیون چھُٹنے کا عمل میرے لئے بڑا جان لیوا ثابت ہوا۔ میں دن رات بستر پر تڑپتا رہتا۔ ابّو امی مجھے بہلانے کا ہر حربہ استعمال کرتے۔ مگر بے سود۔ محلہ، گاؤں، علاقہ کے تمام پیر فقیر بھی آزما ڈالے گئے۔ منّت، نیاز کا بھی اہتمام کیا گیا۔ مگر مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔

ہمارے گاؤں میں ایک بڑی بی تھیں۔ چھتی بیگم۔ خاصی جہاندیدہ خاتون تھیں۔ بچوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھیں۔ بچے کو دیکھتے ہی مرض پہچان جاتیں۔ وہ کہا کرتیں، میں نے ڈاکٹری وغیرہ تو پڑھی نہیں مگر ہے کوئی ماں کا لال، جو مرض کی تشخیص میں میرا مقابلہ کر سکے۔ یہ بات کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھی۔ مجھے دیکھتے ہی امی سے مخاطب ہو کر بولیں اجو۔ بتاؤ تم بچے کو کیا کھلاتی رہی ہو۔"

ماں جی نے بتایا۔ "دودھ، شہد اور افیون کی ہلکی سی مقدار"۔ افیون کا نام سنتے ہی ان کا ماتھا ٹھنکا۔ بولیں۔ اب بھی افیون کھلا رہی ہو؟ نفی میں جواب سن کر وہ بہت برہم ہوئیں۔ پھر انہوں نے افیون کی ڈبیا کھول کر "چینیا بیگم" کو ہمارے ہونٹوں سے لگایا۔ پھر کیا ہم نہال ہو گئے۔ وصلِ یار کی لذت صرف وہی محسوس کر سکتے ہیں جو ہجر و فراق کی صعوبتیں برداشت کر چکے ہوں۔ تن آسانوں کا اس کوچے سے کہاں گذر!

بڑی بی نے ماں جی کو ڈانٹ پلائی اور کہا: "اللہ کی بندی! یہ تو کیا غضب ڈھانے لگی تھی۔ افیون نشہ آور چیز ہے اور چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اسے چھڑانا مقصود تھا تو دھیرے دھیرے اس کی مقدار کم کرنا تھی۔ یہ تو نے کیا کیا۔ چھوٹتے ہی اس پر پابندی لگا دی۔ اب تو ایسا کر، ہر روز اس کی مقدار کم کرتی جا اور پھر ایک دن ایسا بھی آئے گا، جب تیرا بیٹا اس عذاب سے مکمل نجات پائے گا"۔ امی جی نے ایسا ہی کیا۔ چنیا بیگم کی رخصتی میں کوئی دو ماہ صرف ہوئے ہوں گے۔ یہ بلائے بے درماں دھیرے دھیرے جس انداز میں میرے جسم کے اندر داخل ہوئی تھی۔ اسی طرح دبے پاؤں رخصت بھی ہو گئی۔

مگر سچ پوچھیے تو لگتا ہے، افیونی اثرات سے میں کلی طور پر کبھی چھٹکارا نہیں پا سکا ہوں۔ میرے مزاج میں افیونیوں جیسی تن

آسانی آج بھی کارفرما ہے۔ اور میں اپنے آپ کو LOTUS EATERS کی برادری کا ہی ایک فرد سمجھتا ہوں۔ اکثر خوابوں کی دنیا بسائے رکھتا ہوں۔ اس عالم میں، کئی بار مجھ سے ایسی بے تکی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آپ کہیں تو سناؤں ایک آدھ واقعہ اپنی بدحواسی کا۔ "عرض کیا ہے"۔

پروفیسر نعیم قریشی سے میری پرانی یاد اللہ ہے۔ میں ان کے ہاں اکثر حاضری دینے جایا کرتا تھا۔ ایک شام ان کے گھر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ ملازم باہر نکلا۔ پوچھنے لگا۔ کس صاحب سے ملنا ہے؟ افسوس، ہزار کوشش کے باوجود نعیم صاحب کا نام شعور کی سطح پر ابھر نہ سکا۔ ملازم میری مجبوری بھانپ گیا۔ کہنے لگا۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ قریشی صاحب سے ملنے آئے ہیں۔ آپ کا اپنا نام کیا ہے؟ میں اپنے صاحب کو آپ کے آنے کی اطلاع کرا دوں گا۔

اب میری حالت دیدنی تھی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں نے ہزار جتن کیئے کہ اپنا نام یاد آجائے۔ مگر یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ میں دبے پاؤں وہاں سے چلتا بنا۔ پیچھے ملازم کے قہقہوں کی آواز بلند ہوتی۔ اس موقع پر ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا۔ آئے دن میرے معمولات میں بدحواسی کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ میں ٹیلیفون ڈائیل کرتا ہوں۔ میرا مخاطب مجھ سے پوچھتا ہے۔ کس سے بات کرنی ہے؟ اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ مطلوبہ شخص کا نام ذہن میں آئے تو کچھ بولیں۔ اس

پری وش کا نام ایسے غائب ہو جاتا ہے، جیسے وہ دیارِ حرماں سے کوسوں دور نکل گئی ہو۔

یادش بخیر! والد صاحب اللہ والے بزرگ تھے۔ وہ دین کے انقلابی تصوّر سے پوری طرح آگاہ تھے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے جملہ تقاضے خوب سمجھتے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ اسکول ماسٹر تھے اور گاؤں کے اسکول میں ہی تعینات تھے۔ دن بھر علم کا فیضان عام کرنے میں گزارتے اور رات کا بیشتر حصہ یادِ الٰہی میں بسر ہوتا۔ پنجگانہ نماز کی باقاعدہ ادائیگی تو خیر ایک فریضہ تھا ہی، اسے ہر طور پورا ہونا تھا۔ اس کے علاوہ نماز تہجّد، اشراق، چاشت بھی باقاعدگی سے ادا کرتے۔ نماز تسبیح سے انہیں خاص رغبت تھی۔ عبادت میں وہ ایک لطف محسوس کرتے۔ فرماتے: بندہ، جب اپنے خالق کے حضور سرنگوں ہوتا ہے تو سرور کی ایک عجیب کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ اور اس لذت سے صرف وہی خوش نصیب بہرہ ور ہو سکتے ہیں جو جذب و انہماک کے ساتھ اپنے رب سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں۔ مادی لذتوں میں کھویا ہوا انسان ان روحانی کیفیات کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔

ہمارا گھر مسجد کے زیرِ سایہ واقع ہے۔ میں نے شعور کی آنکھ کھولی، تو والد صاحب نے انگلی پکڑ کر مجھے بھی اپنے ساتھ مسجد لے جانا شروع کر دیا۔ میں، بڑوں کی دیکھا دیکھی وضو کرنے کی مشق

کرنے لگا۔ اُن دنوں مٹی کے لوٹے (عرف عام میں انہیں "کُوزے" کہا جاتا تھا) وضو کے لیئے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ میں نے ایک دن ایک کُوزا پانی سے بھرا اور لگا اسے اٹھانے۔ وہ میرے "وارے" سے باہر نکلا۔ بہت بھاری تھا۔ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کی کرچیاں آس پاس بکھر گئیں۔ سب نمازیوں کی نظریں مجھ پر گڑ گئیں اور وہ ہنسنے لگے۔ اُدھر اپنی حالت بڑی عجیب تھی۔ میں مارے شرم کے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ یہ عمل شائد کچھ دیر مزید جاری رہتا۔ مگر ہمارے پڑوسی حکیم جناب دین (اللہ بخشے) آڑے آگئے۔ کہنے لگے: بیٹا۔ کیا ہوا، جو کوزا ٹوٹ گیا۔ اس کے بدلے تمہیں نیا کوزا ابھی بھیجتے کمہار سے لا دوں گا۔ پھر انہوں نے ایسی پیاری تقریر کی کہ میرے دل کی دھڑکن آن کی آن میں نارمل ہو گئی۔ غالبؔ کے شعر کا تو انہیں علم نہ ہوگا۔ مگر ان کی گفتگو کا ماحصل کچھ اسی شعر کی تفسیر تھا۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

جامِ جم سے یہ میرا جامِ سفال اچھا ہے

اور واقعی، انہوں نے جو کہا، وہ کر دکھایا۔ اب انہوں نے میرے لیئے ایک ننھا سا کوزہ لا کر رکھ دیا۔ ہمارے ہاں اسے "آدلی (یعنی کوزے کی "زوجہ محترمہ") کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اب اس آدلی میں پانی بھرنا اور دائیں بائیں چھینٹے اڑا کر نمازیوں کی صف میں

شامل ہو جاتا اور ان کی نقالی کرتا۔ سب نمازی میری معصوم اداؤں کو دیکھ کر بڑے خوش ہوتے۔ چاچا مہتاب دین تو مجھے اللہ میاں کی معصوم گڑیا کہہ کر پکارتے۔ والد صاحب کی شفقت نے کمال کر دکھایا۔ اور میں نے چار، پانچ سال کی عمر میں ہی مسجد کو حرزِ جان بنا لیا۔ میری عمر مشکل سے پانچ برس کی ہو گی۔ جب میں نے پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرنا شروع کر دی۔ اذان سنتے ہی میں مسجد کی جانب لپکتا اور پھر اسی وقت گھر لوٹتا، جب سب نمازی رخصت ہو چکے ہوتے۔ درمیانی وقفے میں، تسبیح، درود کا ورد جاری رکھتا۔ اس سے مجھے بڑا سکون ملتا۔ میں کبھی نماز ضائع کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ میرے معمولات میں حد درجہ باقاعدگی، حد درجہ شیفتگی شامل تھی۔

انسان خطا کا پتلا ہے۔ وہ ہزار کوشش کرے، کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے۔ ایک دن یوں ہوا۔ ہمارے گاؤں سے تین، چار میل دور ایک چھوٹی سی بستی جرموٹ کلاں میں ایک میلہ منعقد ہوا۔ محلے کے لڑکے مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ دن بھر ہم میلہ کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ شام کے وقت کبڈی کا میچ دیکھ کر ہم واپس گھروں کو لوٹے۔ شام کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ پھر سورج ڈوب گیا۔ اور چار سو اندھیرا چھانے لگا۔ جوں جوں مغرب کی نماز کا وقت ہاتھ سے سرکتا جا رہا

تھا، میری بے قراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے آس پاس پانی تلاش کرنے کی سر توڑ کوشش کی، مگر بے سود۔ تیمم کے وجود اور اس کے طریقِ کار سے میں بے خبر تھا۔ ناچار، مغرب کی نماز، میں ادا نہ کر سکا۔ اور مجھے اس بات کا اتنا افسوس ہوا، جیسے کوئی بیش بہا خزانہ مجھ سے چھن گیا ہو۔ میں گھر پہنچا۔ تو امی جان نے آگے بڑھ کر مجھے چوما۔ میں زار و قطار رو رہا تھا۔ آنسوؤں کی جھڑی یوں رواں دیکھ کر انہیں پریشانی لاحق ہوئی۔ پوچھنے لگیں۔ بیٹا۔ کیا ہوا؟ تمہیں کسی نے پیٹا تو نہیں؟ میں نے جواب دینے کی ہزار کوشش کی، مگر میری آواز میرے گلے میں ہی اٹک گئی۔ بے جی مجھے مسلسل چومتی رہیں۔ جب میری طبیعت ذرا سنبھلی، تو میں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اور نماز ضائع ہونے کے صدمے کا اظہار کیا۔ نماز سے میری محبت کی یہ والہانہ کیفیت دیکھ کر ابّا، امّی دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ انہوں نے مجھے دلاسہ دیا۔ اور نماز قضا پڑھنے کی ترکیب سکھائی، جس پر میں نے اسی وقت عمل کیا۔ تب، کہیں دلِ مضطر کو قرار نصیب ہوا۔

شعائرِ اسلامی سے گہری عقیدت، میرے بچپن کے دور کی متاعِ عزیز تھی۔ میں اُن دنوں عقل و فہم کی دولت سے تہی دامن تھا، مگر ایمان و یقین کی نعمتوں سے پوری طرح بہرہ ور تھا۔ آج، اپنے موجودہ طرزِ عمل کو اپنے ابتدائی دور کے جذب و شوق کے حوالے سے دیکھتا

ہوں تو میرا ضمیر مجھے دیوانہ وار ڈسنے لگتا ہے۔ میں نے خرد کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں۔ مغرب کے میخانے سے بھی میں نے پیاس بجھائی ہے۔ فلسفہ، مابعد الطبیعات، تصوف، ادبیاتِ عالم، علوم اسلامیہ غرض حکمت کے موتیوں کو میں نے ابھی اپنی آنکھوں سے چنا ہے۔

میں نے ناقدانہ نگاہوں سے ادیانِ عالم اور دیگر نظام ہائے تمدن کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اور اس تنوع مطالعے کے تناظر میں، میں اسلام کی حقانیت پر بھرپور ایمان لایا ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی پختہ یقین ہے کہ اسلام ہی سچا دین ہے۔ باقی سب فسوں و فسانے ہے۔

خدا کے وجود سے عاری فلسفے محض دھوکہ اور فریب ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں:

نشستم با نکویانِ فرنگی
از آں بے سوز تر روزے ندیدم

مگر ذرا رکیئے۔ میرے کرب کی داستان یہاں ختم نہیں ہوتی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اندر سے میری ٹوٹ پھوٹ کا عمل ہنوز جاری ہے میں اسلام کو بلا تامل دینِ حق سمجھتا ہوں، مگر شعائر اسلامی کی بجا آوری میں مجرمانہ غفلت کا مرتکب ہو رہا ہوں میری حالت بقول غالب کچھ یوں ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

مسیحاؤں سے استدعا ہے، وہ میرے دکھ کی دوا تجویز فرمائیں۔

ساغر کو ذرا ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔

آئیے، بات وہیں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے اس کا سلسلہ ٹوٹا تھا۔ میں بتا رہا تھا کہ والد صاحب میری ذہنی اور روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے۔ نماز سیکھنے سکھانے کی تفصیل تو آپ سن ہی چکے۔ اب آئیے۔ مدرسے کے بارے میں ان کے نظریات کی ایک جھلک آپ کو دکھاؤں۔

باب — ۲

ابتدائی تعلیم کی تیاریاں

والد صاحب جونیئر ورنیکلر ٹیچر تھے۔ انہوں نے صرف مڈل درجے تک تعلیم پائی تھی۔ مگر آپ عربی، فارسی اور اردو کے مانے ہوئے عالم تھے۔ علاقے بھر میں ان کی علمیت کا چرچا تھا۔ استاد اس پائے کے تھے کہ ان کے شاگرد ان کے قدم چومنے میں اپنی سعادت سمجھتے۔ شاگرد کے اندر سوئی ہوئی صلاحیتوں کو جگانے میں انہیں خصوصی درک حاصل تھا۔ اندازِ تدریس میں بے پایاں شفقت تھی۔ انہیں اپنے شاگردوں سے سچا پیار تھا۔ وہ ہنسی کھیل میں حکمت کے موتی بکھیر دیتے۔ ان کا سبق کبھی بے کیف نہ ہونے پاتا۔ دیکھتے، لڑکے ذرا بور ہونے لگے ہیں، جھٹ شائستہ مزاح کی کوئی پھلجھڑی چھوڑ دیتے اور محفل کشتِ زعفران میں تبدیل ہو جاتی۔

اباجی ذرا غیر مقلد (NON- CONFORMIST) واقع ہوئے تھے۔ ان کے تعلیمی نظریات، مروّجہ نظریات سے براہِ راست متصادم تھے۔ وہ بچے کو اوائل عمر میں اسکول بھجوانے کے مخالف تھے۔ فرمایا کرتے۔ بچے کو صرف اسی وقت اسکول بھجوانا چاہیئے۔ جب اس کی شعوری صلاحیتیں کچھ بیدار ہونے لگی ہوں۔ ان کا خیال تھا، کہ بچے کو اگر تین، چار سال کی عمر میں نرسری وغیرہ میں جھونک دیا جائے، تو وہ ہمیشہ ذہنی طور پر ناپختہ رہتا ہے۔ اور اس کی فکری صلاحیتیں ٹھیک طرح سے ابھر نہیں پاتیں۔ ان کا کہنا تھا۔ بچے کو چھ سال کی عمر میں اسکول بھجوانا چاہیئے۔ درمیانی عرصے میں اس کی تربیت گھر کے آزاد، جمہوری ماحول میں جاری رہنی چاہیئے۔

اباجی نے اپنے نظریات کی روشنی میں مجھے گھر پر ہی قاعدہ، پہاڑے سکھانا شروع کر دیئے۔ ان کا معمول تھا اسکول سے لوٹ کر آتے، تو مجھے اپنے پاس بٹھا لیتے۔ اور پھر بڑے پیار اور شفقت سے پڑھانے لگتے۔ وہ ایک ایک لفظ کو بیس، بیس بار منہ سے کہلواتے یہی حال پہاڑے یاد کرانے کا بھی تھا۔ "رگڑا لگاؤ" ان کا مخصوص تکیۂ کلام تھا۔ مطلب یہ تھا۔ اس جملے یا پہاڑے کو بار بار دہراؤ۔ لکھائی کے معاملے میں بھی وہ بہت زیادہ توجہ فرماتے۔ لکڑی کی تختی میرے لئے خود دھوتے۔ اس پر سفید مٹی کا لیپ کرتے۔ پھر پنسل سے اس پر لکیریں کھینچتے اور سرکنڈے کے تراشے ہوئے قلم سے لکھنے کی تلقین

فرماتے۔ یہ سلسلہ بھی بڑی باقاعدگی سے دن میں تین چار بار دہرایا جاتا۔ بچپن کی اس ٹھوس تربیت کا یہ فیضان تھا کہ جب میں اپریل ۱۹۲۵ء میں مڈل اسکول سرگ ڈھن میں پہلی جماعت میں داخل ہوا۔ تو پہلے ہی دن میری قابلیت کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور ماسٹر جی نے ہمیں کلاس کا مانیٹر مقرر کر دیا۔ لیجیے عام طالب علم کی حیثیت سے ہم اسکول گئے اور لوٹے چوہدری بن کر۔ مانیٹری بھی تو چودھراہٹ کا ایک روپ ہے۔

جی ہاں، پہلے دن ہمارے اسکول جانے کی روئیداد بھی سن لیجیے۔ بے جی نے بڑے پیار کے ساتھ مجھے نہلایا۔ سر میں سرسوں کا تیل ڈالا، آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ بالوں میں کنگھی کی اور ماتھے پر توے کی سیاہی کا ایک ہلکا سا نشان لگا دیا (تاکہ صاحبزادہ "نظر بد" سے محفوظ رہے) پھر بتاشوں کا ایک تھال بھر کر اسکول بھجوایا۔ اس کے ساتھ ایک، دو روپے بھی ماسٹر جی کی خدمت میں بھجوائے۔ میں گھر سے رخصت ہوا، تو بے جی نے میرے ماتھے کو چوما، پیٹھ کو تھپکی دی۔ سر پر دستِ شفقت پھیرا اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ مجھے سکول روانہ کیا۔

لیجیے، صاحبان۔ اب ہماری داستان گھر سے سرک کر اسکول کی چار دیواری میں جا داخل ہوتی ہے۔

باب --- ۳

مڈل اسکول میں داخلہ

میں پہلی جماعت میں داخل ہوا تو میرے استاد علی شان مقرر ہوئے۔ مرحوم کا تعلق بھی ہمارے گاؤں سے تھا۔ والد صاحب کے دیرینہ رفیقِ کار تھے۔ اللہ بخشے، بڑے بھلے انسان تھے۔ مرنجاں مرنج اور بے ضرر۔ دوسروں کے معاملات میں کبھی دخل نہ دیتے۔ بس اپنی من کی دنیا بسائے رکھتے۔ انہیں بھینس پالنے کا بہت شوق تھا۔ اسکول آنے سے پہلے وہ گھاس کا وافر ذخیرہ کاٹ کر گھر محفوظ کر آتے۔ اسکول سے لوٹتے ہی وہ پھر بھینسوں کی خاطر مدارات میں "جُت" جاتے۔ بہت محنتی اور جفاکش انسان تھے۔ سخت کوشی کی منہ بولتی تصویر۔ پڑھائی، لکھائی سے البتہ قدرے پرہیز برتتے۔ آدمی آخر بیک وقت ایک کام ہی کر سکتا ہے۔ ماسٹر جی کو بچوں اور بھینسوں میں سے ایک

کا انتخاب کرنا تھا۔ ان کی نگاہِ التفات بھینسوں پر پڑ گئی۔ اپنے اپنے نصیبوں کی بات ہے۔

ماسٹر جی نے پہلے دن میرا امتحان لیا۔ میں نے دوسری جماعت کی کتاب بھی پڑھ رکھی تھی۔ پھر مجھے ڈر کس بات کا تھا۔ میں نے فر فر سبق سنا دیا۔ ساری کلاس حیران و ششدر رہ گئی۔ ماسٹر جی نے بھرپور شاباش دی۔ مجھے پڑھائی میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ماسٹر جی جو پوچھتے میں فوراً جواب دے دیتا۔ حساب کے سوال میں آنکھ جھپکتے ہی حل کر ڈالتا۔ اور تختی پر املا بھی بڑی خوبصورتی سے لکھتا۔ خدا کی رحمتیں ہوں ابّا جان پر جنہوں نے مجھے خود اعتمادی کی دولت سے نواز رکھا تھا۔

ایک دن میری شامت جو آئی تو میں نے ماسٹر جی کے سوال کا جواب، ان کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی دے دیا۔ وہ دراصل یہ سوال کسی اور لڑکے سے کرنا چاہتے تھے۔ میری یہ حرکت دیکھ کر وہ غصّے سے لال پیلے ہوگئے۔ انہوں نے اسے میری گستاخی پر محمول کیا۔ اور زناٹے کا ایک طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ وار اتنا بھرپور تھا کہ پانچوں انگلیوں کے نشان میرے گال پر ثبت ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد جب میں گھر لوٹا، تو بے جی میرا یہ حال دیکھ کر بے حال ہوگئیں۔ انہوں نے ماسٹر صاحب کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔ اتنی دیر میں ابا جی آن پہنچے۔ انہوں نے بے جی کو تسلی دی۔ وہ خاموش ہوگئیں۔ مگر

انہیں اس بات کا برسوں قلق رہا کہ ان کے لاڈلے کو ناکردہ گناہ کی پاداش میں یہ سزا دی گئی تھی۔

میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر راجہ تُراب خان نے مجھے اسٹیج پر آکر مجمع سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔ تیاری کے لئے مجھے ہفتہ، دس دن مل گئے۔

موضوع تھا "سچ کی برکتیں"۔ والد صاحب نے بہت عمدہ تقریر لکھ کر دی جسے میں نے ایک آدھ دن میں ازبر کر لیا۔ پھر اس کی ریہرسل شروع کر دی۔ میں گھر کے تمام افراد کو اکٹھا کر کے ان کے سامنے بولنے کی مشق کرتا۔ والد صاحب تقریر کے آداب سے مجھے آگاہ کرتے، الفاظ کے زیر و بم اور زورِ بیان کے انداز سے روشناس کراتے۔ اس طرح پوری تیاری کے بعد جب میں نے تمام اسکول کے سامنے تقریر کی، تو یقین جانیئے۔ سامعین جھوم اٹھے۔ ہر طرف سے تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسنے لگے۔ لڑکوں نے اتنے جوش و خروش سے تالیاں بجائیں کہ تمام گاؤں ان کی آواز سے گونج اٹھا۔ راجہ تُراب خان نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ اور اپنے پدرانہ پیار سے مجھے نوازا۔ انہوں نے برملا اسمبلی میں اعلان کیا۔ "مولوی" کا لیکچر بہت عمدہ ہے اسے آج ہم ایک روپیہ بطور انعام دیتے ہیں۔ میرے لئے یہ اعزاز بہت گراں قدر تھا۔

پھر گاہے گاہے مجھے اسٹیج پر نمودار ہونے کا موقع ملتا رہا۔ ہر بار میری "پرفارمینس" پہلے کے مقابلے میں بہتر ہوتی چلی گئی۔ اس طرح

فنِ خطابت کے آداب مجھے اپنی ابتدائی درسگاہ ہی سے نصیب ہوئے۔ خدا کا شکر ہے۔ انہوں نے ہر مقام پر میری دستگیری کی۔ ۱۹۲۹ء کی بات ہے۔ پتہ چلا کہ جہلم کے ڈپٹی کمشنر مسٹر گاربٹ ہمارے اسکول کا معائنہ کرنے آ رہے ہیں۔ اس خبر نے تمام علاقہ میں تہلکہ مچا دیا۔ بھرپور تیاریاں شروع ہو گئیں۔ گاؤں کے چوہدری، نمبردار، ذیلدار، سرپنچ سب بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی بےقراریاں قابلِ دید تھیں۔ بے چارے سخت گھبراہٹ کے عالم میں تھے۔ آپ سوچیں جس اسکول میں "چھوٹے بابو" کے آنے پر بھگدڑ مچ جاتی ہو، وہاں ضلع کے سب سے بڑے افسر اور وہ بھی سفید چمڑی والے کے "نزول" پر میزبانوں کا کیا حال ہوا ہوگا۔ سفید آقا کا اُن دنوں بڑا دبدبہ تھا۔

استقبال کے لیئے رنگارنگ پروگرام ترتیب دیا گیا۔ پروگرام میں جملہ سرگرمیوں کے علاوہ میری تقریر بھی شامل تھی۔ والد صاحب نے تقریر لکھنے اور پھر اسے تیار کرانے میں رات دن ایک کر دیا۔ تقریر کا عنوان تھا: "میں کون ہوں"۔ جواب میں تقریباً سو توصیفی ناموں کا تذکرہ تھا۔ مثلاً: میں حکیم ہوں، طبیب ہوں، مفتی ہوں، ملّا ہوں، واعظ ہوں، عالم ہوں، فاضل ہوں، شاعر ہوں، فلسفی ہوں۔ ادیب ہوں، مفکّر ہوں، محقّق ہوں، مدقّق ہوں . . . . . وغیرہ وغیرہ۔ والد صاحب نے ایسے تمام الفاظ جمع کر دیئے تھے، جو زندگی کے تمام گوشوں پر

محیط ہوں۔ غور فرمایئے: ۹-۱۰ سال کا بچہ اگر فلسفی، دانشور اور محقق ہونے کا دعویٰ کرنے لگے، تو اس سے بڑھ کر اور کون سی لاف زنی ہوگی؟

گاربٹ صاحب اور دیگر زعمائنے میری "تقریر دلپذیر" کو بھرپور توجہ سے سنا اور جب میں نے "بڑکیں" مارنے کا سلسلہ بند کیا تو وہ مُسکراتے ہوئے فرمانے لگے: بچہ لوگ! تُم سبھی کچھ ہو۔ "نیاز مندوں" نے انہیں پھولوں سے لادا ہوا تھا۔ انہوں نے دو تین ہار اپنے گلے سے اتار کر میرے گلے میں ڈال دیئے۔ میں یہ تحفہ دکھانے بھاگا، بھاگا بے جی کے پاس پہنچا۔ اور انہیں ساری کہانی کہہ سنائی۔ وہ اپنے "شعلہ بیان" مقرّر بیٹے کی کامیابی پر بہت خوش ہوئیں۔

اُن دنوں چوتھی جماعت کے ہونہار لڑکے وظیفے کے امتحان میں شریک ہوا کرتے تھے اُس دفعہ ہم چار لڑکوں کو جہلم قسمت آزمائی کے لئے بھجوایا گیا۔ والد صاحب نے میری تیاری اتنے بھرپور انداز سے کرائی تھی کہ میری کامیابی خدا کے فضل سے یقینی تھی۔ پہلے عرض کر چکا ہوں والد صاحب خدا کے کرم سے ایک بلند پایہ استاد تھے۔ ان کی نگاہِ عمیق اور طریقِ کار حقیقت پسندانہ تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ "پینڈو" بچے، بڑے شہروں میں جاکر حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی سُن رکھا تھا کہ جس ہال میں بٹھا کر بچوں سے امتحان لیا جاتا ہے اس کے درودیوار،

نقشوں، چارٹوں اور تصویروں سے مزین ہوتے ہیں اور ہال میں بولنے والے کی آواز بھی گونجتی ہے۔ والد صاحب نے پیش بندی کے طور پر "حفاظتی تدابیر" اختیار کر لی تھیں۔ کچھ تفصیلات آپ بھی سُنیئے!

والد صاحب مجھے گاؤں سے باہر ایک بزرگ کے مزار پر لے جاتے جو "مقبرہ" کے نام سے مشہور ہے وہاں مزار کے اندر مجھے بٹھا کر املا لکھاتے۔ گنبد کے اندر آواز گونجتی تھی اور بازگشت کی وجہ سے صحیح سنا نہ جا سکتا تھا۔ والد صاحب میرے کانوں کو اس ناخوشگوار صورتِ حال سے مانوس کرانا چاہتے تھے، مبادا ہال میں ممتحن صاحب کی آواز ہمارے پلے نہ پڑے۔ اور اس طرح ہمارا نام وظیفہ خواروں کی فہرست میں شامل نہ ہو سکے۔ دیکھی آپ نے باپ کے پیار اور شفقت کی جھلک!

میں ۱۵ر اپریل ۱۹۳۹ء کی صبح، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جہلم پہنچا۔ شہر میں وارد ہونے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ شہر کی گہما گہمی دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ہم لوگوں نے اپنے کرم فرما ملک شیر علی ایڈووکیٹ کے ہاں قیام کیا۔ بجلی کے قمقمے دیکھنے کا بھی یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ چراغ کی ٹمٹماتی لو میں پڑھنے والے طالب علم کو اگر بجلی کی نعمت میسّر آجائے، تو اسے اور کیا چاہیئے۔ خیر۔ ہم اگلی صبح کمرۂ امتحان کی جانب چل دیئے۔ امتحان شروع ہوا۔ تو مجھے محسوس ہوا جیسے پرچوں کا معیار میرے اندازے سے بہت کم ہو۔ میں نے ان کی ان میں تمام

پرچہ حل کر دیا۔ حساب کے سب سوال ٹھیک، املا سارا درست، پڑھائی لاجواب۔ بس پھر کیا تھا۔ نتیجہ نکلا۔ تو ضلع بھر کے طالب علموں میں میری دوسری پوزیشن تھی۔ پہلے نمبر پر آنے والے خوش نصیب کا نام ارشاد الحق کیانی تھا۔ ہماری وہیں پر علیک سلیک ہوئی جو بعد میں دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔ گارڈن کالج میں بھی ہم دونوں پھر اکٹھے ہو گئے۔ موصوف آج کل حکومت پنجاب کے ایک اعلیٰ افسر ہیں۔

تو جناب، بات ہو رہی تھی۔ ہمارے وظیفہ پانے کی۔ ہم چار لڑکوں میں سے دو اس اعزاز کے مستحق پائے گئے۔ ایک میں دوسرے کرامت حسین۔ یہ حضرت بعد میں فوج میں شامل ہو گئے۔ بدقسمتی سے ان کی ترقی کا گراف میجر کے عہدے پر آ کر رک گیا۔ آگے نہ جا سکے۔ اتفاقات ہیں زمانے کے۔

اُس زمانے میں ماہانہ وظیفے کی رقم چار روپے تھی۔ والد صاحب حساب کتاب کے معاملے میں حد درجہ محتاط تھے۔ میرے وظیفے کی رقم وہ علیحدہ رکھ دیتے۔ اس سے مجھے کچھ نہ ملتا۔ ویسے وہ اپنی جیب سے مجھے ہر روز آنہ، دو پیسے دے دیا کرتے۔ جس سے میں مونگ پھلی، گڑ وغیرہ خرید کر اپنی جھولی بھر لیتا۔ مونگ پھلی کے حوالے سے ہمارے ساتھ ایک بار ایک "حادثہ" ہو گیا وہ بھی سُن لیجئے۔

ہمارے خاندان میں ایک بزرگ تھے بابا غلام محمد۔ وہ میرے دادا مرحوم کے چچا زاد بھائی تھے۔ بہت چھوٹی عمر میں ممباسہ، زنجبار کی

جانب نکل گئے تھے۔ وہاں کئی سال قیام کے بعد واپس وطن لوٹے تھے۔ ماشاالله، مالی اعتبار سے بہت خوشحال تھے۔ مگر اولادِ نرینہ سے محروم تھے۔ میرے ساتھ بہت پیار کرتے تھے۔ اور امی جی سے ہمیشہ تقاضہ کرتے: اَجّو۔ گُلّو ہمیں دے دو۔ امی جی ان کی بات ہنس کر ٹال دیتیں۔ کون ہو گی ایسی ماں، جو اپنے گلّو، اپنے مٹھو، اپنے پپو کو اپنی گود سے جدا کر دے!

بابا جی نے ایک دن مجھے ایک آنہ دیتے ہوئے کہا: بیٹے، جاؤ شیخ عزیز کی دکان سے مونگ پھلی لے آؤ۔ شیخ جی نے مونگ پھلی سے میری جھولی بھر دی۔ میں نے سوچا، بابا جی اتنی مونگ پھلی کھا کر کیا کریں گے۔ کیوں نہ کچھ حصہ میں پہلے ہی گول کر جاؤں۔ میرے اندر کا شیطان مجھے بہکانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر میں نے "مالِ غنیمت" کی بیشتر مقدار اپنی جیبوں میں ٹھونس لی۔ بچے کھچے چند دانے بابا جی کی نذر کئے۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔ بیٹا۔ ایک آنہ میں صرف اتنی سی مونگ پھلی؟ اتنی مقدار تو دھیلے میں آ سکتی ہے۔ اسی اثنا میں ان کی نظر میری نیکر کی ابھری ہوئی جیبوں پر جا پڑی جو میری حرکت پر خندہ زن تھیں۔ انہیں ٹٹولتے ہوئے کہنے لگے۔ آج تو پکڑا گیا۔ بتا، ان جیبوں میں کیا چھپا رکھا ہے؟ اُدھر میری حالت بُری ہو رہی تھی۔ میں نے رونے کا عمل شروع کیا ہی تھا کہ انہوں نے دلاسہ دے کر مجھے چپ کرا دیا۔

معذرت چاہتا ہوں میں بہت دور نکل گیا۔ وظیفے کی بات ہو

رہی تھی۔ والد صاحب پورے چار سال یہ رقم پس انداز کرتے رہے۔ اور جب پورے ایک سو بانوے ۱۹۲ روپے جمع ہو گئے تو وہ ایک دن پنڈی چلے آئے۔ میں بھی ان کے ہمراہ تھا۔ اس رقم سے انہوں نے ایک سنگر مشین ایک سو تیس روپے میں خریدی۔ جسے ہم لے کر خوشی خوشی گھر لوٹے۔ اڈہ لاریاں سے ہمارے گاؤں کا فاصلہ کوئی ایک میل کے لگ بھگ ہے۔ جسے پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔ والد صاحب اپنے کندھوں پر مشین اٹھائے چلے آ رہے تھے کہ امی جان نے انہیں دُور سے آتے دیکھ لیا اور لپک کر گاؤں سے باہر "کالو والی کسّی" کے قریب ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ والد صاحب نے مشین ان کے حوالے کرنا چاہی۔ مگر توازن برقرار نہ رہ سکا۔ اور مشین کا ایک سرا امی جان کے ماتھے سے جا ٹکرایا۔ جس سے خون بہنے لگا۔ ہم لوگ بہت افسردہ ہوئے۔ آغاز اچھا نہیں ہوا۔ زخم خاصا گہرا تھا۔ اسے مندمل ہونے میں کئی ماہ لگے۔ مگر امی کبھی بھولے سے بھی حرفِ شکایت لبوں تک نہ لائیں۔ اس سنگر مشین نے بھی وفا کا ریکارڈ قائم کر دکھایا۔ امی جتنی دیر زندہ رہیں، وہ اسے استعمال میں لاتی رہیں۔ ان کی رحلت کے بعد ہم لوگ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ آج بھی یہ مشین "تندرست و توانا" ہے۔ میں اسے جب دیکھتا ہوں تو دورِ رفتہ کی بہت سی یادیں لوٹ آتی ہیں۔ ابا جی، امی جی کی معصوم تصویریں میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگتی ہیں۔ اور پھر ان میں بے اختیار آنسو امڈ آتے ہیں۔

میں نے آٹھویں جماعت تک اپنے گاؤں کے اسکول میں ہی تعلیم پائی۔ پڑھائی، لکھائی میں، میرا کوئی ہم پلّہ نہ تھا۔ سب مضامین میں میری پوزیشن قابلِ رشک تھی۔ ہر امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرنا میرے لئے معمول بن چکا تھا۔ مجھے پڑھنے لکھنے کی اتنی چاٹ پڑ گئی تھی کہ میرا کسی اور جانب دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ کھیلوں سے مجھے کبھی رغبت پیدا نہ ہو سکی اسکول میں پی ٹی پیریڈ میں اکثر "ڈاج" کرتا کبڈی کا جب کبھی مقابلہ ہوتا میں اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ مگر ماسٹر چوہدری سردار خان صاحب کی "چشمِ التفات" جب کبھی مجھ پر پڑ جاتی تو وہ اصرار کے ساتھ اکھاڑے میں اتارتے اور مجھے "جوہر" دکھانے پر مجبور کرتے۔ میری اکثر پٹائی بھی ہو جاتی۔ کبڈی کے کھلاڑی کو حد درجہ چاق و چوبند ہونا پڑتا ہے۔ ادھر ہم ٹھہرے عالمی شہرت یافتہ افیونی۔ ویسے حیرت کی بات یہ تھی کہ اگر کسی کھلاڑی کی کلائی میری گرفت میں آجاتی تو اسے میں ہاتھ سے ہرگز نہ جانے دیتا۔ میرا ایک کلاس فیلو تھا، سلیمان شاہ۔ بڑا قوی ہیکل، بڑا تنومند، بڑا پھرتیلا۔ کبڈی کھیلنے کے جملہ "رموز" سے وہ خوب آگاہ تھا۔ سکول بھر میں اس کی شہرت تھی۔ ایک دن چوہدری سردار خان صاحب نے مجھ سے کہا۔ آج تمہارا جوڑ سلیمان شاہ سے پڑے گا۔ دیکھنا اسے ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا۔ میں نے یہ سنا، تو چکرا کر رہ گیا۔ سوچا، آج تو غالب کے پرزے ضرور اڑیں گے۔

پھر جب ہمارا آمنا سامنا ہوا تو حسنِ اتفاق سے سلیمان شاہ کی کلائی میرے ہاتھ لگ گئی۔ اور پھر میں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ شاہ جی نے اسے چھڑانے کے لئے پورا زور لگا دیا۔ مگر بے سود۔ ناچار، انہیں شکست تسلیم کرنی پڑی۔ اس طرح اس انہونی سی بات نے اسکول بھر میں دھوم مچا دی۔ جو بھی خبر سنتا۔ حیرت کی تصویر بن کر دائیں، بائیں دیکھنے لگتا۔ اس خبر کی صحت پر کسی کو یقین نہ آتا۔

میری صحت کے بارے میں ابا، امی پریشان رہا کرتے۔ میرا معمول یہ تھا کہ میں اسکول سے لوٹ کر آتا اور کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا۔ پھر کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ جاتا۔ مطالعے کا یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ دیئے کی روشنی میں پڑھنے کا عمل بڑا تکلیف دہ تھا۔ مگر ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ امی جان کا معمول تھا، وہ رات سونے سے پہلے مجھے دودھ کا پیالہ پلانے آتیں اور جاتی بار نصیحت فرماتیں۔ بیٹا۔ کافی وقت گزر چکا ہے۔ اب سو جاؤ۔ میں انہیں تسلی دیتا۔ امی، ابھی سوتا ہوں۔ نگران کے چلے جانے کے بعد پھر اپنے مطالعے میں ڈوب جاتا۔ والد صاحب عشاء کی نماز کے بعد نماز تسبیح پڑھنے مسجد میں رک جاتے۔ اس عمل میں انہیں خاصی دیر ہو جاتی۔ جب رات گئے، وہ گھر لوٹتے تو مجھے مطالعے میں مصروف پا کر پریشان ہو جاتے اور مجھے زبردستی اٹھا کر بستر پر لٹا دیتے۔ گاہے، میں نیند کی آغوش میں چلا جاتا۔ گاہے، تھوڑی دیر بعد اٹھ

کر پھر پڑھائی میں "جُت" ، جاتا۔ کتابیں میرا اوڑھنا، میرا بچھونا تھیں۔ مجھے ان کے بغیر چین نہ آتا۔

اللہ کا احسان ہے، یہ عمل آج تک جاری ہے۔ فوج میں آنے کے بعد انسان عسکری سرگرمیوں میں کچھ یوں اُلجھ جاتا ہے کہ ذاتی مطالعے کے لئے وقت نہیں نکال سکتا مگر میرا معمول یہ ہے کہ ہر روز دو، تین گھنٹے مطالعے میں مصروف رہتا ہوں۔ اس میں کوئی ناغہ نہیں ہونے دیتا۔ یہ سلسلہ گذشتہ چالیس، بیالیس سال سے جاری ہے۔ شکر ہے۔ غیر محسوس انداز میں، کتب بینی نے میری کایا کلپ کر دی ہے۔ میرا لائف اسٹائل بالکل جدا اور منفرد ہے۔ اور اس انفرادیت کو میں اپنی متاعِ عزیز سمجھتا ہوں۔

بات کھیل، کود سے اپنی عدم دلچسپی کی ہو رہی تھی۔ چلئے، اس موضوع پر تھوڑی سی گفتگو اور ہو جائے۔ والد صاحب مجھے مجبور کرتے کہ میں شام کے وقت باہر کھلی گراؤنڈ میں جاؤں اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ گلی، ڈنڈا کھیلوں۔ دیہاتی بچوں میں یہ کھیل بے حد مقبول تھا۔ میں بے دلی کے ساتھ تھوڑی دیر اپنے "فن" کا مظاہرہ کرتا اور پھر گھر لوٹ آتا۔ گاہے گاہے گاؤں سے باہر ندی (عرف عام میں ہم اسے "کسّی" کہتے تھے) میں نہانے نکل جاتا۔ میں تھوڑا بہت تیر لیتا تھا۔ مگر اس فن کے اسرار و رموز کا محرم نہ تھا۔ ایک شام ہم چار پانچ لڑکے "کسّی" میں نہانے لگے۔ تازہ بارش کی وجہ سے "کسّی" بھری ہوئی تھی۔ اور

اس کا پانی کناروں سے باہر چھلک رہا تھا۔ میں نے کودنے سے پس و پیش کیا، تو پیچھے سے ایک شریر لڑکے نے مجھے دھکا دے دیا۔ اور میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ میں نے کنارے تک پہنچنے کے لئے کافی ہاتھ پاؤں مارے، مگر بات نہ بنی۔ قریب تھا کہ میرے ڈوبنے کا عمل اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے کہ ایک نیک دل لڑکے نے پانی میں کود کر مجھے اپنی باہوں میں لے لیا۔ اور کنارے پر لا کر ڈال دیا۔ میں اس وقت بے ہوش ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد طبیعت سنبھلی، تو گرتا، پڑتا گھر پہنچا۔ ابا، امی اس حادثے کی خبر سن کر سخت پریشان ہوئے اور انہوں نے راہِ خدا اسوا روپے کا چُورمہ (چُورمہ: تنور کی گرم روٹی، شکر، گھی کے ملغوبے کا نام ہے) غریبوں میں تقسیم کیا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ

؏ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!!

ہمارے گاؤں کے قریب دامنِ کوہ میں بہت عمدہ شکار گاہیں ہیں۔ یہاں ہرن کلیلیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دور دراز علاقوں سے شکاری آ کر یہاں "دادِ شجاعت" دیتے ہیں۔ گاؤں کے ارد گرد تیتر، تلیر، بٹیر وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ میں ہرن، ہڑیال کے شکار پر تو کبھی نکلا نہیں، کہ اس میں محنت زیادہ پڑتی تھی۔ مگر تیتر، بٹیر پکڑنے اکثر اپنے تایا نادر خان مرحوم کے ہمراہ چل پڑتا۔ وہ علاقے بھر میں مشہور شکاری مانے جاتے تھے۔ بٹیر پکڑنے کا عمل خاصا دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ کہیں، تو کچھ عرض کروں۔ ہوتا یوں ہے کہ گاؤں سے باہر کھلے کھیتوں میں شکاری حضرات صبح سویرے

جا براجماں ہوتے ہیں۔ پنجروں میں قید کیئے ہوئے پرندوں کے جھنڈ کو (جسے فنی زبان میں "بلارا" کہتے ہیں)، وہ کھیت کے سرے پر رکھ دیتے ہیں، ان قیدی پرندوں کی آہ وزاریاں سن کر آزاد پنچھی دور دراز سے پرواز کرتے ہوئے اس کھیت میں "نازل" ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ شکاری حضرات، کھیت کے ایک سرے پر جال بچھا دیتے ہیں اور دوسرے سے دو شکاری رسی ("سرک") کے دونوں سروں کو ہاتھوں میں بھینچ کر اسے کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس عمل سے کھیت میں سرسراہٹ پیدا ہونے لگتی ہے اور بٹیر سراسیمگی کے عالم میں آگے بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب رسی کھینچنے کا عمل، کھیت کے انتہائی سرے تک پہنچتا ہے تو اس کی رفتار میں تیزی پیدا کر دی جاتی ہے۔ پرندے سمجھتے ہیں کوئی آفت سر پر آن پڑی ہے۔ وہ اُڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر آگے پھیلا ہوا جال انہیں اپنی باہوں میں لینے کا منتظر ہوتا ہے۔ پرندے اس جال میں اُلجھ جاتے ہیں۔ پھر شکاری کا دستِ شفقت ان پر جا پڑتا ہے۔ اس طرح کھلی فضاؤں میں مستانہ وار اُڑنے والے یہ پنچھی تنگ و تاریک گتھیوں یا "پنجریوں" (پنجرے کی اہلیہ محترمہ) میں مقیّد ہو جاتے ہیں۔ شکاری حضرات بڑے کائیاں ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ نسل کے بٹیر کو عوامی بٹیروں سے فوراً الگ کر لیتے ہیں۔ عوامی بٹیر تو جھٹ "جامِ شہادت" نوش فرما لیتے ہیں۔ البتہ اعلیٰ نسل کے پرندوں کو بھرپور تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ میاں صف شکن علی شاہ کے رنگ میں جلوہ گر ہو کر دشمنوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیں۔ بٹیر بازی کی زیادہ تفصیل

درکار ہو تو" فسانہ آزاد کی نگارشات سے فائدہ اٹھائیے۔ ہاں میاں خوجی کے حضور کورنش بجا لانا نہ بھولیے۔ ورنہ ان کی قرولی حرکت میں آجائے گی۔

میں بتا رہا تھا کہ گاہے گاہے میں تایا جی کے ہمراہ شکار پر نکل جایا کرتا۔ مال غنیمت سے مجھے بھی تھوڑا بہت حصہ مل جاتا۔ بٹیر اگر لڑاکا نسل سے تعلق رکھتے، تو میں انہیں ہاتھ میں لے کر "گوہلا" (DOCILE) کرنے لگتا۔ برائلر (BROILER) نسل کے ہوتے تو جھٹ انہیں "راہِ حق" میں قربان کر ڈالتا۔ سچ یہ ہے کہ بٹیر کا گوشت بے حد لذیذ ہوتا ہے۔ اور مجھے بہت پسند ہے۔ ویسے "تایا جی کے حضور" زانوئے "تلمذ" تہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ مجھے بٹیر بازی کی علّت پڑ گئی۔ میں رات گئے تک پڑھائی کے دوران انہیں ہاتھ میں دابے رکھتا، تاکہ ان کی اجنبیت دور ہو اور وہ "مدنیّت" کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکیں۔ بٹیر بازوں کی محفل میں بیٹھنا بڑا دلچسپ مشغلہ ہے۔ یہ "پدی مار" مخلوق اپنے "سورماؤں" کی شان میں آسمان کے تارے توڑ لاتی ہے۔ ان کے کچھ "ملفوظات" آپ کی نذر ہیں۔

"میرے بٹیر نے پہلی "دولتی" میں ہی اپنے مخالف کو ڈھیر کر دیا۔" "میرے بٹیر نے مدِمقابل کی آنکھ ایک ہی 'پھڑک' (وار) میں پھوڑ دی۔"

"میرا بچہ" چونچ کے ہر وار کے ساتھ دشمن کا گوشت کھینچ نکالتا ہے۔"

یہ اور اس طرح کے جملے سن کر میں بہت خوش ہوا کرتا۔ ابّا جی تو مجھے ان محفلوں میں شریک ہونے سے زیادہ منع نہ کرتے کہ وہ خود بھی اس مشغلہ کو کسی حد تک پسند فرماتے۔ البتہ امّی جی بہت پریشان رہتیں کہتیں

بیٹے۔ یہ پتّری ماروں کا مشغلہ چھوڑ۔ یہ کام اچھا نہیں۔ پھر میں نے ماں جی کے حکم کی تعمیل میں اس دھندے سے ہمیشہ کے لیئے توبہ کرلی۔

پیارے قارئین! میں چوتھی جماعت کا طالب علم تھا کہ ابا جی نے پرانے مکان کو گرا کر اس کی جگہ نیا گھر بنانے کا فیصلہ کیا۔ اللہ کا نام لے کر انہوں نے گھر کے تعمیر کی تمام ذمہ داریاں مستری سید ولی مرحوم کو سونپ دیں۔ زمانہ اچھا تھا۔ اینٹیں آٹھ روپے ہزار، سیمنٹ ایک روپیہ توڑا، لکڑی دیار چار آنے فی بالا، "کڑی" دشہتیر دو روپے فی نگ تھا، مٹی پانچ پیسے فی بورا، پانی کا گھڑا دو پیسے، غرض ہر قسم کا عمارتی سامان بے حد سستا تھا۔ مزدور کا محنتانہ چار آنے اور مستری کا معاوضہ ایک روپیہ فی یوم مقرر تھا۔ میں اسکول سے لوٹ کر گھر آتا تو تایا سید ولی کا ہاتھ بٹانے لگتا۔ کبھی کرنڈی ہاتھ میں لے کر گارا، سیمنٹ چننے لگتا۔ کبھی رندے سے لکڑی "ہموار" کرنے بیٹھ جاتا۔ مستری لوگ اپنے ہتھیاروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ مگر میرے ساتھ خصوصی رعایت برتی جاتی۔ میری ہر حماقت کو ہنسی مذاق میں ٹال دیا جاتا۔ مکان مکمل ہونے میں کوئی اڑھائی ماہ کا عرصہ لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، جب ہم نے مستری، مزدور حضرات کی الوداعی دعوت دی، تو مستری سید ولی کا کل معاوضہ ۶۵/- روپے بنا۔ مزدور فرمان علی کے حصے میں ۱۶/- روپے آئے۔ مستری صاحب نے ۶۰/- روپے اور فرمان علی نے ۱۵/- روپے وصول کیئے۔ باقی رقم انہوں نے رضا کارانہ طور پر خود ہی چھوڑ دی۔ مکان پر کل لاگت چار سو روپے

روپے آئی۔ مکانیت بھی اب ذرا سن لیجئے: صُفّہ (ماسٹر بیڈ) ایک، بیٹھک ایک، کوٹھڑی ایک، برآمدہ ایک، رسوئی (کچن) ایک۔ اور اس کام پر کل خرچ صرف چار سو روپے۔ کیوں صاحب، کیا خیال ہے آپ کا؟ زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ آج اتنے گھر کا ماہوار کرایہ ۴۰۰ – ۵۰۰ روپے سے آگے نکل چکا ہے۔

پیارے قارئین! ہم نے گھوم پھر کر خوب سیر کر لی۔ آیئے، آپ کو دوبارہ اپنے اسکول لیے چلتا ہوں۔ میں نے جب اسکول میں داخلہ لیا تو راجہ تُراب خان صاحب، اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کا ذکر خیر پہلے بھی آ چکا ہے۔ موصوف بڑی بارُعب شخصیّت کے مالک تھے۔ لڑکے ان سے بہت خوفزدہ رہتے۔ مگر اس ناچیز پر وہ اپنی خصوصی توجہ ارزانی فرماتے۔ دراصل ہمارے مُقرّر ہونے کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ مولوی کا لیکچر بہت عمدہ ہے" یہ ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ آپ کو یاد ہے، وہ ہمیں پیار سے "مولوی" کہا کرتے تھے۔ اُن دنوں ہمارے "تقدّس" کی دھوم تھی!

راجہ صاحب گاؤں میں مجرّد رہتے تھے۔ کھانے پینے کا خود ہی اہتمام کرتے۔ بازار سے سودا سلف خود خرید کر لاتے۔ کسی پر بھروسہ نہ کرتے۔ انہیں گوشت کھانے کا بڑا شوق تھا۔ اور وہ امام دین قصائی سے ہر روز پانچ پیسے کے عوض بکری کا ایک پاؤ گوشت خرید کر لاتے۔ ان دنوں ایک پاؤ گوشت خریدنا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ امام دین قصائی دوستوں میں بیٹھتا۔ تو ان کا خوب مذاق اُڑاتا۔ میں

اس دور کا مقابلہ آج کے حالات سے کرتا ہوں تو کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ اُن دنوں بڑا گوشت کھانا بڑا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آج اسی گلے سڑے "سنڈھے" (بھینسے) کے گوشت کو ہنٹر بیف کا نام دے کر اسے اونچی دعوتوں میں اُڑایا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں پاؤ، آدھ سیر گوشت خریدنے والوں پر پھبتی کسی جاتی تھی۔ آج کے دور میں بڑے بڑے ماڈرن گھرانے بکری کی ایک ران خرید کر اسے ریفریجریٹر میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ اور پھر گھر میں پکنے والی دال یا سبزی کو ایک دو بوٹیاں روزانہ سونگھا دی جاتی ہیں "تاکہ ذائقہ تبدیل ہو جائے۔ اور "جدیدیت" بھی محفوظ رہے۔ اگلے وقتوں میں ڈالڈا گھی کا استعمال بڑا گھٹیا فعل سمجھا جاتا تھا۔ کوئی شامت کا مارا "ولایتی گھی" خریدنے کی "گستاخی" کر بیٹھتا تو وہ اسے چادر یا کپڑے کی تہ میں چھپا کر گھر لاتا کہ کہیں اس کی چوری پکڑی نہ جائے۔ اب حالت یہ ہے، بڑے بڑے شرفا ڈالڈا گھی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کسی خوش نصیب کو یہ نعمت میسّر آ جائے، تو خوشی کے مارے "تھرکنے" لگتا ہے۔

گھی کا ڈبہ اپنی ہتھیلی پر سجا کر گھر پہنچتا ہے۔ دیکھنے والے، اس کے نصیبوں پر رشک کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں خالص گھی، مکھن اور دودھ کا استعمال کھانے کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ آج کل رجحان کارن آئیل اور نیٹڈو ملک کے وارے نیارے ہیں۔ گھی اور مکھن کا داخلہ ممنوع۔" ان میں چربی (FATS) ہوتی ہے۔ ان سے موٹاپا بڑھتا

ہے۔" پہلے دنوں میں اگر کوئی مہمان آجاتا، تو مٹی کی رکابی (تھالی) میں خالص گھی اور شکر ڈال کر اس کی خاطر مدارات کی جاتی۔ اب خالص گھی کا ذکر اونچے گھروں میں منع ہے۔ اس سے دل کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اگلے وقتوں میں بعد دوپہر کوئی مہمان آجاتا، تو بھنے ہوئے چنوں یا ان کے "مرنڈوں" (چنے + گڑ) سے ان کی مدارات ہوتی تھی۔ اب چائے کے جام، دیر سویر، چلتے رہتے ہیں۔

جام پر جام لنڈھاؤ تمہیں ڈر کس کا ہے!

باب — ۵

اسکول کی سرگرمیاں

ہم ذرا دور نکل آئے۔ اُدھر راجہ تراب خان ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ میں عرض کر رہا تھا۔ راجہ صاحب خود ہی سالن پکاتے۔ اس ضمن میں وہ ہمارا تعاون بھی حاصل کرتے۔ ہم میں سے کوئی لہسن چھیلتا، کوئی پیاز کاٹتا، کوئی مسالہ پیستا کوئی آگ جلاتا کوئی پانی بھر کر لاتا۔ راجہ صاحب خود کڑی نگاہوں سے ہم سب کی نگرانی کرتے۔ گوشت جب بھونا جا رہا ہوتا تو اس وقت ہماری حالت دیدنی ہوتی۔ بڑا جی چاہتا، بھنے ہوئے گوشت کی ایک آدھ بوٹی ہم ہتھیا سکیں۔ مگر یہ نہ تھی ہماری قسمت۔ ہم دیکھتے ہی رہ جاتے۔ اور راجہ صاحب ہنڈیا میں پانی اُنڈیل دیتے۔ اس طرح ہماری اُمیدوں پر پانی پھر جاتا۔

راجہ صاحب علاقہ بھر میں بڑے ہر دلعزیز تھے۔ چوہدری سردار

خان سیکنڈ ماسٹر ان کے دستِ راست تھے۔ ہر دو حضرات کا یہ معمول تھا کہ وہ چھٹی کا دن اپنے کسی شاگرد کے ہاں گزارتے۔ اس کے لئے انہیں باقاعدہ دعوت نامہ ملتا۔ وہ کسی کے ہاں کبھی بن بلائے مہمان نہ بنتے تھے۔ قیام کے دوران ان کی بھرپور خاطر مدارات کی جاتی۔ گاؤں کی بیبیاں مرغ روسٹ کرنے اور "تر بہ تر" حلوہ تیار کرنے میں بڑی ماہر ہوتی ہیں۔ ان دونوں چیزوں سے ماسٹر صاحبان کا کھانا ترتیب پاتا۔ لنچ پر مکھن کے پیڑوں، پراٹھوں اور بھنے ہوئے انڈوں (خاگینہ) سے ان کی تواضع کی جاتی۔ ناشتے میں دودھ، مکھن، بالائی کا دور چلتا۔ سب شاگردوں کی یہ خواہش ہوتی کہ ماسٹر جی ان کے ہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ ہماری امی بھی تھوڑے وقفے بعد میرے استادوں کی روٹی پکایا کرتی تھیں۔ "روٹی پکانے" کا مطلب تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے ..... مدعو کرنا۔ امی جی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے بہت پسند کئے جاتے۔ وہ گوشت بھونتے وقت پانی کا بہت کم استعمال کرتیں۔ زیادہ توجہ گھی پر ہی دیتیں۔ گھی میں ہی مرغ تل لیا جاتا۔ اور حلوے پر بھی گھی کی گہری تہیں دکھائی دیتیں۔ ہمارے مہمان کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے اور جی بھر کر امی جی کی تعریف کرتے۔

معزز قارئین! ہم مڈل اسکول سرگ ڈھن کی چاردیواری میں داخل ہوتے ہی اکثر بھٹکنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو پابہ زنجیر کر کے دیکھیں گے کہ وہاں گلشن کا کاروبار کیسے چل رہا ہے۔

میں تصویر کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش کروں گا۔ یاد رہے، ہماری بات چیت ۴۰-۱۹۳۹ء کے حوالے سے ہو رہی ہے۔

اس زمانے میں استاد، شاگرد اور والدین کے مابین ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کی فضا پائی جاتی تھی۔ استاد بچوں پر ذاتی توجہ دیتے اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے۔ بچوں اور ان کے والدین کو ذاتی طور پر جانتے۔ ان کے ماحول اور ان کی خامیوں، خوبیوں سے اچھی طرح شناسا ہوتے۔ اور اسی تناظر میں بچوں کی دیکھ بھال کرتے۔

مجموعی طور پر اساتذہ کا اپنا علمی معیار بہت بلند ہوتا۔ اردو اور فارسی میں تو انہیں خصوصی مہارت حاصل ہوتی۔ وہ بچوں کے اندر یہی شوق منتقل کرنے کی کوشش کرتے۔ گلستان، بوستان کے اسباق انہیں ازبر کراتے۔ اقبال کی مشہور نظمیں بھی حفظ کرائی جاتیں۔ حالی کے کلام سے وہ خود بھی فیض یاب ہوتے اور اپنے شاگردوں کو بھی مسدس حالی پڑھنے کی ترغیب دیتے۔ شاہنامہ اسلام پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی۔ بچوں کی لکھائی پر بھی دھیان دیا جاتا۔ پانچویں جماعت تک تختی پر لکھنے کا حکم تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ سرِ مُو اس سے انحراف کرتا۔ صرف سرکنڈے کا قلم چلتا تھا۔ فاؤنٹین پین کا داخلہ ممنوع تھا۔ فاؤنٹین پین سے لکھنے کا رواج بہت بعد کی چیز ہے۔ اس پین کی "کرم فرمائیاں" دیکھنی ہوں تو کسی انگلش میڈیم اسکول کے بچوں کی کاپیاں اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ آپ کی صحت پر یقیناً خوشگوار اثر پڑے گا۔

ہمارے اساتذہ پہاڑے رٹوانے پر بہت زور دیتے تھے۔ آخری

پیریڈ میں ساری کلاس کورس کے انداز میں گا کر پہاڑے ازبر کرتی۔ عام ترتیب میں تو پہاڑے رٹنے کا کام آسان تھا، مگر نکواں پہاڑے ذرا مشکل سے حفظ ہوتے، بہرحال، ڈنڈوں کے خوف سے یہ معرکہ بھی سر ہو جاتا۔ پہاڑوں کا ازبر ہونا ریاضی کے سوال حل کرنے میں بڑی مدد کرتا۔ اِدھر سوال سُنا اُدھر جواب حاضر۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں اگر آپ چھٹی جماعت کے کسی بچے سے پوچھیں۔ ۴ × ۵ (چار ضرب پانچ) تو وہ پہروں گہری سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ اور آخر میں اپنی معذوری کا اظہار کر دیتا ہے۔

گھر کا کام (HOME TASK) نہ صرف باقاعدگی سے ملتا، بلکہ پورے اہتمام کے ساتھ دوسرے دن اس کی جانچ پڑتال کی جاتی۔ کیا مجال، کوئی بچہ "ڈاج" دینے کی کوشش کرے۔ "ڈاجنگ" کا تصور بہت بعد میں مقبول ہوا۔

ہمارے اساتذہ سبق کو بار بار دہرانے اور اسے ازبر کرنے (INTENSIVE DRILL) پر خصوصی توجہ دیتے۔

ہماری تعلیمی زندگی میں "اپنی مدد آپ" کی بڑی اہمیت تھی، ہمارے اساتذہ اسکول کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ کا اہتمام اپنے طلبہ کے تعاون سے کرتے۔ ہم لوگ صبح سویرے، حمد و ثنا کے بعد سارے سکول کے احاطے میں پھیل جاتے اور تمام احاطے کی بھرپور صفائی کرتے۔ پھر کمروں کی صفائی کی باری آتی۔ یہ کام مکمل ہونے پر پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوتا۔ اسکول کے فرش ناپختہ تھے۔ ان پر خوب دھول اُڑتی۔ ہمیں ٹاٹ کے ٹکڑوں پر زمین پر بیٹھنا پڑتا۔ بینچ، ڈیسک کے نام سے بھی ہم لوگ

بے خبر تھے۔ ہمارا معمول یہ تھا کہ کلاسیں شروع ہونے سے پہلے صفائی کے ساتھ ساتھ احاطے اور کمروں میں پانی کا چھڑکاؤ بھی کرتے، تاکہ دھول بیٹھ جائے اور کپڑے گرد و غبار سے محفوظ رہیں۔

اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ہمارے اسکول میں مباحثوں، تقریروں اور کھیلوں پر پوری توجہ دی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ بیت بازی بھی بہت مقبول تعلیمی مشغلہ تھا۔ بیت بازی کے مقابلے بڑی دھوم دھام سے منعقد ہوتے۔ اس مشغلے کا اور کوئی فائدہ ہو، نہ ہو، ہم طالب علموں کے اندر شعری ذوق پیدا کرنے میں اس سے بڑی مدد ملتی۔ کئی بار اگر بر وقت کوئی شعر ذہن میں نہ آتا، تو ہم لوگ تُک بندی سے کام لے لیتے۔ بسا اوقات داؤ چل جاتا۔ کبھی کبھی جب ہمارا "کلام" زیادہ ہچکولے کھانے لگتا تو ہمارا شعر رد کر دیا جاتا۔ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے مجھے سینکڑوں اشعار حفظ ہو چکے تھے۔ کچھ اچھے، کچھ بھرتی کے۔ بعد میں ان اشعار نے میری تحریروں کو نکھارنے میں بڑی مدد کی۔ ہم جب گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم میں داخل ہوئے تو ہماری توقع سے بڑھ کر ادبی ذوق کے چرچے ہونے لگے۔ کلاس میں دھوم مچ گئی۔ ماسٹر کلیم صاحب اکثر ہم سے شعر سنانے کی فرمائش کرتے۔ اور ہم ہلکے سے تامل کے بعد "عرض کیا ہے" کا سلسلہ شروع کر دیتے۔

قارئین کرام کو شاید اندازہ ہو کہ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں ٹیوشن پڑھنے کا قطعاً کوئی رواج نہ تھا۔ مگر اساتذہ تعلیمی

اوقات کے بعد بھی بچوں کو پڑھانے میں بڑی خوشی محسوس کرتے۔ آٹھویں جماعت اسکول کی سرتاج کلاس سمجھی جاتی تھی۔ چھوٹے بچے بڑی حسرت سے اس کلاس کے لڑکوں کو دیکھتے۔ اور پھر اپنے مخصوص پوٹھواری لہجے میں کہتے۔ دیکھو۔ یہ لڑکا "اٹھیں" جماعت میں پڑھتا ہے۔ امتحان جب قریب آتا، تو "آٹھیں" جماعت کے لڑکے اپنے بستر لاکر اسکول میں براجمان ہو جاتے۔ اساتذہ کرام رات گئے تک انہیں مٹی کے دیئے کی روشنی میں درس دیتے اور خوب "رگڑا" بھی لگواتے۔ اس ساری خدمت کا وہ کوئی صلہ طلب نہ کرتے۔ بچوں کی بہبود اور اسکول کی شہرت ہی اُن کا سب سے بڑا صلہ تھا۔

آپ نے تصویر کا روشن رُخ تو دیکھ لیا۔ اب آپ کو "خوگرِ حمد" سے تھوڑا سا گلہ بھی سننا پڑے گا۔

ہمارے اساتذہ کی غالب اکثریت "جورِ استاد بہ زمہرِ پدر" کے اصول کی قائل تھی۔ بچوں کی لغزشوں، خطاؤں اور کمزوریوں پر چشم پوشی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ بعض اساتذہ بڑی بے رحمی کے ساتھ بچوں کی پٹائی کرتے۔ اس عمل میں وہ لاتوں، جوتوں، گھونسوں، ڈنڈوں سبھی سے کام لیتے۔ کئی بار تو بچوں کے گال سوج جاتے، ان کی ناک سے خون کی نکیر پھوٹ پڑتی۔ اور ان کی پیٹھ پر برسنے والے ڈنڈوں کی تعداد گنی جا سکتی تھی۔ اللہ بخشے، ماسٹر اللہ دتہ اس فن میں لاثانی تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اس بے دردی سے پیٹتے کہ بچے ہفتوں تک بستر پر دراز رہ کر "ٹکور" کراتے۔

پھر کہیں اس قابل ہوتے کہ دوبارہ اسکول جا کر استاد جی کو مشقِ ستم کا ایک اور موقع فراہم کریں۔ ماسٹر اللہ دتہ کو اس بے رحمانہ طرزِ عمل کا کئی بار خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔ آخر، تنگ آ کر افسرانِ بالا نے انہیں گاؤں سے دور سنگھوئی کے قریب ایک چھوٹے سے اسکول میں تبدیل کر دیا۔

قبلہ تھے ماشا اللہ رنگین مزاج۔ انہوں نے تاریک بادلوں کے اندھیاروں میں بھی اُمید کی کرن ڈھونڈ نکالی۔ یعنی وہاں ایک جواں سال عفیفہ سے شادی رچا لی۔ سنا ہے یہ شادی انہیں بڑی مہنگی پڑی۔ ان کے خاندان کا سکون تہ و بالا ہو گیا۔ مگر ماسٹر جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ یہ سچ ہے۔ عشق پر زور نہیں ....

ڈنڈوں، گھونسوں اور جوتوں کا تذکرہ تو آپ نے سن لیا۔ ہمارے وقتوں میں بچوں کو سزا دینے کا ایک اور طریق بھی رائج تھا اور وہ تھا مرغا بنانے کا۔ یہ بڑا تکلیف دہ تجربہ ہوتا ہے۔

دیکھئے، ایک اچھا بھلا بچہ، کس طرح اپنی نوع تبدیل کر کے مرغ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ آپ اس نادر تجربے سے نہیں گزرے ہونگے، ہم انکی "ترکیبِ استعمال" بیان کیئے دیتے ہیں۔ سزا یافتہ بچے کو حکم ملتا ہے: "کان پکڑو۔" بچہ تعمیلِ ارشاد میں سرنگوں ہو کر اپنے ہاتھوں کو اپنی ٹانگوں کے بیچ سے گزار کر اپنے کانوں کو چُھوتا ہے۔ ایسا کرنے کے لئے بڑی مہارت درکار ہوتی ہے۔

مگر مسلسل مشق سے (جو ہمیں کثرت سے فراہم کی جاتی تھی) یہ مرحلہ آسان ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو بچہ کانوں کو چھوئے رکھتا ہے۔ مگر جب اس کی رگوں اور اعصاب میں سخت کھنچاؤ پیدا ہونے لگتا ہے تو وہ ڈگمگانے لگتا ہے۔ اپنا توازن برقرار رکھنے کے لئے کبھی اپنی اوپر اٹھی ہوئی پیٹھ کو نیچے ڈھلکاتا ہے۔ کبھی دائیں پاؤں کو ذرا اوپر اٹھاتا ہے۔ کبھی بائیں پاؤں کو۔ ادھر ماسٹر جی کی خوفناک نگاہیں اس تاک میں رہتی ہیں کہ لڑکا مرغا بننے کے مسلمہ آداب کی ذرا خلاف ورزی کرے تو اس گستاخ کی پیٹھ پر جوتے برسائے جائیں۔

ہمارے وقتوں میں اساتذہ بچوں سے ذاتی بیگار لینے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے تھے۔ مقامی اساتذہ کو چھوڑ کر باقی استاد اسکول کے آس، پاس کوئی مکان یا حویلی رہائش کیلئے لے لیتے۔ کرایہ لینے دینے کا کوئی رواج نہ تھا۔ روٹی پکانے کے لئے کسی بڑھیا کی خدمات مستعار لی جاتیں۔ ہنڈیا تیار کرنا، برتن مانجھنا کمروں میں جھاڑو دینا، کھیتوں سے ساگ پات توڑ کر لانا، ایندھن کے لیئے اپلوں، درختوں کی سوکھی ٹہنیوں، لکڑی کے خشک ٹکڑوں کو جمع کرنا...... یہ سب "منظورِ نظر" شاگردوں کے فرائض میں شامل ہوتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ماسٹر صاحب کی چلم بھرنا بھی ایک خصوصی فریضہ تھا۔ لڑکے حقے میں تازہ پانی بھرتے، اپلوں کی آگ دہکاتے "بیڑے" والے تمباکو کو ہاتھوں میں مسل کر "ٹوپی" میں چنتے۔ اور پھر جب میدان اچھی طرح گرم ہو جاتا یعنی "سوٹے" کے ساتھ

دھوئیں کی لکیر ابھرنے لگتی تو حُقہ ماسٹر جی کی نذر کر دیا جاتا۔ پھر ماسٹر جی غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں کو "سُوٹے" کے دُھوئیں کی نذر کر دیتے۔

دیہاتی بچوں کی نظروں میں "بڑے بابو" (ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر) اور "چھوٹے بابو" (اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر) کا وجود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بچوں کو بار بار باور کرایا جاتا ہے کہ "بابو" بڑی شے کا نام ہے۔ اب تو حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں، اس زمانے میں "بابو" کی آمد کا پتہ چل جائے تو اسکول کو زور شور سے سجایا، سنوارا جاتا تھا۔ چوزوں، انڈوں کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ اکثر اوقات ماسٹر صاحبان اس "دعوتِ شیراز" پر اُٹھنے والی رقم آپس میں تقسیم کر لیتے تھے مگر بل زیادہ وزنی ہو جاتے تو لڑکوں کو بھی اس کارِ خیر میں شریک کر لیا جاتا تھا تاکہ وہ بھی "ثواب" سے محروم نہ رہیں۔ بچے آنہ دو آنے گھر سے مانگ لاتے "مائیں" پیسے تو دے دیتیں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر وہ یہ "نذرانہ" پیش کرتے وقت جس "ادبِ عالیہ" کا مظاہرہ کرتیں، وہ اگر "بابو" یا ان کے اہل کار کبھی سُن لیتے تو بخدا، وہ انڈے، مرغی کھانے سے ہمیشہ کے لیے تائب ہو جاتے۔

پیشگی اطلاع دے کر قدم رنجہ فرمانے والے بابوؤں کا حال تو آپ نے سُن ہی لیا۔ اب اگر کوئی "بابو" اچانک چھاپہ مارے تو اساتذہ کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عجیب بھگدڑ کا سماں دیکھنے میں آتا۔

اسکول کی خاموش موجوں میں بھرپور تلاطم کے آثار دکھائی دینے لگتے۔ اس طرح کے ایک "چھاپے" کا آنکھوں دیکھا حال آپ بھی سنیئے۔

۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ میں ان دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ہم لوگ باہر صحن میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اُدھر ہمارے اساتذہ کرام بیر اور مونگ پھلی سے شغل فرما رہے تھے۔ ظاہر ہے۔ دھوئیں کے مرغولے بھی اُٹھ رہے تھے۔ اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ اسکول کی مائی، حیات نور کھیتوں سے بھاگی چلی آ رہی ہے۔ خدا خیر کرے، اس پر کیا افتاد آن پڑی ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے قریب آ کر وہ رکتی ہے اور سانس کی رفتار نارمل ہونے پر "عرض" کرتی ہے۔ صاحب جی! دیکھیں! "مقبرے" کے قریب بوٹ سوٹ پہنے ایک افسر نیچے اُتر رہا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے، ہو نہ ہو، یہ "بابو" ہی ہو گا۔ یہ سنتے ہی سارے اسکول میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ لڑکے مونگ پھلی کے چھلکے اور بیروں کی گٹھلیاں چننے لگتے ہیں۔ جلدی جلدی جھاڑو بھی دیا جاتا ہے۔ ماسی حیات نور تتلی کی مانند اسکول کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُڑی چلی جا رہی ہے۔ اس جانگسل موقع پر اللہ بخشے، ہمارے استاد، رحم علی کو ایک انوکھی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ بیچارے آج تہمند باندھے ہوئے ہیں۔ ویسے انہوں نے "داشتہ آید بکار" کے پیشِ نظر ایک شلوار بھی اسکول میں لٹکا رکھی ہے۔ آج اس شلوار کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ماسٹر جی شلوار کی جانب لپکتے ہیں اور اسے زیبِ تن

کرنے لگتے ہیں۔ "بابوجی" کی سواری اسکول پہنچنے ہی والی ہے۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ ماسٹر جی کیا دیکھتے ہیں آزار بند تعاون پر آمادہ نہیں۔ وہ جلدی جلدی آزار بند کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں اور آخر کامیاب بھی ہو جاتے ہیں مگر اس کشمکش میں شلوار اُلٹی پہن لی جاتی ہے۔ لڑکے یہ حرکت دیکھ کر زیرِ لب مُسکرا رہے ہیں مگر لب کشائی کی کسے مجال۔ اتنے میں "بابوجی" اسکول پہنچ جاتے ہیں۔ استادوں سے اُن کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ "بابو صاحب" ماسٹر رحم علی سے مصافحہ کرنے لگتے ہیں تو اُن کی نظر شلوار پر جا پڑتی ہے۔ وہ بے اختیار ہنسنے لگتے ہیں۔ ماسٹر جی کی چوری پکڑی جاتی ہے اور پھر ان کی جو حالت ہوئی اُس کا اندازہ لگا لیجئے۔

ویسے ان تمام بشری کمزوریوں کے باوجود دیہات کے اساتذہ کرام کے بارے میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ جہالت کا اندھیرا دور کرنے میں اِن بندگانِ خدا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ اِن حضرات کا احسان ہے کہ وہ نہایت قلیل مشاہرے کے باوجود اپنے فرائض منصبی سرانجام دیتے رہتے ہیں خود، میرے اباجی (اللہ بخشے) ایک دیہات کے مدرس تھے۔ ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی ماہوار تنخواہ صرف اٹھارہ روپے تھی۔ عہدِ ملازمت کا بیشتر حِصّہ انہوں نے آٹھ روپے ماہوار مشاہرے کی نذر کیا تھا۔ جب وہ ملازمت سے فارغ ہوئے تو نہ کوئی پنشن، نہ گریجویٹی نہ بونس۔ پراویڈنٹ فنڈ کی کل رقم ۹۰۰ روپے تھی۔ یہی ان کی عمر بھر کی کمائی تھی اور اسی "بنک بیلنس" کے بل بوتے پر ہمیں بڑے بڑے معرکے

سر کرنے تھے۔ ان معرکوں کی تفصیل کے لئے آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔

قارئین! اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنے ابتدائی اسکول کو خیر باد کہہ کر آپ کو اپنے ہمراہ جہلم لئے چلوں، جہاں آٹھویں جماعت پاس کرنے کے بعد مجھے جونیئر کلاس میں داخلہ دلایا جاتا ہے۔ جہلم جانے سے پہلے، اپنے اسکول کے در و دیوار پر ایک آخری نگاہ ڈالتے چلیں۔ مڈل اسکول سرگ ڈھن کو علاقہ بھر میں ایک مرکزی مقام حاصل ہے۔ کم و بیش تیس چالیس چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کے بچے، چار، چھ میل کی مسافت طے کرکے یہاں تحصیلِ علم کے لئے آتے ہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ بچے علی الصبح اسکول کا رُخ کرتے ہیں اور ایک رومال میں اپنا "لنچ" باندھ لاتے ہیں۔ ٹفن باکس یا لنچ باکس کی بات ہی چھوڑیئے۔ یہ تو رئیسوں کے چونچلے ہیں۔ یہ "لنچ" پراٹھا، یا خشک روٹی، گڑ، یا اچار پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب بریک ہوتی ہے، جسے عرفِ عام میں "تفریح" کہا جاتا ہے تو گاؤں کے بچے بھاگے بھاگے اپنے اپنے گھروں کا رُخ کرتے ہیں، مگر مضافات کے آئے ہوئے بچے اچار یا گڑ کا "ماحضر" تناول فرماتے ہیں۔ اسکول میں پانی بھرنے والی مائی بھی اس لنچ سے اپنا حصہ وصول کرتی ہے۔ لڑکے اپنے پراٹھے سے ایک دو نوالے توڑ کر اس کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح یہ بیچاری ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ان پر اپنی گزر بسر کرتی ہے۔ اسکول کے یونین فنڈ سے اسے دو ۲/- روپے ماہوار تنخواہ بھی ملتی ہے۔ اتنی "خطیر" رقم وصول کرنے

کے بعد بھی اگر وہ اپنی تنگ دستی کا گلہ کرے، تو کیا زیادتی نہیں ہے۔

تفریح کے وقت بچے دیہاتی طرز کے کھیلوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کبھی گلی ڈنڈے کی بازی لگتی ہے، کہیں آنکھ، مچولی (چھپین چھپان) کا سلسلہ چلتا ہے۔ ایک طرف "بنٹے" (بلوروں) سے جی بہلایا جا رہا ہے تو دوسری جانب "چینجو" (ایک ٹانگ پر کودنا اور منزلِ مقصود کو چھونا) کی بساط جمتی ہے۔ اسکول کے پاس واقع جھاڑیوں پر بھی "چشمِ التفات" مبذول کی جاتی ہے۔ لڑکے بیروں سے جھولیاں بھر لاتے ہیں خود کھاتے، اور دوسروں کو کھلاتے ہیں۔ غرض یہ وقفہ اسی طرح کے اور کئی معصومانہ مشاغل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

باب — ۶

سرگ ڈھن سے جہلم تک

قارئین! میں نے اسی ماحول میں آٹھویں درجے تک تعلیم حاصل کی۔ ہمارے اسکول میں انگریزی پڑھانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان تو اعزازی نشان کے ساتھ پاس کر لیا۔ مگر انگریزی زبان کی ابجد سے بھی میں بے بہرہ تھا۔ بہت غور و خوض کے بعد ابا جی نے فیصلہ کیا کہ وہ مجھے مزید تعلیم ضرور دلوائیں گے۔ انگریزی کی کمی دُور کرنے کا بھی ایک حل موجود تھا۔ اُن دنوں دیہاتی بچوں کے لئے جونیئر اور سینئر کلاسوں کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان دو کلاسوں میں دو سال تک صرف انگریزی کی تعلیم دی جاتی۔ جونیئر کلاس کے بچوں کو پانچویں اور چھٹی جماعت کی انگریزی سکھائی جاتی۔ سینئر کلاس کے بچوں کا معیار آٹھویں جماعت کی انگریزی سے ہم پلہ ہو جاتا۔ اس عمل میں دو

سال ضائع ہو جاتے۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ اس سے مفر ممکن نہ تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم میں داخلے کا پروگرام طے پایا۔ جہلم جانے سے پہلے میں نے برادرم محمد صادق مرحوم سے انگریزی کی ابجد سیکھ لی تھی۔ وہ خود بھی ورنیکلر مڈل پاس تھے۔ مگر کہیں فوجی ملازمت کے دوران انہوں نے انگریزی کی حروف تہجی سیکھ لی تھی۔ اب ان کے علم سے ہم نے فائدہ اٹھایا۔

حسنِ اتفاق سے اُس زمانے میں ہمارے ایک قریبی عزیز حوالدار کلرک عبدالمجید ظفر جہلم میں تعینات تھے۔ انہوں نے جادہ گاؤں میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے ہاں ٹھہرانے کی پیش کش کی، جسے بصد شکریہ قبول کر لیا گیا۔ تین چار ساتھی بھائی مجید کے ہم نوالہ، ہم پیالہ تھے۔ راجہ محمد صادق فوجی مل کالا میں ملازم تھے۔ منور شاہ بھی حوالدار کلرک تھے۔ (بعد میں وہ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے)۔ ایک اور صاحب تھے "شاہ جی"۔ نام ان کا ذہن میں نہیں آ رہا ہے۔ یہ چاروں حضرات برسرِ روزگار تھے۔ انہوں نے گھر کے کام کاج کے لئے ایک ملازمہ رکھی ہوئی تھی۔ نام اس کا تھا، مائی رابعہ۔ اسے ماہانہ تنخواہ دس روپے ملا کرتی تھی جسے ہم دو روپے فی کس کے حساب سے تقسیم کر لیا کرتے۔ "مائی صاحبہ" کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ تعلقاتِ عامہ (پبلک ریلیشنز) میں اس کا جواب نہ تھا۔ سارے گاؤں میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ اس کے نام سے بچہ بچہ واقف تھا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول جہلم کی ان دنوں بڑی دھوم تھی ۔ مجھے باآسانی جونیئر کلاس میں داخلہ مل گیا ۔ جونیئر کلاس کے انچارج ایک ہندو اُستاد تھے ۔ نام ان کا غالباً گردھاری لال تھا ۔ ادھیڑ عمر کے تھے اور بڑی محنت اور توجہ سے ہمیں پڑھایا کرتے ۔ موصوف چند ہی دنوں میں میری قابلیت اور لیاقت کے قائل ہو گئے ۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جونیئر اور سینئر دونوں کلاسوں کا امتحان ایک سال میں پاس کر لوں ۔ اس طرح دو سال ضائع ہونے کی بجائے صرف ایک سال کا نقصان ہوگا ۔ میں نے ان کے مشورے پر عمل کرنے کی ٹھان لی ۔ اور ساتویں اور آٹھویں جماعت کی انگریزی کتب بھی خرید لیں ۔ اب میرا معمول یہ تھا کہ جونیئر کلاس میں پڑھایا جانے والا سبق میں اسکول میں ہی تیار کر لیتا ۔ اور گھر آ کر ساتویں جماعت کی کتاب لے کر بیٹھ جاتا ۔ بھائی مجید مقدور بھر میری رہنمائی کرتے ۔ کئی بار ڈانٹ بھی پڑ جاتی جسے میں خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا ۔ مجھے اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ بھائی مجید کو صرف میری بھلائی مقصود ہے اور بس ۔ میں نے ساتویں اور آٹھویں جماعت کی کتابوں کے خلاصے بھی خرید لئے جو اُس زمانے میں ذرا مشکل سے ملا کرتے تھے ۔ آج کل تو خیر سے ہر سُو ان خلاصوں کی فصل اُگی ہوئی ہے ۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں ۔ ستم تو یہ ہے کہ ایم اے تک کے لئے خلاصے، گٹ تھرو، گائیڈز اور FIVE MINUTES BEFORE EXAMINATION قسم کے "شافی"

نسخے دستیاب ہیں۔ ان حالات میں کوئی گرتے ہوئے تعلیمی معیار کا رونا نہ روئے تو کیا کرے۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ میں نے اپنے استاد لالہ گردھاری لال، بھائی مجید اور خلاصوں کی مدد سے سینئر کلاس کی تیاری مکمل کر لی اور ایک سال کے اختتام پر دونوں امتحانوں میں شریک ہوا اور کامیاب بھی ہو گیا۔ میرے ساتھی سینئر کلاس میں پہنچے اور میں چھلانگ لگا کر نویں کلاس میں جا براجمان ہوا۔ والد صاحب نے یہ خبر سنی تو بہت خوش ہوئے۔ اور اپنے ہر ملنے والے سے میری کامیابی کا ذکر کیا۔ امی جان انہیں ہزار منع کرتیں کہ ہر کسی سے بڑھ چڑھ کر گلو (مابدولت) کی تعریف نہ کیا کریں۔ "نظرِ بد" کا ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مگر اباجی مُسکرا کر چپ ہو رہتے۔ والدہ زیادہ شدت سے انہیں منع کرتیں تو فرماتے۔ یہ "نظر وظر" کا چکر تم عورتوں کا بنایا ہوا کھیل ہے۔ ہمارے "گلو" کو ماشااللہ کچھ نہیں ہو گا۔ اللہ پاک اس کے سینے کو علم کے نور سے منور کر رہا ہے۔ پھر بھلا ہم کیوں نہ اس کے احسانات کا تذکرہ کریں۔

میں نے جونیئر سنیئر کا امتحان ایک سال میں پاس تو کر لیا، مگر سچ یہ ہے کہ میری انگریزی واجبی ہی تھی۔ نویں جماعت کے شروع میں مجھے خاصی دشواری پیش آئی۔ یا دش بخیر! پروفیسر (تب ماسٹر) اختر حسین ہمارے انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ان کا شمار انگریزی کے ماہر اساتذہ میں ہوتا تھا۔ بہت محنت اور لگن سے پڑھاتے تھے اور TENSES

پر خصوصی زور دیتے تھے۔ ان کی سخت گیری کے بڑے چرچے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دن انہوں نے مجھ سے "درخت کاٹا گیا" کا ترجمہ پوچھا۔ میں نے جواب میں عرض کیا۔

"THE TREE IS CUT" یہ سننے کی دیر تھی کہ انہوں نے مجھے زناٹے کا ایک طمانچہ رسید کیا۔ بولے۔ نالائق کہیں کے میں تجھے کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ تمہیں تو انگریزی ابجد کا بھی پتہ نہیں۔ میں شرم کے مارے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ میں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ میں نے ایک سال بچانے کی کوشش تو کی ہے مگر اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ میں عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتتا رہوں گا۔

بہر حال میں نے ہمت نہ ہاری۔ رات دن یہی دھن تھی کہ کسی طرح کمی پوری ہو جائے۔ اختر صاحب بڑی "تفصیل" سے ہوم ورک دیا کرتے۔ اسے تیار کرنے میں کئی گھنٹے صرف ہو جاتے۔ بھائی مجید صاحب اور منوّر شاہ صاحب میری پوری رہنمائی کرتے۔ میں اُس وقت تک آرام کرنے کا نام نہ لیتا جب تک اختر صاحب کا کام مکمل نہ ہو جاتا۔ یہ محنت شاقہ بار آور ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد میں کلاس کا ہم قدم ہو کر چلنے کے قابل ہو گیا۔ اب میں اختر صاحب کی خصوصی توجہ کا مرکز بننے لگا۔ وہ ہر ہفتے ہمارا ٹیسٹ لیا کرتے۔ ایک دو ٹیسٹوں میں مجھے کلاس میں اوّل آنے کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ اختر صاحب نے مجھے کلاس مانیٹر مقرر کر دیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد پٹائی کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ نوماہی امتحان میں ہمارے

نمبر سب سے زیادہ آئے۔ اب پورے اسکول میں ہماری قابلیّت کا چرچا ہونے لگا۔ اختر صاحب کی آنکھ کا تارا تو میں تھا ہی۔ اب دوسرے مسلمان اساتذہ بھی مجھے بہت عزیز رکھنے لگے۔ کلیم صاحب ہمارے اردو اور فارسی کے استاد تھے۔ وہ مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔

نوماہی امتحان کا نتیجہ سن کر اختر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے اسکول اوقات کے بعد مجھے بلایا اور پاس بٹھا کر سمجھایا۔ بیٹے یہ زمانہ سائنس کا زمانہ ہے۔ اُردو، فارسی کی اہمیّت برحق۔ مگر حالات کا تقاضہ ہے کہ مسلمان بچے ریاضی اور سائنس میں آگے بڑھیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اُردو پڑھنا چھوڑ دو۔ اور اس کی بجائے سائنس کا مضمون لے لو۔ میں نے بلا پس و پیش ان کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیا۔ میری رائے لینے کے بعد وہ مجھے استاد گرامی قدر چوہدری احمد خان سائنس ماسٹر کے کمرے میں لے گئے اور فرمانے لگے: چوہدری صاحب! آپ کے لئے آج ایک نیا مرغا پھانس کر لایا ہوں۔ اسے اپنی کلاس میں بٹھالیں اور کوشش کریں کہ اس کی پچھلی کمی پوری ہو جائے۔ لڑکا آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔

چوہدری صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ اختر صاحب۔ آپ فکر نہ کریں سب کمی پوری ہو جائے گی۔ میرا ڈنڈا اگلی پچھلی سب کسر نکال دے گا۔ اُدھر کلیم صاحب کو میرے فیصلے کا علم ہوا تو بہت خفا ہوئے۔ کہنے لگے تو بھی ہمیں دھوکہ دے گیا ہے۔ مگر اختر صاحب اور احمد خان صاحب نے انہیں جب ساری بات سمجھائی تو وہ چپ ہو رہے۔ استاد محترم

چوہدری احمد خان صاحب نے مجھ پر ہمیشہ لطف وکرم فرمایا۔ یہاں تک کہ انہوں نے مجھے ہر روز اپنے گھر بلا کر پچھلے اسباق پڑھانا شروع کر دیئے۔ اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں اس قابل ہو گیا کہ دسویں جماعت کے امتحان میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ میں نے اول درجے میں میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ اس طرح میری کامیابی کا سہرا اختر صاحب اور چوہدری احمد خان کے سر ہے، جنہوں نے مجھے اولاد کی طرح عزیز جانا اور میری ذہنی اور اخلاقی رہنمائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اللہ تعالے ان بزرگوں کو ہمیشہ زندہ وسلامت رکھے۔ ان کے حضور میں نذرانہ عقیدت ہی پیش کر سکتا ہوں۔

نویں جماعت کے اختتام تک تو میں بھائی مجید صاحب کے ہاں مقیم رہا۔ پھر بدقسمتی سے ان کا تبادلہ جہلم سے کسی دوسری جگہ ہو گیا۔ اب رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔ اُدھر مالی حالت ہوسٹل کے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ یہاں اختر صاحب کا کرم پھر شامل حال ہو گیا۔ ان کا ایک شاگرد، . . . . صدیق نامی تھا۔ بڑا شریر اور کھلنڈرا لڑکا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے سے ذرا کم ہی دلچسپی تھی۔ ویسے وہ اختر صاحب کا بڑا بھتیجا تھا۔ اختر صاحب چاہتے تھے، وہ کسی طور میٹرک کا امتحان ضرور پاس کرے۔ انہوں نے اس کی صورت یہ نکالی کہ مجھے اس کے گھر منتقل کر دیا تاکہ میں اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ صدیق کی بھی رہنمائی کر سکوں۔ صدیق کے گھر والوں کے لئے اختر صاحب کا فرمایا ہوا بڑا مستند تھا۔ انہوں

نے خوشی خوشی مجھے اپنے ہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ وہ لوگ بڑی شفقت سے پیش آتے اور میرے آرام کا پورا پورا خیال رکھتے۔ ایک چھوٹا سا کمرہ انہوں نے مجھے دے رکھا تھا۔ جہاں میں رات گئے تک اپنے کام میں مشغول رہتا۔ صدیق کا پڑھائی میں دل نہ لگتا تھا۔ میں اسے راغب کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا۔ مگر بے سود۔ اس کا دھیان "غیرِ نصابی" سرگرمیوں پر زیادہ مرکوز رہتا۔ اس کے دو چار اور ساتھی بھی اسی قماش کے تھے جو سرِ شام پڑھنے کے بہانے اپنے گھروں سے نکل کر اس کے پاس پہنچ جاتے اور یہاں آ کر گپوں میں جُت جاتے۔ میں دل ہی دل میں کڑھتا۔ مگر کھُل کر اپنی پریشانی کا اظہار بھی نہ کر سکتا۔ مجبوری تھی۔

صدیق اور اس کے ساتھیوں کا معمول تھا کہ رات گیارہ، بارہ بجے اپنے گھر سے نکل پڑتے اور پھر کچہری روڈ پر واقع باغات پر دھاوا بول دیتے۔ رات گئے، وہ "مالِ غنیمت" لے کر واپس لوٹتے۔ پھر لذتِ کام و دہن کا سلسلہ شروع ہو جاتا جو پَو پھٹنے تک جاری رہتا۔ ہمارے سامنے کبھی کیلوں کے ڈھیر لگ جاتے، کبھی سنگتروں کے مجھے بھی وہ "کارِ خیر" میں شریک کر لیتے اور میں بھی مقدور بھر اُن "تحائف" سے لطف اندوز ہوتا۔ شروع شروع میں تو مجھے ساتھ لے جانے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔ بس اشاروں، کنایوں میں فیلر (FEELER) چھوڑا کرتے۔ مگر ایک دن ان کا تقاضہ شدت پکڑ گیا۔ کہنے لگے۔ آج

تمہیں بھی ساتھ لے کر چلیں گے۔ تم باغ کے اندر نہ گھسنا۔ بس باہر کھڑے چوکیداری کرنا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے حامی بھر لی۔ پروگرام کے مطابق آدھی رات کے بعد ایک وکیل خواجہ رفیع صاحب کی کوٹھی پر دھاوا بولا گیا۔ مگر ہوا یوں کہ جب یہ آپریشن ختم ہونے کو تھا، تو کوٹھی کا چوکیدار وہاں آن دھمکا۔ اُس نے "حملہ آوروں" میں سے ایک لڑکے، نور آصف اختر کو دبوچ لیا۔ باقی ہم سب لڑکے اُلٹے پاؤں بھاگے۔ میری حالت تو بہت بُری تھی۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے تھے۔ نور آصف کی لاتوں، مکوں اور گھونسوں سے خوب مرمت کی گئی۔ اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ اُس نے ڈر کے مارے باقی ساتھیوں کے نام بھی بتا دیئے۔ میرا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ صبح اختر صاحب کو اس واقعہ کا علم ہوا تو مجھ پر بہت برسے۔ میں نے انہیں سارے پس منظر سے آگاہ گیا۔ مگر ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑ رہا تھا۔ کہنے لگے۔ "نالائق" تو بھی ان غنڈوں کے ساتھ مل کر ایسی حرکتیں کرنے لگا ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں مارے خوف کے کانپنے لگا۔ اور بڑی منت سماجت کے بعد انہیں منوانے میں کامیاب ہو سکا۔ اس کے بعد میں نے اکڑوں بیٹھ کر توبہ کی کہ اس طرح کی حرکت پھر کبھی نہیں کروں گا۔ رہی صدیق اینڈ کمپنی کی بات،

تو انہوں نے چند دنوں کے وقفے کے بعد پھر یہ دھندا شروع کر دیا ہے

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔

قارئین! ہم ۱۹۴۵-۴۶ء کی بات کر رہے ہیں جو حد درجہ پُر آشوب اور ہنگامہ خیز دَور تھا۔ غلامی کی طویل رات رخصت ہونے والی تھی اور آزادی کی صبح نمودار ہونے والی تھی۔ صبح شام فضا میں” لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان، پاکستان کا مطلب کیا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے فلک شگاف نعرے بلند ہوا کرتے تھے۔ جلوس نکلتا، تو یوں محسوس ہوتا جیسے حدِّ نگاہ تک انسانوں کا سمندر ہے جو اُمڈے چلا آ رہا ہے۔ جلسے کا اعلان ہوتا تو جائے مقررہ پر گھنٹوں پہلے ہی مجاہدینِ آزادی کا ہجوم جمع ہو جاتا۔ اور پھر شعلہ بار تقریریں سامعین کی روحوں کو گرما دیتیں۔ یہ تقریریں مُسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کی جاتی تھیں۔

اختر صاحب کا مسلک، مسلم لیگ کے اندازِ فکر سے بالکل جُدا تھا۔ وہ علامہ مشرقی کے مقلّد تھے۔ میں سیاست کی ابجد سے بھی نابلد تھا۔ جلسے، جلوس دیکھ کر جاتا تو اختر صاحب سے ان کا تذکرہ کرتا اور وہ اپنے مخصوص انداز میں حالات کا تجزیہ کرتے۔ مجھے اختر صاحب کی وساطت سے ہی سیاست سمجھنے کا

موقع ملا۔ انہوں نے بڑے بلیغ انداز میں مجھے مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی پس منظر سے روشناس کرایا۔ انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ہندوؤں کی باریک چالوں کا علم بھی مجھے ان کے طفیل ہی حاصل ہوا۔ حق بات تو یہ ہے کہ نویں، دسویں جماعت کے طالب علم کے لئے سیاسی مسائل سے آگاہ ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے مگر اختر صاحب نے اس مشکل کو آسان کر دیا۔

میرا سیاسی شعور ذرا پختہ ہوا تو پتہ چلا کہ حضرت قائدِاعظمؒ اور علامہ مشرقی کی منزل ایک ہی ہے مگر راہیں مختلف ہیں۔ دونوں مسلمانوں کے مونس غم خوار اور بہی خواہ ہیں۔ دونوں انگریزی استعمار کے خلاف سربکف ہیں قائداعظمؒ قوم کی منتشر صفوں کی شیرازہ بندی کر رہے تھے اور اسے آئینی انداز میں آگے بڑھا رہے تھے۔ وہ بیک وقت انگریز اور ہندو کے خلاف آئینی جنگ لڑ رہے تھے۔ اُدھر علامہ مشرقی کا طریق کار یکسر مختلف تھا۔ علامہ کے انداز میں جارحیّت کا عنصر غالب تھا۔ انہوں نے دراصل عسکری مزاج پایا تھا۔ وہ ہیبت و جبروت کے بل بوتے پر انگریز کو یہاں سے دھکیل پھینکنا چاہتے تھے۔ قائداعظمؒ کا آئینی انداز انہیں پسند نہ تھا۔ ان کے خیال میں آزادی کانفرنس ٹیبل پر بیٹھ کر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ آزادی کی دیوی، خون کا تقاضا کرتی ہے۔ قائداعظمؒ سے انہیں گلہ تھا کہ ان کے اردگرد سکہ بند قسم

کے نوابوں، سرداروں، خان بہادروں اور انعام یافتوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے۔ علامہ مرحوم اس "مخلوق" کے مزاج کو خوب پہچانتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ یہ لوگ اپنے مشن میں مخلص نہیں ہیں اور وہ مُسلم لیگ میں محض اس بنا پر شامل ہوئے ہیں کہ انہوں نے نوشتۂ دیوار پڑھ لیا ہے تفنن برطرف! ان الوقتوں کی چھٹی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ ہوا کے رُخ کو پہچاننا اور اس کے مطابق اپنے قبلہ کی سمت بدلنا ان کا دیرینہ مشغلہ ہے۔ قائداعظمؒ بے حد زیرک اور معاملہ فہم سیاست دان تھے۔ وہ بھی اپنے ساتھیوں کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ مگر حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ اس وقت زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہم خیال بنایا جائے۔ علامہ مشرقی تاریخ کے اس نازک موڑ پر صحیح فیصلہ نہ کر سکے۔ ان کا خلوص برحق، ان کی ملّی خدمات بجا، مگر قائداعظمؒ کی مخالفت مول لے کر انہوں نے مسلمانوں کی کوئی خدمت سرانجام نہ دی۔ ان کی اس روش کا فائدہ اُلٹا کانگرس کو پہنچا جو دنیا کو باور کرانے لگی کہ پاکستان کا مطالبہ تو محض مذہبی جنون (RELIGIOUS FANTATICISM) کی بنا پر کیا جا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اختر صاحب کی وساطت سے علامہ مشرقی کو بڑے قریب سے دیکھا اور اُن کی باتیں سُنیں۔ ان کے ایک جانباز سپاہی ڈاکٹر نذر محمد کی محفلوں میں بھی شامل ہونے کے لئے مجھے

کئی مواقع میسّر آئے۔ بیلچہ اُٹھاکر چلنے اور چپ راست، چپ راست کی مشق کرنے کا عمل بھی میں نے کچھ دیر جاری رکھا۔ مگر جُوں جُوں خاکسار تحریک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، طبیعت اسی نسبت اس سے بیزار ہوتی چلی گئی۔ علامہ صاحب کا جارحانہ اندازِ سیاست مجھ جیسے دھیمے مزاج والے شخص کو راس نہ آسکا۔ میر کے سرہانے آہستہ بولنے والے انسان کو خاکسار تحریک کی گھن گرج بھلا کیسے پسند آسکتی تھی۔ دوسری بات: علامہ صاحب جس بے رحمی سے "مولوی کے غلط مذہب" کا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے، وہ انداز بھی مجھے متاثر نہ کر سکا۔ مولوی ہزار غلط سہی، مگر میرا ایمان ہے کہ اسلام، جس شکل میں آج موجود ہے، یہ "مولوی" کے دم قدم سے ہی ہے۔ مولوی نہ ہوتا تو سات سمندر پار سے آیا ہوا سفید آقا، یہاں کے بکینوں کے قومی تشخّص کو ہی مٹا ڈالتا۔

علامہ مشرقی "مولوی" کو جمود اور تعطّل کی علامت قرار دیتے تھے۔ اور اسے مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ میں علمائے کرام کی یوں کھلے بندوں تضحیک برداشت نہ کرسکا اور علامہ مرحوم کے مسلک سے دور ہٹتا چلا گیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا، جب میں نے خاکسار تحریک سے اپنی بیزاری کا اظہار آخر جب صاف سے بھی کہہ دیا۔ انہوں نے بڑی بردباری سے میری بات سنی۔ مسکرائے اور کہنے لگے لگتا ہے لیگیوں کا جادو تم پر بھی

چل گیا ہے۔ پھر بڑی دیر تک مجھے علامہ صاحب کی صفات گنواتے رہے۔ پاس پڑے بیلچے کو اٹھایا۔ میں سہم گیا۔ اور ڈر رہا تھا کہ یہ بیلچہ انگریز کا سر پھوڑنے سے تو رہا، مجھے ضرور ڈھیر کر دے گا۔ مگر نہیں، ایسا نہیں ہوا اختر صاحب نے اس بیلچے کی صفات گنوانا شروع کر دیں۔ بیلچہ کھانا پکانے کا کام دیتا ہے، پانی پینے کا پیالہ ہے، سرہانے کا کام بھی اس سے لیا جا سکتا ہے۔ جارحانہ ہتھیار بھی ہے اور دفاعی ڈھال بھی۔ بوڑھوں کا عصا ہے اور جوانوں کی آبرو ...... وغیرہ

علامہ صاحب کی تحریک سے تو میری اجنبیت بڑھتی چلی گئی۔ مگر افسوس، مسلم لیگ سے بھی مجھے کبھی جذباتی لگاؤ پیدا نہ ہو سکا۔ مسلم لیگ کا نعرہ ” پاکستان کا مطلب کیا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ میرے دل کے معصوم تاروں کو چھیڑ کر مجھے ولولہ ضرور عطا کرتا اور میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا اُبھرتی: میرے پروردگار، اس سرزمین کو انگریز کے ناپاک چنگل سے نجات دلا اور اپنے حبیبِ پاکؐ کے صدقے ہمیں آزادی کی نعمت سے مالا مال فرما۔ میں ہر نماز کے بعد پاکستان کے قیام کی دعا کرتا۔ مگر یہ اندیشہ میرے ذہن میں ضرور کھٹکتا تھا کہ مسلم لیگ کے لیڈروں کی اکثریت اپنے مشن میں مخلص نہیں اور یہ لوگ جو اسلام کے نام پر پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں، آزادی مل جانے کے بعد ذاتی فائدوں اور مالی

منفعتوں کو زیادہ عزیز رکھیں گے۔ اس طرح اسلامی انقلاب کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ انہی خدشات کی بنا پر میں اپنے آپ کو مُسلم لیگ کے سیلِ رواں سے کبھی ہم آہنگ نہ کر سکا۔ میرے ہندو اور سکھ ساتھی کانگرسی تھے میرے دو مسلمان دوست انوار الحق اور ملک عبدالوحید علی الترتیب احراری اور مسلم لیگی تھے۔ ہم جب مل بیٹھتے تو سیاسی مسائل کو بھی اچھی طرح "پھینٹی" دیا کرتے۔ میرا مسلک سب سے جُدا تھا۔ نہ میں کانگرسی تھا، نہ مسلم لیگی۔ درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی۔ مجھے ایک ہی بات سے سروکار تھا اور وہ یہ کہ انگریز بہادر کو یہاں سے چلتا کیا جائے۔ اس ظالم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ رہا مسلم لیگ، کانگرس، خاکسار تحریک یا احرار پارٹی کا طریقِ کار، تو یہ مجھے کبھی اپنی حکمتِ عملی سے قائل نہ کر سکا۔ مسلم لیگ کے اکثر و بیشتر زعماء کے قریب سے بھی اسلام نہیں گزرا تھا۔ پھر وہ بھلا اسلامی انقلاب کیونکر لائیں گے۔ کانگرس کا مخصوص ہندوانہ مزاج تو میں بہت پہلے سمجھ گیا تھا۔ بغل میں چھُری، منہ پر رام رام۔ حلق سے اوپر حد درجہ شیریں گفتار، مگر سیاہ باطنی میں بھی یکتائے روزگار۔

وقت گزرتا گیا۔ میرے شعور میں دھیرے دھیرے پختگی آتی گئی۔ اُدھر آزادی کی" جوئے کم آب" اُبھر کر" بحرِ بیکراں"

کا روپ دھارنے لگی۔ ہندوستان میں دو طاقتوں کا چرچا تھا۔ کانگرس اور مسلم لیگ۔ قائدِ اعظمؒ کروڑوں مسلمانوں کے دل کی دھڑکن بن چکے تھے۔ وہ ایسے بے تاج بادشاہ تھے، جن کے چشم و ابرو کے ہلکے سے اشارے پر لاکھوں فرزندانِ توحید اپنی جانیں نچھاور کرنے پر تیار تھے۔

اخترؔ صاحب میرے خیالات میں نمایاں تبدیلی محسوس کر چکے تھے۔ مگر اُن کے پیار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ ورنہ ہم میں کتنے ہیں جو اپنے مخالف کی بات سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہم لوگ تو اس درجہ تنگ نظر واقع ہوئے ہیں کہ کسی نے ادھر ہمارے مزاج کیخلاف بات کی، اُدھر ہم نے اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالنے کی دھمکی دے دی۔ اخترؔ صاحب کا معاملہ ہمارے مخصوص قومی مزاج سے یکسر مختلف تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اپریل ۱۹۴۶ء میں، میں میٹرک کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد جب الوداعی ملاقات کیلئے ان کے گھر پہنچا تو اُنھوں نے مجھے بھرپور دُعاؤں سے نوازا۔ اور کالج کی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ اخترؔ صاحب کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اُدھر میرا دل تھا جو ڈوبا جا رہا تھا۔ آخر دھڑکتے دل، ڈوبتی نبضوں اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ میں نے اخترؔ صاحب اور دوسرے ساتھیوں کو خدا حافظ کہا۔

باب — ۷

کالج کے ابتدائی ایام

آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ میٹرک پاس کرنے کا مرحلہ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں سر ہو گیا تھا۔ اب مزید تعلیم جاری رکھنے، نہ رکھنے کا فیصلہ کرنا باقی تھا۔ میری تعلیمی استعداد اور مخصوص افتادِ طبع کا تقاضا تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ اُدھر مالی مشکلات کا ہمالیہ پہاڑ بیچ میں حائل تھا۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ آبا جی اٹھارہ روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے اسکول ماسٹر تھے۔ جس سال میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اُن کا یہ سہارا بھی اُن سے چھن گیا۔ یعنی وہ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ انہوں نے ملازمت کا تمام عرصہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں گزارا تھا۔ لہٰذا پنشن، گریجویٹی ملنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ والد صاحب نے میرے داخلے کے سلسلے میں اپنے کرم فرماؤں

سے مشورہ کیا۔ چاروں طرف سے یہ صدا بلند ہوئی کہ پاکستان بننے والا ہے۔ انگریزی پڑھانے کی کیا ضرورت ہے؟ راجہ غلام علی خان مرحوم ہمارے علاقے کی بڑی معروف شخصیت تھے۔ آباجان کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ انہوں نے از راہ ہمدردی مجھے پٹواری یا اسکول ماسٹر بنوانے کی پیشکش بھی کی۔ مگر والد صاحب نہ مانے۔ وہ اپنے مختصر سے جسم میں فولادی عزم رکھتے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ لڑکے کو کالج کی تعلیم ضرور دلائیں گے۔ نتائج کی پروا کئے بغیر!!

ہمارے خاندان میں سے کسی نے اس سے قبل کالج کا رُخ نہیں کیا تھا۔ اور ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں کا ماحول کیسا ہوتا ہے۔ اور اس ماحول کے تقاضے کیونکر پورے کئے جا سکتے ہیں۔ بس اتنا سُن رکھا تھا کہ کالج کی تعلیم پر خرچ بہت اُٹھتا ہے اور لڑکے اکثر اوقات راہِ راست سے بھٹک جاتے ہیں۔

میں نے آباجی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ مجھے کالج میں داخلہ دلوانے کا اِرادہ ترک کر دیں۔ اس کی بجائے وہ مجھے کہیں اسکول ماسٹر تعینات کرا دیں۔ میں کام بھی کروں گا اور فارغ اوقات میں اپنا مطالعہ بھی جاری رکھ سکوں گا۔ مگر والد صاحب نہ مانے۔ فرمانے لگے (ان کے یہ الفاظ ۳۳ سال گزر جانے کے بعد آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں) "بیٹا" پہلے جی پی فنڈ والے نو سو روپے تمہاری تعلیم پر خرچ کروں گا۔ جب یہ رقم ختم ہو جائے گی

تو پھر اپنا مکان رہن رکھ کر تمہاری تعلیم مکمل کراؤں گا۔ مکان تو پھر بن جائے گا۔ تمہاری تعلیم ادھوری رہ گئی تو عمر بھر اس کا ازالہ نہ ہو سکے گا۔

چنانچہ فیصلہ ہوا کہ ہمیں کالج میں ضرور داخلہ دلوایا جائے گا۔ رختِ سفر باندھنے سے پہلے ہم نے رہائش کے بارے میں سوچ بچار شروع کیا۔ ہوسٹل کے اخراجات کے ہم لوگ متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ناچار ایک ہی صورت باقی تھی۔ اور وہ یہ کہ کسی جاننے والے کے ہاں میری رہائش کا انتظام کر دیا جائے۔ والد صاحب جائزہ مشن پر پنڈی تشریف لائے۔ میں بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ ہم دونوں باپ بیٹا سب سے پہلے سن رائز بیکری کے مالک راجہ عبدالعزیز کے ہاں پہنچے۔ موصوف ہمارے علاقے کے رہنے والے تھے۔ آبا جی نے اپنا مُدّعا بیان کیا اور اپنی مجبوریاں واضح کیں۔ راجہ صاحب نے جواب میں انگریزی زبان کی خرابیاں اور کالج کی تعلیم کے نقصانات گنوانا شروع کر دیئے اور ہمیں تلقین کی کہ ہم اعلیٰ تعلیم کا خیال دل سے نکال دیں۔ اُدھر والد صاحب یہ مشورہ سننے کے لئے تیار نہ تھے۔ ہم وہاں سے مایوس لوٹے اور پھر محلہ قاسم آباد (احاطہ جنڈامیاں) پہنچے جہاں والد صاحب کی منہ بولی بہن (پھوپھی جھتی) بمعہ اپنے اہل و عیال رہائش پذیر تھیں۔ موصوفہ کا ذکر تو آپ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں، وہی اپنی افیون خوری کے سلسلے میں۔

پھوپھی جھتی نے بچپن میں مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا اور

میرے ساتھ وہ بہت پیار کرتی تھیں۔ والد صاحب کی بات سن کر ان پر گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم سمجھے ادھر سے بھی کورا جواب ملنے والا ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے۔ انہوں نے تھوڑے سے تامّل کے بعد مجھے اپنے ہاں بطور PAYING GUEST ٹھہرانے کی حامی بھر لی۔ اس طرح رہائش کا مسئلہ وقتی طور پر حل ہو گیا۔ داخلہ کے سلسلے میں ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہم گاؤں واپس لوٹ آئے۔ امی جان نے اب میرا سامان تیار کرنا شروع کر دیا۔ سامان تھا ہی کیا، کمبل میں لپٹا ہوا ایک بستر اور لوہے کا ایک ٹرنک، بستر بند اور اٹیچی کیس کے وجود سے ہم لوگ ہنوز ناواقف تھے۔ داخلہ سے ایک دن قبل ہم پھوپھی صاحبہ کے ہاں لنگر انداز ہو گئے۔ اگلی صبح ہمیں کالج جانا تھا۔ چلیئے اب پھوپھی چھتی سے اجازت طلب کر کے گارڈن کالج چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

ہم دونوں باپ بیٹا کالج میں قدم رکھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک ہجوم گول دائرے کی شکل میں کالج لان میں جمع ہے اور بیچ میں ایک صاحب کھڑے اپنی "تقریر دلپذیر" سے سامعین کو نواز رہے ہیں۔ ہم بھی اس ہجوم میں شامل ہو جاتے ہیں جی ہاں۔ مقرر صاحب بڑے پُر جوش انداز میں انگریزی زبان کی خرابیاں گنوا رہے ہیں اور داخلہ لینے کے خواہش مند طلبا کو نصیحت فرما رہے ہیں کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں۔ والد صاحب برہمی کے عالم میں محفل سے

باہر نکل آتے ہیں۔ اُدھر ایک خوش پوش بانکا سجیلا نوجوان ہمارے قریب آکر رُکتا ہے اور آباجی کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ پھر اُن سے اُن کی پریشانی کا سبب پوچھتا ہے۔ والد صاحب کے دل کا ساز پہلے سے ہی تشنۂ مضراب تھا۔ وہ اپنی ساری کہانی پوری تفصیل کے ساتھ سنانے لگتے ہیں۔ نوجوان انہیں تسلی دیتا ہے اور اپنے ہمراہ چلنے کو کہتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ دو چار اور "والدین" بھی اپنے برخورداروں کے ساتھ ہمارے قافلے میں آن شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح نوجوان ڈی اے وی کالج میں جا کر رکتا ہے۔ اور ہمیں کالج کی SELECTION COMMITTEE کے حوالے کر دیتا ہے۔ جہاں ہمیں بلا پس و پیش داخلہ مل جاتا ہے۔ مجھے آٹھ روپیہ ماہوار وظیفہ کی نوید بھی سنائی جاتی ہے کہ میرے میٹرک کے مارکس سلیکشن کمیٹی کو پسند آگئے تھے۔

نوجوان رخصت ہوتے وقت اپنا نام، پتہ بتاتا ہے۔ رام سروپ، طالبِ علم ایم اے انگلش گارڈن کالج۔ ہم لوگ نوجوان کے "حسنِ سلوک" سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ مگر بعد میں یہ راز کھُلتا ہے کہ نوجوان کا تو مشن ہی یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کو پھانس کر ڈی، اے، وی کالج میں جھونک دیا جائے تاکہ انکے ذہنوں کو اس طور متاثر کیا جائے کہ وہ تحریکِ پاکستان میں کوئی فعال کردار ادا نہ کر سکیں۔

کالج میں پہلے دن ہم چار پانچ مسلمان لڑکوں نے داخلہ لیا۔

مسلمان لڑکوں کا تناسب اس کالج میں آٹے میں نمک کے برابر تھا۔ لہٰذا ہم مسلمان ساتھی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ان میں سے چند ایک کے ساتھ دوستی ایسی پکّی ہو گئی جو آج تک قائم ہے۔ امجد ملک (حال مقیم لندن)، عالی رضوی (ایڈیٹر روزنامہ مشرق) راجہ انور (سابق اٹارنی جنرل) کے ساتھ ہماری دوستی اسی دور کی یاد تازہ کرتی ہے۔

آیئے لوٹ کر ہم محلہ قاسم آباد چلتے ہیں جہاں ہماری پھوپھی صاحبہ نے اپنے کوارٹر نما مکان کے ایک کونے میں ہمارے لئے ایک عدد چارپائی کا اہتمام کر دیا تھا۔ مجھے وہاں قیام کے دوران کئی ناخوشگوار مرحلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ تاہم میں پھوپھی جان کے اِحسان کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکتا۔ اللہ تعالےٰ انہیں بلند درجات سے نوازے۔ وہ اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہیں۔

پھوپھی صاحبہ نے ایک بھینس پال رکھی تھی جس کی دیکھ بھال وہ خود کیا کرتی تھیں۔ دودھ سے ملنے والی رقم وہ علیحدہ جمع کر دیتیں۔ بیٹے بہو کے ساتھ ان کے مراسم چنداں خوشگوار نہ تھے۔ گھر کی فضا بڑی مکدّر رہتی۔ ہر وقت تُو تُکار، ہر وقت جھک جھک میں خاموش تماشائی بنا سارے حالات کا جائزہ لیتا اور حتی الامکان فضا کو خوشگوار بنانے کی کوشش بھی کرتا۔ مگر کون سنتا ہے فغانِ درویش!!

پھوپھی صاحبہ بڑی سخت گیر خاتون تھیں۔ غلط بات ہرگز برداشت نہ کرتیں۔ مگر خدا کا شکر ہے میرے ساتھ ان کا سلوک مشفقانہ رہا۔ میں نے دراصل انہیں کبھی شکایت کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ میں رضاکارانہ طور پر بھینس کی دیکھ بھال میں ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ میں کھل، بنولے اور بھوسے کے آمیزے (ونڈے) کو اپنے ہاتھوں سے تیار کرتا اور پھر اسے بھینس کے آگے ڈال دیتا۔ میری اس ادا پر وہ بہت خوش تھیں۔ اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہتیں۔ ارے نکھٹو دیکھ۔ یہ بچہ میری کتنی خدمت کرتا ہے۔ بھینس کی خدمت کے ساتھ میرے آرام کا خیال بھی رکھتا ہے۔

اجازت ہو تو آخری جملے کی ذرا وضاحت کر دوں۔ پھوپھی صاحبہ سخت محنت کی عادی تھیں۔ وہ صبح سویرے نماز، تلاوت سے فارغ ہو کر اپنے گھر کے کام کاج اور بھینس کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جایا کرتیں۔ اور یہ عمل رات گئے تک جاری رہتا۔ وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکی تھیں جہاں ان کی صحت اتنی جسمانی مشقت کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ مگر وہ گرتے پڑتے یہ ذمہ داریاں نبھائے چلی جا رہی تھیں۔ میں سونے سے پہلے ان کی مٹھی چاپی کرتا۔ کبھی ان کا سر دباتا، کبھی پاؤں۔ میں اُن سے اجازت لیتا تو وہ ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت

کرتیں۔ گھر کے دوسرے کام کاج میں بھی میں ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتا۔ مرچ، مسالہ پیسنے کا کام تو میں نے ازخود اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ نیشنل مسالہ جات اور مہران مسالہ جات تو دورِ جدید کی پیداوار ہیں۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں "لنگری" "ڈنڈے" کے ساتھ دھر رگڑا کا عمل بڑا مقبول تھا۔ اور اس فن میں ہمیں کمال حاصل ہو گیا تھا۔

پھوپھی صاحبہ کی دیانت داری ضرب المثل تھی۔ وہ دودھ کے نزدیک پانی کی ایک بوند تک نہیں جانے دیتی تھیں۔ لہٰذا ان کے ہاں سے ملنے والے خالص دودھ کی پورے محلے میں دھوم تھی۔ دودھ کا بھاؤ چار آنے فی سیر تھا۔ ایک آنہ دے کر ایک پاؤ دودھ میں بھی اُن سے خرید لیتا۔ کبھی وہ زیادہ خوش ہوتیں تو چھٹانک، آدھ چھٹانک دودھ "جھونگے" میں دے دیا کرتیں۔

لین دین کے معاملے میں وہ کسی سے کوئی رعایت نہ برتتیں۔ اپنی بیٹی کے ہاں بھی دودھ قیمت وصول کر کے بھجواتیں۔ "بخشیش" کا لفظ ان کی لغت میں موجود نہ تھا۔ در اصل وہ دودھ سے حاصل کی ہوئی رقم فریضۂ حج ادا کرنے کی غرض سے پس انداز کر رہی تھیں۔ اور اللہ نے انہیں اس سعادت سے نواز بھی دیا۔ قطرہ، قطرہ جمع کی ہوئی رقم کام آ گئی۔

کچھ عرصہ تو میں نے پھوپھی جان کے زیرِ سایہ گزارا۔ پھر مجھے

یوں محسوس ہوا جیسے میری صحت تیزی سے گرتی جا رہی ہو۔ محترمہ کی کرم فرمائیاں تسلیم، نگران کے گھر کا بجھا بجھا سا ماحول مجھے راس نہیں آ رہا تھا۔ میری پڑھائی بھی متاثر ہو رہی تھی شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب گھر میں ماں بیٹے یا ساس، بہو کے درمیان بدمزگی پیدا نہ ہوئی ہو۔

اُدھر ابا جی گاؤں میں فارغ بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوری کوشش کی تھی کہ ملازمت میں ایک سال کی توسیع مل جائے۔ مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا۔ افسرانِ بالا راضی نہ ہوئے۔ ہمارا "خزانہ" دھیرے دھیرے خالی ہو رہا تھا۔ والد صاحب نے سوچا وہ پنڈی چلے آئیں۔ اور لکھنے پڑھنے کا کوئی کام تلاش کریں۔ پھوپھی جھتی کے فرزند چوہدری محمد زمان نے اس موقع پر دستِ تعاون بڑھایا اور ابّو کو اپنے ایک دوست بابو ریحان کے ہاں ملازم رکھا دیا جو اس زمانے میں آڑھت کا کاروبار کرتے تھے اور لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ ریحان صاحب بڑے نیک منش انسان تھے۔ آبا جی کی بہت عزت کرتے اور ان کے کام سے بڑے مطمئن تھے۔ وہ انہیں ہر روز کام کے عوض تین روپے دے دیا کرتے تھے جس سے ہمارا گذارہ چل جاتا۔ یہ بات میں بتانا بھول گیا کہ جب والد صاحب پنڈی میں مقیم ہوئے تو ہم نے ایک بیٹھک چار روپے ماہوار کرایہ پر لے لی تھی۔ یہ بیٹھک پھوپھی صاحبہ کے داماد استاد عبدالحسن کی ملکیت تھی۔

باپ، بیٹے کی خدمت کرتے عزیزہ ہمشیرہ سکینہ (اللہ بخشے) ہمارے ہمراہ آگئی تھی۔ گاؤں میں امی جان اور برادرِ خورد ضیاء مقیم تھے۔ ضیاء ان دنوں اسکول میں تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ تو پیارے قارئین! یہ تھی ابتدا ہمارے کالج کی تعلیم کی۔ دو تین روپے روزانہ آمدنی میں ہماری گذر بسر بہت مشکل سے ہوا کرتی۔ فاقوں کی نوبت سے تو اللہ پاک نے ہمیشہ محفوظ رکھا کہ آٹا، دال گھر سے میسّر ہو جاتا تھا۔ مگر اس کے علاوہ پھل، دودھ کا استعمال ہماری دسترس سے باہر تھا۔ ہمارے گھر پاؤ بھر دودھ آتا جس سے بمشکل صبح کی چائے بنتی۔ شام کے وقت چائے پینے کو جی بہت چاہتا مگر افسوس! اخراجات اس "عیاشی" کے متحمّل نہیں ہو سکتے تھے۔

میرے بچپن کا ساتھی اور دوست شہزادہ سلطان خالد حیدر بھی اُن دنوں پنڈی ہی میں مقیم تھا۔ اس نے شروع میں لاہور کے غالباً ایف سی کالج میں داخلہ لیا تھا۔ مگر اُسے وہاں کی فضا راس نہ آئی تھی۔ اب اس نے اپنا مائیگریشن (MIGRATION) گارڈن کالج میں کرا لیا تھا۔ میں وقت ملنے پر خالد سے ملنے اس کے گھر واقع لیاقت روڈ چلا جایا کرتا۔ میری قیام گاہ سے یہ فاصلہ کوئی دو میل ہوگا۔ مگر میں یہ مسافت خوشی خوشی طے کر لیتا۔ خالد کی امی میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھیں۔ انہوں نے ایک دن فرمائش کی۔ بیٹا تم جس محلے میں رہتے ہو وہاں دودھ تو اچھا ملتا ہوگا۔ ہو سکے تو ہر روز ہمارے لئے ایک سیر دودھ

لے آیا کرو۔ میں نے حامی بھر لی۔ اور پھر تعمیلِ ارشاد میں نے یہ فریضہ کوئی سال بھر سرانجام دیا۔ میری اس نیازمندی پر خالد کے والدین بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے آگے چل کر مجھے سی او ڈی میں عارضی ملازمت دلانے میں بڑی مدد کی۔ اس قصّے کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

جھلمل جھلمل کرتی ہوئی روشنیوں کے شہر راولپنڈی میں ہمارا کمرہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مالک مکان بجلی مہیا کرنے پر راضی نہ تھے۔ ناچار لالٹین کی روشنی پر ہمیں اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ میں اس مدھم روشنی میں رات گئے تک اپنی پڑھائی میں مصروف رہتا۔ والد صاحب بڑے عبادت گزار تھے۔ رات کا بیشتر حصّہ جائے نماز پر گزارتے۔ وقفے وقفے کے بعد وہ مجھے سو جانے کی ہدایت کرتے جسے میں ہوں ہاں میں ٹال دیتا۔ در اصل مجھے پڑھنے میں بڑا لطف آتا۔ اور رات کی خاموشی میں یہ لطف دوبالا ہو جاتا۔

پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب لالٹین کی روشنی بھی مجھ سے چھنتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ ہوا یوں کہ بدقسمتی سے بابو ریحان صاحب کے کاروبار میں خسارہ پڑ گیا۔ اور انہوں نے اپنی مجبوری کے تحت والد صاحب کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ اب نئی ملازمت کی تلاش شروع ہوئی۔ مگر اس میں کوئی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ یہ زمانہ ہماری بدحالی کا بدترین زمانہ تھا۔ اُن دنوں کی تلخ یاد اک زخم بن گئی ہے جو بھلائی نہیں جا سکتی۔

والد صاحب بڑے باہمت بزرگ تھے۔ انہوں نے اس آزمائش کی گھڑی میں اپنے اعصاب کو برقرار رکھا۔ اور اب انہوں نے راجہ بازار میں ایک بجلی والے کی دکان کے سامنے ایک چٹائی پر بیٹھ کر خطوط نویسی کا کام شروع دیا۔ قلم دوات، کاغذ لئے وہ اس انتظار میں بیٹھے رہتے کہ کوئی ناخواندہ آدمی ادھر آ نکلے اور اپنے کسی عزیز کے نام خط پتر لکھوانے کی فرمائش کرے۔ یہ محض ہوائی روزی تھی۔ حد درجہ غیر یقینی۔ خط لکھنے کا معاوضہ کسی گاہک سے انہیں آنہ وصول ہوتا کسی سے دو آنے۔ اللہ تعالےٰ نے اپنی مخلوق کے رزق کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ ہر روز روپیہ، دو روپے کی مزدوری کا اہتمام کر دیتا۔ والد صاحب تھکے ہارے شام کے وقت گھر لوٹتے تو ان کو دیکھ کر بہت افسوس ہوتا۔ جس دن وہ تین چار روپے کما کر لاتے بہت خوش دکھائی دیتے۔ آتی بار وہ سبزی منڈی سے دو چار آنے کی سبزی خرید لاتے۔ جسے ہم دم پخت کر کے اپنے استعمال میں لاتے۔ کالج کا پہلا سال انہیں آزمائشوں کی بھینٹ چڑھا۔ اور یوں وقت سرکتا گیا، حتیٰ کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے سلسلہ میں کالج تین ماہ کے لئے بند ہو گیا۔ والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ ان چھٹیوں میں ہمیں گاؤں لوٹ جانا چاہیئے۔ وہاں اور نہیں تو خالص دال، روٹی تو ملے گی۔ شہر کی "لذتوں" سے تو ہم کافی لطف اندوز ہو چکے تھے۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران میں نے محدود پیمانے پر "تجارت"

شروع کر دی۔ میں پنڈی یا جہلم کا ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگایا کرتا اور وہاں سے سبزی یا پھل کی دو چار پیٹیاں خرید کر اپنے گاؤں لے آتا۔ اور پھر انہیں اپنے گھر کے سامنے چارپائی رکھ کر فروخت کرتا۔ اس طرح مجھے ایک پھیرے میں دو چار روپے بچ جایا کرتے۔ میں یہ رقم والد صاحب کے حوالے کر دیتا۔ جسے وہ اس "گھتی" میں ڈال دیتے جو انہوں نے میرے کالج کے اخراجات کے سلسلہ میں علیحدہ تیار کر رکھی تھی۔

اور اب آیئے، موضوع بدل کر ذرا سیاسی صورت حال کا جائزہ لیں۔ ۱۹۴۶-۴۷ء کا زمانہ بڑا پُر آشوب تھا۔ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے مسلمان جمع ہو رہے تھے۔ قائداعظمؒ کی سحر کار راہنمائی برصغیر کے مسلمانوں کو آزادی کی نوید سنا رہی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اب پاکستان کا مطالبہ تسلیم کئے بغیر ہندوؤں اور انگریزوں کے پاس اور کوئی چارہ کار باقی نہیں۔ ڈی اے وی کالج میں ہندو طلباء کی غالب اکثریت تھی۔ ہم مسلمان طالب علم تو بس گنے چنے تھے۔ ہم لوگ مصلحتاً سیاست کی بات کالج کی چار دیواری کے اندر نہیں چھیڑتے تھے۔ مگر کالج سے فارغ ہوتے ہی اس ہجوم میں گم ہو جایا کرتے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "حق ہمارا پاکستان" کے فلک شگاف نعرے بلند کرتا اور منزل کیطرف رواں دواں دکھائی دیتا۔ مجھے اور عالی کو عوام کے رجحانات معلوم کرنیکا بڑا شوق تھا۔ ہم دونوں سائیکل پر سوار ہفتہ میں ایک دو بار جائزہ مہم پر نکل جاتے

اور اپنے مشاہدے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام کو زیادہ دیر روک نہیں سکتی۔ مسلم لیگ کی طاقت کو ایک امڈے، بپھرے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی تھی جس کی تند و تیز موجیں مخالف قوتوں کو خس و خاشاک کی مانند بہانے اور انہیں فنا کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دینے کی پوری توانائی رکھتی یونینسٹ کانگریس، مجلس احرار، جمعیت العلماء اسلام، یونینسٹ پارٹی اور انگریز کے انعام خور پورا زور لگا رہے تھے کہ پاکستان وجود میں نہ آ سکے۔ کانگریس، مٹھی بھر مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو سکی تھی۔ البتہ سوادِ اعظم کی ہمدردیاں مسلم لیگ سے وابستہ تھیں۔ ادھر یونینسٹ پارٹی اپنا حق نمک ادا کرنے کی خاطر انگریز آقا کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی مانند ناچ رہی تھی۔ یہ کوتاہ بین لوگ تاریخ کا دھارا موڑنے کی سوچ رہے تھے۔ انہیں کون سمجھاتا کہ حضورِ والا! تاریخ کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں اور آپ جیسی "انعام خور مخلوق" کی سمجھ سے بالاتر! یونینسٹوں کا ذکر چل نکلا ہے تو آئیے آپ کو دو "اچھوتی" ہستیوں سے ملواؤں۔ ہمارے علاقے سے مسلم لیگی امیدوار کے مقابلے میں دو یونینسٹ پارٹی کے امیدوار سامنے آئے۔ ان میں سے ایک "خان بہادر" قسم کی شے تھے (نام بھول رہا ہوں) دوسرے ڈاکٹر محمد عالم عرف لوٹا کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ حکومت کی پوری مشینری ان "دو خادمانِ قوم" کی پشت پناہی پر مامور تھی۔ "خان بہادر" اپنے لوٹا صاحب کے مقابلے میں زیادہ سرگرمی

دکھا رہے تھے۔ ایک بار وہ میرے گاؤں سے گزر کر شاہ صفیر تک بھی گئے تاکہ مزار شریف پر چادر چڑھا کر روحانی آشیرباد حاصل کر سکیں۔ اسلام کا غم اور اولیائے کرام کا احترام ان کے سینے میں کچھ زیادہ شدّت سے ہی موجزن ہو رہا تھا۔ صفیر ڈھن اور شاہ صفیر کے درمیان ایک چھوٹی سی خانقاہ واقع ہے۔ خانقاہ میاں صمت صاحب۔ اکڑی ہوئی گردن والا "خان بہادر" اپنے گھوڑے کی طنابیں کھینچ کر رکھتا ہے اور بڑی عاجزی کے انداز میں دستِ دُعا بلند کرتا ہے۔ زیارت کے آس پاس منڈلاتے ہوئے مجاوروں کے ہاتھ پر چند سکے رکھ دیتا ہے اور سمجھتا ہے "ممبری پکی ہو گئی۔ شاہ صفیر کے سجادہ نشین بھی اسے تسلی دلاتے ہیں۔ مگر افسوس اس روحانی تالیفِ قلب کے بعد بھی "خان بہادر" کی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ قوم اب ان مفاد پرست لیڈروں کے داؤ پیچ میں آنے والی نہیں تھی۔

ادھر ڈاکٹر عالم عرف لوٹا کی بھی سنیئے۔ موصوف بے تاب بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی حیثیت تھالی کے بینگن سے زیادہ ہرگز نہ تھی۔ جس راستے سے گزرتے لوگ لوٹے ہاتھوں میں لئے ان کا شاندار "استقبال" کرتے۔ منچلے نوجوان، لوٹوں کو آپس میں ٹکرا کر جل ترنگ کا سماں پیدا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب تھے بڑے سخت جان۔ اس صورتِ حال سے پریشان ہونے کی بجائے وہ محظوظ ہوتے "بار بھانوین بہسن" (ریڑھ کی ہڈی کے انتہائی نازک سرے پر اگنے والے آگ

کی چھاؤں میں بیٹھنے والوں کے عزم کی داد دینا ہی پڑتی ہے) کی ڈاکٹر لوٹا منہ بولتی تفسیر تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کار سے خود لوٹے نکال کر لوگوں کو دکھاتے۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنسنے کا موقع فراہم کرتے چھوکروں کے تو وارے نیارے تھے۔ ڈاکٹر صاحب پر جھپٹ کر ان سے لوٹے چھینتے، انہیں آپس میں ٹکراتے اور ان کی کرچیوں کو فضا میں اچھالتے۔ وہ زمین پر گرتیں، تو انہیں اپنے پاؤں تلے مسل ڈالتے۔ یہی حال وہ تمام ملّت فروش "لوٹوں" کا قومی سطح پر کرنے والے تھے۔ اور بلاشک انہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ کام کر دکھایا۔

صاحبو! بات طویل ہو گئی۔ اُدھر میں آپ کو ہسٹری کے پروفیسر شرما سے ملانا چاہتا تھا۔ چلئے، آپ کو ہسٹری کے کلاس روم میں لے چلوں جہاں پروفیسر صاحب اپنے طلبا کو کلاس ٹیسٹ کے نتائج سنا رہے ہیں۔ لیجئے میرا نام پکارا جاتا ہے۔ اللہ خیر، جانے پٹاری کھلنے پر کیا چیز برآمد ہوتی ہے۔ ارے "مابدولت" تو پوری کلاس میں اوّل آ گئے کوئی فلوک (FLUKE) لگ گیا ہو گا۔ سراپے کا جائزہ لیتے ہیں اور میرے پچکے ہوئے گالوں، زرد چہرے اور دھنسی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگاتے ہیں کہ فرسٹ آنے والا یہ لڑکا ضرور افلاس اور بدحالی کا شکار ہو گا۔ ان کا "جذبہ ترحم" ابھرتا ہے جس کے نتیجے میں ہم ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ موصوف مجھے کالج سے وظیفہ

(STIPEND) دلوانے کے ساتھ میری "ذہنی نشوونما" پر بھی خصوصی توجہ دینے لگتے ہیں ہر روز اہتمام سے پوچھتے ہیں بیٹے پڑھائی کا کیا حال ہے اور جب انہیں میرے مالی حالات کا صحیح صحیح علم ہوتا ہے تو وہ مجھے شہر میں واقع ایک لائبریری میں لے جاتے ہیں پانچ دس روپے کا زر ضمانت اپنی جیبِ خاص سے ادا کرتے ہیں اور ماہانہ چندہ کی رقم ایک سال کی یکمشت دے کر ہمیں اس لائبریری کا باضابطہ رکن بنوا ڈالتے ہیں۔ بہت بعد میں یہ راز کھلتا ہے کہ پروفیسر شرما کمیونسٹ پارٹی کے رکن ہیں اور جس لائبریری کا مجھے رکن بنایا گیا ہے۔ وہ مقامی کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اہتمام چلتی ہے۔ خیر اس لائبریری نے آگے چل کر میری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ جس کی تفصیل کے لئے آپ کو تھوڑی دیر انتظارِ ساغر کھینچنا پڑے گا۔

میں باقاعدگی کے ساتھ لائبریری کا چکر لگایا کرتا۔ وہاں ایک عمر رسیدہ انسان سے میری مڈبھیڑ ہوا کرتی جسے اس کے حلقہ بگوش "دادا" کہہ کر پکارتے۔ یہ "دادا" بڑا گرگ باراں دیدہ تھا ہر آنے جانے والے سے فوراً گھل مل جاتا اور کسان، مزدور کا غم بڑی دلسوزی اور غمگساری سے کھایا کرتا۔ مجھے بھی اکثر اپنی محفل میں شریک کر لیتا۔ بات کسان، مزدور سے نکل کر ہیگل، مارکس اور لینین کے ارد گرد گھومنے لگتی۔ یہ عمل بڑی تیزی سے دہرایا جاتا۔ زلف بکھرتے ہی رخسار تک ڈھلک آتی۔ کیوں نہ ہو مارکس اور

لینن "سرخوں" کے قبلہ و کعبہ، ملجا و ماویٰ جو ٹھہرے۔ "دادا جان" "اپنے پوتے" یعنی اس خاکسار پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے۔ کمیونسٹ "خام مال" پاکر بہت شاد ہوتے ہیں۔ اس مال کو وہ اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ "دادا جان اکثر کہا کرتے کاربٹّو فکرمند کسان۔ مزدور کو اب زیادہ دیر محکوم نہیں رکھا جا سکتا۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ ڈھیر سارے بھاری بھرکم الفاظ استعمال میں لاتے بورژوا، پرولتاری (DIALECTICAL MATERIALISM) اور اس طرح کے اور کئی بوجھل الفاظ۔ میں سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیتا۔ وہ سمجھتے شکار تیزی سے "زیرِ دام" آرہا ہے۔ لیکچر ختم ہوتا تو چائے سے جس کے اوپر ملائی کی گہری تہیں جمی ہوتیں وہ میری اور دیگر حاضرینِ مجلس کی تواضع کرتے۔ ہم سمجھتے سر ہلانے کے عوض اگر دودھ، ملائی مل جائے تو یہ کون سا مہنگا سودا ہے۔ لوگ تو ردّی کپڑے کے جھانسے میں اپنا ایمان تک داؤ پر لگا ڈالتے ہیں۔

باب — ۸

ملکی حالات پر ایک نظر

تو میں عرض کر رہا تھا ، میں جون ۱۹۴۷ء میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گاؤں چلا آیا تھا۔ اسی دوران پاکستان خدا کے فضل سے وجود میں آ گیا۔ میں اگست ۱۹۴۷ء میں گاؤں سے لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ ڈی اے وی کالج ویرانے کا منظر پیش کر رہا ہے۔ ہندو عملہ ملک چھوڑ کر بھارت پہنچ چکا تھا۔ اور کالج کھلنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا بنے گا۔ بے شمار مصائب کا مقابلہ کر کے میں نے داخلہ لیا تھا۔ مگر مستقبل کے خواب مجھے پورے ہوتے دکھائی نہیں دے رہے تھے، اور میں سخت پریشان تھا۔ میں نے پروفیسر شرما کی وساطت سے دو تین کتابیں دادا کی لائبریری سے مستعار لے رکھی تھیں۔ ایک دن میں انہیں لوٹانے لائبریری چلا گیا

دیکھا تو دادا وہاں سے غائب۔ اس کی کرسی پر ایک اور نوجوان براجمان ہے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا حالِ دل نوجوان کو کہہ سنایا۔ اور وہ میری باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔ میں نے اسے پروفیسر شرما کے حوالے سے لائبریری کا ممبر بننے کی روئداد کہہ سنائی۔ اپنی غربت اور تعلیم کے منقطع ہونے کے تعلق کا بھی تذکرہ کیا۔ نوجوان ہمہ تن گوش ہو کر میری داستانِ غم سنتا رہا اور آخر میں یوں گویا ہوا:

"برخوردار! میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تم تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہو۔ تسلی رکھو تمہیں یہ موقع ضرور فراہم کیا جائے گا۔ تم کل صبح دس بجے گارڈن کالج پہنچ جاؤ۔ اور وہاں جا کر پروفیسر خواجہ مسعود کا پتہ کر لینا۔ میں آج ان سے تمہارے بارے میں ذکر کر دوں گا۔"

شدّتِ جذبات سے میں کچھ یوں مغلوب ہوا کہ میں اپنے محسن کا نام پوچھنا ہی بھول گیا۔ اور بڑی بے قراری سے اگلی صبح کا انتظار کرنے لگا۔

جی ہاں! ٹھیک دس بجے میں گارڈن کالج کے احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ چپراسی مجھے خواجہ مسعود کے کمرے میں لے گیا۔ ادھر داخل ہوتے ہی میں کیا دیکھتا ہوں۔ وہی صاحب جو کل دادا کی لائبریری میں میری ڈھارس بندھا رہے تھے، وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔

اب مجھ پر یہ راز کھلا کہ کل والے حضرت تو خود خواجہ مسعودی تھے۔ میں ان کی کامیاب اداکاری سے بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے تو کمال کر دیا تھا۔ خواجہ صاحب کی کرم فرمائی سے میرے داخلے کا مرحلہ بڑی آسانی سے طے ہو گیا۔ ہوسٹل میں بھی سیٹ مل گئی۔ درسی کتابوں کا بنڈل بھی بلا معاوضہ مجھے فراہم کر دیا گیا۔ اور یہ سب کام چند گھنٹوں کے اندر اندر مکمل ہو گیا۔ خواجہ صاحب میرے داخلے میں ذاتی دلچسپی لے رہے تھے۔ پہلی ملاقات میں ہی مجھے ان کی "طاقتوں" کا اندازہ ہو گیا۔ بلاشک ان کا فرمایا ہوا بڑا مستند سمجھا جاتا تھا۔ خواجہ صاحب کی نظرِ عنایت کے طفیل میرے اُجڑے گلستان میں بہار لوٹ آئی تھی۔

گارڈن کالج میں میرا داخلہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ میں نے اپنی "فتوحات" کا ذکر کیا تو دوسرے دن تو عالی بھی وہاں آن پہنچا۔ میری وساطت سے اسے بھی داخلہ ملا۔ اور امجد ملک اور انور کو بھی۔ میں اب ایک "وی۔ آئی۔ پی"[لہ] بن چکا تھا۔ خواجہ صاحب سے جو بات کہتا وہ اسے فوراً پذیرائی بخشتے۔ ڈی اے وی کالج میں ہم دوستوں نے جو بساط بچھائی تھی اسے گارڈن کالج میں پھر سے بچھا دیا۔ میں خوش تھا۔ "چار درویش" یہاں بھی آن اکٹھے ہوتے ہیں۔ خوب گزرے گی۔

[لہ] VERY IMPORTANT PERSON

اور وہاں ہم دوستوں نے مل بیٹھنے کا عمل کچھ زیادہ ہی تیز کر دیا۔ بات یہ تھی کہ ملکی حالات بڑے پُرآشوب دور سے گزر رہے تھے۔ پاکستان بن چکا تھا۔ مگر آزمائشوں کا سیلابِ بلا، قوم کے اعصاب کو شل کر رہا تھا۔ غیر مسلم آبادی کا پاکستان سے بھرپور انخلا، مہاجرین کے لٹے پٹے قافلوں کی آمد اور ان کی پریشان حالی اور درماندگی، معیشت کی تباہی انتظامیہ کا غیر موثر کردار، افواجِ پاکستان کی تہی دامنی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں انار کی کیفیت طاری تھی۔ مہاجرین کا مسئلہ سرِفہرست تھا۔ خاک میں لتھڑے اور خون میں نہلائے ہوئے فرزندانِ توحید اپنا سب کچھ لٹا کر خستگی کے عالم میں اپنی قربانیوں کی داد پانے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ مظلوموں کی چیخیں، بیوہ عورتوں کی شیون، وحشت زدہ دوشیزاؤں کی آہ و بکا، بے خانماں گھرانوں کا نالہ۔

یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے گھمبیر مسائل قوم کے اعصاب پر بجلی بن کر گر رہے تھے۔ تعلیمی اداروں کی فضا بھی بڑی اداس اور مغموم تھی۔ کلاسوں میں حاضری برائے نام ہوا کرتی۔ ہندو اور سکھ اساتذہ جا چکے تھے۔ اور نئے اساتذہ ہنوز تعینات نہیں ہوئے تھے۔ اس پس منظر میں ہم تین چار ساتھی علی الصبح ہوسٹل سے کالج پہنچ جاتے۔ حسنِ اتفاق سے اگر کوئی کلاس ہو جاتی تو ٹھیک۔ ورنہ ہم باہر لان میں بیٹھ کر آس پاس بکھری ہوئی دکھی

کہانیاں ایک دوسرے کو سناتے۔ عالی کا خیال تھا ہم نے پاکستان بنانے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا تو ہماری بہنوں کی عصمتیں یوں سرِ عام نہ لٹتیں۔ نہ ہمارے معصوم بچوں کو کھولتے ہوئے کڑاہوں میں جھونک کر انہیں زندہ بھون ڈالنے کی نوبت آتی۔ نہ جوان بیٹیوں کو ان کے والدین کے سامنے برہنہ کر کے بھارتی درندوں اور بھیڑیوں کو منہ کالا کرنے کا حوصلہ پڑتا۔

عالی یہ باتیں کرتے وقت بڑا جذباتی ہو جاتا۔ وہ خود بھی مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آیا تھا۔۔۔۔ وہی مشرقی پنجاب جہاں "خالصہ سورماؤں" نے اپنی خونی تلوار سے لاکھوں مسلمانوں کے سر قلم کئے تھے۔ اور انہیں نیزے کی انیوں پر اچھالا تھا۔ عالی ہمیں بتایا کرتا کہ مسلمان کے لہو سے کس طرح ہولی کھیلی گئی تھی۔ ہم سب وحشت کے عالم میں یہ باتیں سنتے اور ہمارا خون کھولنے لگتا۔ محفل برخاست ہوتی تو اس عزم کے ساتھ کہ ہم اُن چراغوں کو کبھی بجھنے نہ دیں گے جنہیں ہمارے شہیدوں نے اپنے خون سے روشن کیا ہے۔

عالی کا غم ایک ایسے حساس انسان کا غم تھا جو خون کا دریا پاٹ کر پاکستان پہنچا تھا۔ درد کی انتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر وہ واقعات کی سچی تصویر پیش کرتا تھا ہم لوگ ان واقعات

پہ بڑے دل فگار تھے۔

اجازت ہو تو عالی کو اس کے حال پر چھوڑ کر آپ کا پروفیسر خواجہ مسعود صاحب سے تعارف کرا دوں کہ وہ ان دنوں گارڈن کالج کی روحِ رواں تھے اور ہر طرف ان کا طوطی بولتا تھا۔ خواجہ صاحب بنیادی طور پر ریاضی کے استاد تھے۔ مگر کالج کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا کرتے تھے۔ "ہمزدا کلب" کے صدر تھے اور اپنی حریف "یار کلب" سے ان کی دیرینہ چشمک تھی۔ لڑکے دوسرے اساتذہ کی کلاسوں میں اودھم مچایا کرتے۔ استاد پر چاک کے ٹکڑے پھینکنا، پاؤں سے زمین کو رگڑ کر "لنگی" پیدا کرنا، بلیوں کی آوازیں نکالنا اور موقع پر مظہر شاہ کے انداز میں بڑکیں مارنا، یہ سب کچھ طلبا کے روز مرہ کے معمولات میں شامل تھا۔ مگر خواجہ صاحب کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ کلاس میں قدم رکھتے تو مکمل سناٹا طاری ہو جاتا۔ میں نے بہت کم اساتذہ کو اتنا بارُعب دیکھا ہے۔

خواجہ صاحب بہت عمدہ استاد تھے۔ پڑھاتے تو ہمارے ذہن کی گرہیں کھلنے لگتیں۔ وہ قدم بہ قدم چلنے کے قائل تھے ان کا مرغِ تخیل ہمیشہ ان کے تابع رہا کرتا۔ اسے کبھی بے قابو نہ ہونے دیتے۔ اور ہاں، رگِ گل سے بلبل کے پَر باندھنے کا بھی انہیں خوب ڈھنگ آتا تھا۔ پندرہ، بیس منٹ ریاضی کا سبق پڑھا چکنے کے بعد وہ "کسان مزدور" کا غم ضرور کھایا کرتے۔ اس کی بدحالی

کا رونا روتے، جاگیر دار اور سرمایہ دار کی چیرہ دستیوں کا تذکرہ چھڑتے ان کی تقریر بڑی موثر ہوا کرتی۔ اور یہ عمل بلا ناغہ ہر روز دہرایا جاتا۔ اگر کسی دن اس معمول میں تاخیر ہو جاتی تو ہم لوگ آنکھوں کے اشارے سے ایک دوسرے سے پوچھتے۔ یار، آج کسان، مزدور کہاں غرق ہو گیا ہے۔ اور پھر جب خواجہ صاحب کا پسندیدہ موضوع تھیلے سے باہر نکل آتا تو ہماری جان میں جان آتی، سچ تو یہ ہے کہ کسان، مزدور سے ہماری پکی دوستی ہو گئی تھی۔

عالی احراری تھا۔ مگر خواجہ صاحب کے ترقی پسند نظریات نے دھیرے دھیرے اسے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اب اس کی گفتگو بھی ہیگلوں، مارکسوں اور لیننوں کے اردگرد گھومنے لگی تھی۔ میں اس صورت حال پر بہت پریشان تھا۔ عالی ہی تو میرا واحد سہارا تھا جو اب چھنتا دکھائی دے رہا تھا۔ عالی نے مجھے بھی "راہ راست" پر لانے کی کافی کوشش کی۔ میں اس کے دام میں پھنسنے سے محفوظ رہا۔ مگر میری بدنصیبی، مجھے تشکیک اور بے یقینی کے کانٹے پریشان کرنے لگے۔ اس دوران نماز کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ طبیعت پر جبر کر کے جب کبھی میں سجدہ ریز ہونے کی کوشش کرتا تو مجھے کوئی سرور نہ ملتا۔ صنم آشنا دل کو بھلا نماز میں کیا لذت میسّر آسکتی ہے۔ میرے لئے یہ دور انتہائی تکلیف دہ تھا۔ عمر

ایمان مجھے کھینچے ہے تو روکے ہے مجھے کفر

ایک دن حسنِ اتفاق سے مجھے اطلاع ملی کہ لاہور سے چند نوجوان آرہے ہیں جو اسلامی ذہن رکھنے والے لڑکوں کے اجتماع سے خطاب کریں گے۔ میرا ذہن اب مسلمان تو نہ تھا تاہم موقع غنیمت جان کر میں اس اجتماع میں شریک ہوگیا۔ میرِ کارواں کا نام اس وقت ذہن میں نہیں آرہا غالباً ظفر اللہ تھا۔ ان کی تقریر کا ماحصل کچھ یوں تھا:۔

"پیارے ساتھیو! ہم ایک مقصد لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ نوجوان تحریکِ پاکستان کا ہراوّل دستہ رہے ہیں اس طبقے نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کر کے پاکستان حاصل کیا ہے۔ یہ قربانی محض اس لئے دی گئی کہ یہاں اسلام کا نظام جاری وساری ہو۔ یاد رکھئے ہمارے ہاں نظریّے نے پہلے جنم لیا اور اس کے نتیجے میں ہمیں ملک ملا۔ ہمارا ملک نظریۂ پاکستان کا مرہونِ منّت ہے۔ اور اس کی بقا کا انحصار اس نظریہ کی توانائی پہ ہے نوجوانوں پر لازم ہے کہ وہ اس نظریہ کے تحفظ کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ اور ان تمام قوتوں کو پاش پاش کر دیں۔ جو اس ملک کے بنیادی نظریے سے متصادم ہوں۔

مقرّر کی تقریر حد درجہ ایمان افروز تھی۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا۔ میں حق کی تلاش میں سرگرداں تھا ہی۔ مقرّر کے خیالات مجھے زندگی کا تازہ اور منفرد شعور عطا کر گئے۔ اور مجھے یہ یقین ہوگیا کہ اس

ملک کی بقا کا واحد ضامن اسلامی نظام ہے یہ نافذ نہ ہوا تو ہمارا ملّی تشخص ہی مٹ جائے گا۔ اب میری سوچ میں یکسر تبدیلی آنا شروع ہو گئی۔ اور کمیونزم کی حقیقت کھل کر واضح ہونے لگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بے دین نظام، الہامی مذاہب کی نفی کر کے ایک غیر فطری معاشرے کو جنم دینا چاہتا ہے۔ اور ایسے نظام کو نافذ کرنے کے بارے میں سنجیدہ ہونا ان تمام قربانیوں کے غرقاب کرنے کے برابر ہے۔ جو حصولِ پاکستان کے لئے پیش کی گئی ہیں۔

سیاست پر بہت باتیں کر لیں۔ آیئے اب ذرا لکھائی پڑھائی کا تذکرہ ہو جائے۔ میں نے فکرِ معاش سے آزاد ہونے کے بعد خوب دل لگا کر محنت کرنا شروع کر دی تھی۔ نو ماہی امتحان میں میری پوزیشن بہت اچھی رہی۔ مجھے یاد ہے، میں نے اکنامکس میں ۱۵۰ میں سے ۱۱۸ نمبر حاصل کر کے کلاس میں نیا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ دوسرے مضامین میں میری پوزیشن اتنی اچھی نہ تھی۔ تاہم باقی ساتھیوں سے پیچھے بھی نہ تھا۔

اکنامکس کے پروفیسر سی لے پیٹرز مجھ پر خاص مہربان ہو گئے تھے۔ اور تاریخ کے استاد پروفیسر اعظم (مرحوم) کی عنایات بھی قابلِ ذکر تھیں۔ پروفیسر خواجہ مسعود پہلے ہی اپنے محسن تھے۔ اس طرح تھوڑے ہی عرصے میں اپنا شمار کالج کی "گنی چنی ہستیوں" میں ہونے لگا۔ پروفیسر وی۔ جے۔ عیسٰے داس اور پروفیسر تلوک چند محروم

سے بھی مجھے اکتسابِ علم کی سعادت نصیب ہوئی۔ پروفیسر محروم پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ یہیں مقیم رہے۔ پھر وہ بھارت تشریف لے گئے۔

محروم صاحب ان دنوں کچھ کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ کلاس میں ان کا زیادہ دل نہ لگتا۔ بس یونہی وقت گزارتے۔ اُدھر منچلوں کا یہ عالم تھا کہ وہ ان سے ہر روز تازہ کلام کا تقاضہ کرتے۔ محروم کبھی لڑکوں کی درخواست کو پذیرائی بخشتے۔ کبھی ان سے معذرت طلب کرلیتے۔ ایک بار کلاس کے پرزور اصرار پہ انہوں نے ایک رُباعی سنائی۔ جو ہنُوز میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ آپ بھی سنیئے۔

؎ دوشیزہ سرِ بزم اگر ناچے گی
گرد اس کے ہوس کارِ نظر ناچے گی
کھا جائے گی لغزش نگہِ پاک وہیں
جس وقت وہ لچکا کے کمر ناچے گی

تلوک چند محروم ہمیں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ انہوں نے کالج کو خیرباد کہا تو ان کی جگہ پروفیسر امام الدّین عرف بیضہ نے لے لی۔ یہ صاحب بڑی دلچسپ شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی کہانیاں زبانِ زدِ خاص و عام تھیں۔

امام الدین صاحب کو قدرت کی جانب سے سفید رنگ عطا

ہوا تھا۔ اور اسی حوالے سے انہیں بیضہ (انڈہ) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بیضہ صاحب کو اس نام سے چڑ تھی۔ مگر تھے وہ بالکل بے بس۔ جدھر سے گزرتے، پیچھے سے لڑکے "بیضہ، بیضہ" کی گردان شروع کر دیتے۔ یہ حضرت کالج میں (SELECTION COMMITTEE) کے پریذیڈنٹ تھے۔ اور ہر نئے طالب علم کا ان سے پالا پڑتا تھا نوواردوں کو پرانے "گھاگ" بہلا پھسلا کر بیضہ صاحب کے کمرے میں جھونک دیتے۔ جو موصوف کو ان کے منہ پر بیضہ صاحب کہہ کر پکارتے پھر ان کی جو درگت بنتی۔ وہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں۔ میں ان کی کیفیات الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اللہ دے اور بندہ لے۔

اور آیئے اب ذرا پروفیسر عیسیٰ داس سے ملتے ہیں۔ موصوف ایک شریف النفس عیسائی بزرگ تھے...... انگریزی ادبیات کے کہنہ مشق استاد۔ ان کی بائیں ٹانگ خراب تھی اور وہ ذرا لنگڑا کر چلتے۔ لڑکے انہیں آدھا بائرن (HALF BYRON) کہہ کر پکارتے۔ یہ ہاف بائرن والی بات بڑی دیر بعد اپنی سمجھ میں آئی۔ جہاں تک لنگڑا کر چلنے کا تعلق تھا۔ یہ بات بائرن اور عیسیٰ داس ان دونوں میں مشترک تھی۔ مگر بائرن کی "لنگڑاہٹ" میں بھی ایک عجیب حسن تھا۔ حسینائیں اسے لنگڑاتے دیکھ کر دیدہ و دل اس کے حضور فرشِ راہ کیا کرتی تھیں۔ اور وہ بھی ان کے جذبات کی پوری پوری "پاسداری" کیا کرتا تھا۔ اُدھر بیچارے عیسیٰ داس ذرا غیر رومانی

واقع ہوئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی پری چہرہ مخلوق لاحول پڑھنے لگتی تھی۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ اب کچھ باتیں پروفیسر اعظم کی، جن کی سخت گیری گارڈن کالج میں ضرب المثل تھی۔ لڑکے انہیں بلبن کے نام سے یاد کرتے تھے۔ انہیں ہم نے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا البتہ میرے ساتھ ان کا رویّہ حیرت انگیز طور پر مشفقانہ تھا۔ اس ناچیز پہ ان کے بہت سے احسانات ہیں۔ مگر ایک واقعہ کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔ پروفیسر اعظم ایک دن فرمانے لگے۔ سرور، چلو تمہیں اسلامیہ ہائی اسکول مری روڈ لے چلوں۔ جہاں آج شام علامہ محمدؐ اسد۔ پنڈی کے دانشوروں سے اسلامی ریاست کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے۔ اسد صاحب کا نام میں پہلی بار سن رہا تھا۔ بعد میں جب ان کی عظمت کا احساس ہوا۔ تو میں نے پروفیسر اعظم کو ڈھیر ساری دعائیں دیں جن کی وساطت سے میں بیسویں صدی کے اتنے قد آور مفکر سے متعارف ہوا تھا۔ اسد صاحب کو آپ جانتے ہیں، وہی

"ISLAM AT THE CROSS ROAD"

اور

ROAD TO MECCA جیسی زندہ جاوید کتب کے مصنّف۔

جی ہاں، وہی علامہ اسد، جنہوں نے یہودی مذہب کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کیا تھا۔

علامہ اسد" پاکستان میں اسلامی حکومت کیوں کر قائم ہو سکتی

ہے" کے موضوع پر انگریزی زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ اُدھر میرے پلے کچھ نہ پڑ رہا تھا۔ بارھویں جماعت کا طالب علم اتنے دقیق مسائل بھلا کیوں کر سمجھ سکتا تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو پروفیسر صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ علامہ صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے اور کچھ دیر تک اردو زبان میں میرے ساتھ ہم کلام رہے۔

اب کلاس روم سے نکل کر ذرا گارڈن ہال تک جہاں "مابدولت" روم نمبر ۲۵ میں براجمان ہیں۔ کالج سے فارغ ہونے کے بعد سب دوست میرے کمرے میں آ نازل ہوتے۔ شروع شروع میں تو عالی رضوی، امجد ملک، ارشاد الحق کیانی اور راجہ انور ہی اس پر توجہ فرماتے۔ بعد میں ان کی دیکھا دیکھی اور لڑکے بھی وہاں "قدم رنجہ" فرمانے لگے۔ اس طرح یہ مختصر سا کمرہ "جائے تنگ است و مرداں بسیار" کا منظر پیش کرنے لگا۔ بات یہ تھی کہ میرے کمرے کا محلِ وقوع ذرا "شاعرانہ" واقع ہوا تھا۔ یہاں بیٹھ کر چاروں جانب کے مکان ان منچلوں کی حریص نظروں کی زد میں ہوتے۔ تاک جھانک کے لئے اسے منتخب کیا گیا تھا۔ جب یہ مسخرے اکٹھے ہوتے تو مجھے وہاں سے مار بھگاتے۔ کہتے، رندوں کی محفل میں زاہدِ خشک کا کیا گزر۔ جا، تو اپنی راہ لے۔ پھر میں منہ لٹکائے خالد حمید کے گھر چلا جایا کرتا۔ وہاں اس سے سنجیدہ موضوعات

پر گفتگو ہوتی کہ خالد نے بچپن سے ہی فلسفیانہ مزاج پایا ہے۔ بیباڑگی کا اس کے ہاں سے گزر ہی نہیں ہوا۔

خیر چھوڑیئے اس دل لگی کو میں نے دو سال کا عرصہ گرتے پڑتے پورا کر لیا۔ اور ۱۹۴۸ء کے وسط میں الیف اے کے امتحان میں شریک ہوا۔ نتیجہ حسبِ توقع خوشگوار نکلا۔ یعنی ہم اچھے نمبر لے کر امتحان میں کامیاب قرار دے دئے گئے۔

باب — ۹

عملی زندگی میں پہلا قدم

میں نے ۱۹۳۸ء میں گارڈن کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اب مسئلہ مزید تعلیم حاصل کرنے کا تھا۔ والد صاحب کا اصرار تھا کہ میں کالج کا باضابطہ طالب علم بن کر بی اے تک تعلیم پاؤں۔ اُدھر مجھے اپنے گھر کی مالی حالت کا پورا احساس تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری وجہ سے تمام خاندان غربت کی چکّی میں مزید دو سال پستا رہے۔ میں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ ملازمت اختیار کروں گا، اور پرائیویٹ طور پر امتحان بھی پاس کر لوں گا۔ والد صاحب نے بڑی پس و پیش کے بعد میرے ساتھ اتفاق کیا۔ انہیں ڈر تھا کہ میری توجہ ہٹ گئی تو شاید یہ پڑھائی والی بیل منڈھے نہ چڑھ سکے۔

کالج کے زمانے میں ایک لڑکے عبدالواحد سے میری جان پہچان ہو گئی تھی۔ یہ بدنصیب لڑکا ابھی سیکنڈ ایر کا طالب علم ہی تھا کہ اوپر سے اس کا بلاوا آ گیا۔ اس کے والد حاجی علی احمد مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ وہ ڈائرکٹر ایجوکیشن کے دفتر میں ایک اہم اہلکار تھے۔ بیٹے کی وفات کے بعد مجھ پر بہت زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ اکثر فرماتے۔ بیٹا، تم وقت نکال کر میرے پاس ضرور آیا کرو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو واحد یاد آ جاتا ہے۔ میں ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا۔ اور ہفتے میں دو ایک بار ان کی خدمت میں حاضری دینے چلا جاتا۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد میں ایک دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ فرمانے لگے بیٹا، اگر تمہیں اسکول ماسٹری منظور ہے تو تمہارا تقرر میں ابھی کرائے دیتا ہوں۔ پھر انہوں نے چند ایسے اسکولوں کے نام گنوائے جہاں انگلش ٹیچرز کی آسامیاں خالی تھیں۔ اور میری خواہش کے مطابق انہوں نے میرا تقرر اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول کونتریلہ میں کرا دیا۔ کونتریلہ کا فاصلہ میرے گاؤں سے چار میل کے لگ بھگ ہے جسے بآسانی سائیکل پر طے کیا جا سکتا ہے۔

میں اپنا پوسٹنگ آرڈر لے کر گھر پہنچا تو ابا، امی نے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس خبر کا استقبال کیا۔ اس بات کی انہیں

خوشی تھی کہ مجھے اوائل عمر میں ہی روزگار مل گیا ہے مگر انہیں تشویش اس بات کی تھی کہ میری تعلیم شاید مکمل نہ ہو سکے۔

میں نے کالج کے زمانے میں اپنے وظیفہ کی رقم سے ایک نئی سائیکل چونسٹھ روپے میں خرید رکھی تھی۔ اب پروگرام یہ بنا کہ میں علی الصبح بذریعہ سائیکل کونتریلا اسکول چلا جایا کروں گا۔ اور اسکول اوقات کے بعد اسی پر گھر لوٹ آیا کروں گا۔ آٹھ دس میل روزانہ کی مسافت کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جوانی کا زمانہ تھا۔ برادرِ عزیز میجر ضیاءؔ ان دنوں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اور اسے ہم نے اینگلو ورنیکلر مڈل اسکول ڈورہ بدہال میں داخلہ دلوا رکھا تھا۔ ڈورہ بدہال کا فاصلہ بھی اپنے گاؤں سرگ ڈھن سے چار میل کے لگ بھگ تھا۔ رہائش کا انتظام والد صاحب نے اپنے ایک عزیز رشتہ دار چچا غلام حسن کے ہاں کرا دیا تھا جہاں سے وہ ہر سنیچر کی شام کو گھر آجایا کرتا۔ والدہ محترمہ گاہے گاہے اسے ملنے خود ڈورہ بدہال تک چلی جاتیں صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔

کونتریلہ میں میری تعیناتی ضیاء کے لئے بڑی فائدہ مند ثابت ہوئی۔ اب میں اسے اپنے ہمراہ سائیکل پر بٹھا کر کونتریلا اسکول لے جاتا اور پھر شام کے وقت اسے واپس بھی لے آتا۔ میرے والدین اس انتظام پر بہت خوش تھے۔ خصوصاً امی جی۔ اب انہیں ڈورہ بدہال جانے کی صعوبت سے نجات مل گئی تھی۔

میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا تو میری شادی عمل میں آ گئی۔ یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ قصہ یہ تھا کہ میری نسبت بچپن ہی میں، دیہاتی رسم و رواج کے مطابق طے پا گئی تھی۔ حسنِ اتفاق سے میرے اباجی اور تایاجی (دو سگے بھائیوں) کی شادی میری امی بی اور میری خالہ جی (دو سگی بہنوں) سے ہوئی تھیں۔ اس طرح میرے اور میری رفیقۂ حیات کے مابین والد اور والدہ دونوں حوالوں سے ڈبل (COUSINSHIP) کا رشتہ تھا۔ روایت یوں ہے کہ میں نے اپنے بچپن کے ابتدائی ایام میں اپنے ماتھے پہ کچھ اس انداز سے ہاتھ رکھا ہوا تھا جیسے میں کسی کو سلام عرض کر رہا ہوں۔ اس عالم میں میرے تایاجی وہاں آ پہنچتے ہیں اور مجھے اس عالم میں دیکھتے ہی فرماتے ہیں بچو۔ ہم نے تمہارا اسلام قبول کر لیا تو یہ تھی شانِ نزول ہماری منگنی کی۔!

تایاجی ایک صاف گو، راست باز اور خود دار بزرگ تھے محنت کے بل بوتے پہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرتے۔ قرض سے انہیں چڑ تھی۔ اکثر کہتے، قرض لینے سے بدرجہا بہتر ہے کہ آدمی بھنے ہوئے چنے پھانک کر ٹھنڈا پانی پی لے۔ اس سے نیند تو اچھی آ جائے گی۔ مقروض کی نیند تو تفکرات کی نذر ہو جاتی ہے۔ تایاجی کو میرے ساتھ بے پناہ پیار تھا۔ کوئی

ایسی چیز ملتی تو اسے میرے لئے سنبھال کر رکھتے۔ ہمارے گاؤں کے قریب ہی ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ "موہڑی دولچپیال" وہاں کے کئی افسر فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں اور اب بھی ہیں۔ بریگیڈیر سلطان محمود ڈبل ستارہ جرأت کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے۔ تایا جی کے ان افسروں سے اچھے مراسم تھے۔ ایک دن وہ میرے لئے ایک سولا ہیٹ وہاں سے لے آئے، اور مجھے پہنا کر بڑے خوش ہوئے۔ کہنے لگے میرے "بالو" کو یہ ہیٹ بہت سجتا ہے۔ بڑا ہوگا تو انشاء اللہ "ٹوپ ہیٹ" ہی پہنے گا۔ ان کی پیشن گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ مگر افسوس، اس وقت وہ اس دنیا میں موجود نہ تھے۔ ان کا انتقال ۱۹۴۷ء کے اوائل میں ہی ہوگیا جب میں فسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کے جیتے جی ہماری شادی کا اہتمام ہوجائے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے خوشی کا یہ منظر دیکھ سکیں۔ مگر اللہ کو منظور نہ تھا۔ پھر یہ فریضہ ان کی غیر حاضری میں والد صاحب، والدہ محترمہ اور خالہ جی کے ہاتھوں طے پایا۔ یاد رہے یہ بات ۱۹۴۸ء کے حوالے سے ہو رہی ہے۔

میری خواہش تھی کہ میری شادی، میری تعلیم مکمل ہوتے کے بعد ہی عمل میں آئے۔ مگر والدین کا خیال تھا کہ یہ فریضہ جتنا جلدی طے پا جائے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔ حیات مستعار کا کیا پتہ

کب یہ حباب پھوٹ جائے۔ دراصل تایا جی کی اچانک اور ناگہانی موت نے ایسے اندیشوں کو جنم دے دیا تھا۔

ہماری شادی انتہائی سادگی سے عمل میں آئی۔ نہ ڈھول ڈھمکا، نہ سمی دھمال، نہ ناچ رنگ۔ والد صاحب پابندِ شریعت تھے۔ وہ ایسی خرافات کو ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے۔ شادی کے وقت میری عمر ۱۸ سال کے لگ بھگ تھی۔ یوں سمجھئے ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ محلے کی بڑی بیبیاں میرے ساتھ مذاق کرتی تھیں کہتیں، بالوجی سناؤ، تمہاری بنو کا کیا حال ہے۔ میں طبعاً شرمیلا واقع ہوا ہوں۔ یہ جملے سن کر میں جھینپ جایا کرتا۔ پھر شرمانے لجانے کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک ہم سکہ بند "والدین" نہیں بن گئے۔ "والدین" بننے کا عمل سنہ ۱۹۵۰ء میں وقوع پذیر ہوا۔ جب اللہ نے ہمیں ایک عدد پیاری بیٹی سے نوازا۔

سچ بات تو یہ ہے کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد میں بڑی بیبیوں سے مزید خوف کھانے لگا۔ اب کی بار ہتھوڑا یوں سر پر پڑتا۔ ارے، دیکھو کیسا زمانہ آگیا ہے۔ "گلو" کے ابھی دودھ کے دانت تو گرے نہیں اور بن بیٹھا ایک عدد بیٹی کا باپ۔ یہ چھیڑ چھاڑ، یہ نوک جھونک کافی عرصہ تک ہمارے ساتھ چلتی رہی۔

اور آئیے، لوٹ کر ہم ہائی اسکول کو تربیلہ چلتے ہیں جہاں ہمیں "علم و حکمت کے موتی" ابھی بکھیرنے ہیں، میں پہلے دن سکول پہنچا

تو میری ملاقات قائم مقام ہیڈ ماسٹر عبدالعزیز صاحب سے کرائی گئی۔ موصوف مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے، کہنے لگے۔ سرور صاحب! آپ نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے آپ عمر کے اس حصے میں ہیں، جہاں آپ کو کسی دفتر میں "بابو" بننا چاہیئے تھا۔ مدرس کے لئے لازم ہے کہ اس کی شخصیت میں وقار اور سنجیدگی ہو۔ آپ تو خود ہائی اسکول کے طالب علم دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے سکول کے لڑکے بڑے "مرچھنگ" قسم کے ہیں۔ پھر بھلا یہ کیونکر آپ کی بات سنیں گے۔

عزیز صاحب کو ڈر تھا کہ میں اپنی کم سنی کے باعث لڑکوں پر کنٹرول نہیں رکھ سکوں گا۔ اور وہ میرا مذاق اڑائیں گے۔ مگر کرنا خدا کا یوں ہوا کہ غالب کے پُرزے اُڑنے سے محفوظ رہے۔ عزیز صاحب نے ٹائم ٹیبل میرے حوالے کرتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ میں کلاس میں پوری تیاری کے بعد داخل ہُوا کروں۔ اُدھر میں ناپختگی کے دور سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا تیاری کر کے کلاس کو پڑھانا تو نالائقی کی علامت ہے۔ وہ استاد ہی کیا جو پہلے خود "گھوٹا" لگا کر کلاس میں جائے۔ مزا تو جب ہے کہ ماسٹر کلاس میں جائے اور لڑکے جہاں سے پڑھنا چاہیں، وہیں سے کتاب کھول کر انہیں پڑھانا شروع کر دے۔ پھر میں کافی دنوں تک اسی حماقت کا مظاہرہ کرتا رہا۔ یعنی سبق کی پیشگی تیاری کو اپنی

توہین گردانتا رہا۔ ایک دن میں نے ابّا جی سے اپنے "کارنامے" کا ذکر فاتحانہ انداز میں کر دیا۔ میری توقع کے بالکل برعکس مجھے زبردست ڈانٹ پڑی "احمق۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ یاد رکھو آئندہ سبق تیار کیے بغیر کبھی کلاس روم میں قدم رکھنے کی حماقت نہ کرنا۔ یہ فعل جرم کے برابر ہے۔"

بعد میں میرے تجربے میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا سبق تیار کرنے کی برکتیں مجھ پہ آشکارا ہونے لگیں۔ کوتریلہ اسکول کے لڑکے عرصہ سے انگریزی ماسٹر کے "ورودِ مسعود" کے منتظر تھے۔ مجھے اپنے درمیان پاکر وہ بہت خوش ہوئے۔ میرے طریقِ تدریس سے بھی وہ بڑے مطمئن تھے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں علاقہ بھر میں میری قابلیت کی شہرت پھیل گئی اور لڑکوں کے والدین سے بھی میری جان پہچان کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کچھ عرصہ بعد راجہ عزیز احمد بھٹی بی اے بی ٹی مستقل ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے وہاں تعینات ہو گئے۔ موصوف ایک جابر استاد اور ایک سخت گیر حاکم تھے۔ وہ اسی علاقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ ان کے نظم و نسق میں مداخلت کر سکے۔ علاقے بھر کے ملک چوہدری اور خان بہادر قسم کے سرپنچ ان سے خائف رہتے۔ اور کبھی کسی بے جا کام کی غرض سے ان کے پاس آنے کی جرأت نہ کرتے۔ بھٹی صاحب کی یہ عظمت تھی کہ وہ ایک باکل اور صاحبِ کردار

بزرگ تھے انکے قول و فعل میں کوئی تصادم نہ تھا۔ زندگی کو ایک غیر منقسم اکائی سمجھتے تھے۔ عام مبلغوں کی طرح اسے انہوں نے خانوں میں نہ بانٹ رکھا تھا۔

بھٹی صاحب کے عہد میں اسکول نے شہرت کی نئی بلندیوں کو چھوا اور اس کا شمار ضلع بھر کے ممتاز سکولوں میں ہونے لگا۔ نظم و ضبط کا یہ عالم تھا کہ کسی استاذ کو یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ پیریڈ شروع ہونے کے بعد ایک منٹ بھی لیٹ پہنچے یا کلاس میں داخل ہو کر کرسی پر ستانے لگے۔ لڑکوں کو ہوم ورک دینا اور پھر اسے باقاعدگی سے چیک کرنا، استاد کے اوّلین فرائض میں شامل تھا اور اس سے پہلو تہی ممکن نہ تھی۔ کھیلوں اور دوسرے غیر نصابی مشاغل میں بھی اسکول کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہر طرف کونتریلہ اسکول کی دھوم تھی۔

بھٹی صاحب، جہاں ایک سخت گیر حاکم تھے، وہیں ان کے سینے میں دردمند انسان کا دل بھی دھڑکتا تھا۔ وہ اپنے اسٹاف کی فلاح و بہبود کا بہت خیال رکھتے اور انہیں کسی قسم کی گزند نہ پہنچنے دیتے۔ دیہات کے اسکولوں میں پارٹی بازی کی وباء عام ہوتی ہے۔ اسکول ماسٹر جس گروہ سے تعلق رکھتا ہو گاؤں کا مخالف گروہ اس کے خلاف شکایت بازی کا مشغلہ شروع کر دیتا ہے اور اسے زیر کرنے کے تمام ہتھکنڈے استعمال کرنے لگتا ہے۔ اس عمل میں کبھی بے قصور استاد

بھی پِس جاتے ہیں۔ مگر بھٹی صاحب کا معاملہ دوسرے ہیڈ ماسٹروں سے مختلف تھا۔ وہ اپنے اسٹاف کی تمام ذمہ داری خود قبول کر لیتے۔ افسرانِ بالا اگر کسی انکوائری کے لئے تشریف فرما ہوتے تو بھٹی صاحب انہیں اصل صورتِ حال سے آگاہ کر دیتے۔ اور اس امر کا یقین کر لیتے کہ ان کے کسی ماتحت کا بال بیکا نہ ہونے پائے۔

بھٹی صاحب مجھ پر خصوصی عنایات فرماتے۔ میں بحیثیت سیکنڈ ماسٹر اپنے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ مصروفیت کا کچھ نہ پوچھئے سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ مگر ان تمام مصروفیات کے باوجود میں نے بی اے کا امتحان پاس کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ بھٹی صاحب کو میرے ارادے کا علم تھا۔ وہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی فرماتے۔ میرا معمول یہ تھا کہ میں اسکول سے فارغ ہو کر شام کے وقت گھر لوٹتا۔ پھر رات گئے تک بی اے کی تیاری میں مصروف رہتا۔ میرے ایف اے کے زمانے کے دوست خالد حمید ر انجد ملک، راجہ انور اور عالی رضوی سب کالج کے ریگولر اسٹوڈنٹ تھے۔ میں مہینے میں ایک آدھ بار پنڈی کا چکر لگایا کرتا۔ اور دوستوں سے ان کے تیار کردہ نوٹس حاصل کر لیتا۔ یہ سلسلہ پورے دو سال جاری رہا۔ پھر امتحان دینے کا وقت آیا تو میں اللہ کا نام لے کر اس میں شریک ہو گیا اور امتحان پاس کر لیا۔ اور

وہ بھی اچھی سیکنڈ ڈویژن میں۔ راجہ انور کی کمپارٹمنٹ آئی۔ ملک امجد صاف گول۔ راجہ صاحب نے تو دوسری کوشش میں کمپارٹمنٹ کا معرکہ سر کر لیا، البتہ ملک صاحب نے دھیرے دھیرے ہی بی اے کا امتحان پاس کیا، یعنی ٹھیک آٹھویں کوشش میں۔ کبھی ملک امجد پر خاکہ لکھنے کا موقع ملا تو اس "گنجے" کے "تمام راز فاش کروں گا..... موصوف تقریباً "فارغ البال" ہیں۔

بارے، بھٹی صاحب کا تھوڑا سا بیان اور ہو جائے۔ موصوف کی علمیت کا یہ عالم تھا کہ مادّی علوم پر گہری نظر کے ساتھ ساتھ دینی مسائل پر بھی انہیں بے پناہ عبور حاصل تھا۔ قرآن کے اسرار و رموز بیان کرتے تو سننے والوں کا ایمان "تازہ ہو جاتا۔ اپنے نظریات میں پختہ تھے۔ "جدیدیت" اور "روشن خیالی" سے متنفر تھے۔ مگر اندھی عقیدت اور غیر عقلی روایات سے بھی انہیں کوئی علاقہ نہ تھا۔ ہر مکتبۂ فکر کا لٹریچر پڑھنے کا انہیں شوق تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری میں ابوالکلام آزاد، مولانا ماجد دریا بادی مولانا مودودی اور غلام احمد پرویز کی تفاسیر موجود تھیں۔ عربی کی تفاسیر بھی ان کے زیر مطالعہ رہا کرتیں۔

ایک دن اسکول کے اوقات کے بعد اسلام کے سیاسی نظریات پر بات ہو رہی تھی۔ سب شرکائے محفل اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے بھی مقدور بھر بحث میں حصہ لیا۔ بھٹی

صاحب کو پہلی بار احساس ہوا کہ یہ نوجوان اپنے دین سے عقیدت ضرور رکھتا ہے مگر ہنوز ناپختگی کا شکار ہے۔ انہوں نے ازراہِ عنایت مجھے اسلامی لٹریچر پڑھانا شروع کر دیا۔ ایک دن انہوں نے مجھے "معارف القرآن" کی ایک جلد پڑھنے کو دی ۔ مصنّف کا تو علم ہی ہو گا جی ہاں، چوہدری غلام احمد پرویز آج کل تو ان کی منقار زیرِ پر ہے۔ ان دنوں البتہ ان کی علمیت کا طوطی خوب بولتا تھا۔ میں نے تفسیر کا مطالعہ کیا، تو دو باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ ایک ان کا زورِ بیان اور دوسرا منطقی استدلال - میں پرویز صاحب کی تحریروں سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی نوٹ بک میں، میں نے اقتباسات لینے شروع کر دئیے۔ پرویز صاحب کا زورِ قلم مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا تھا۔

موصوف کی تفسیر پڑھ چکا تو میں نے ان کی دوسری تصنیفات بھٹی صاحب سے مستعار لینا شروع کر دیں، آج "نظام ربوبیت" زیرِ مطالعہ ہے تو کل "سلیم کے نام" "خطوط دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔ پھر میں جوں جوں آگے بڑھتا گیا، ایک ذہنی تلاطم سے بھی دوچار ہوتا گیا۔ پرویز صاحب کے زورِ بیان کا میں تو گرویدہ ہو ہی چکا تھا۔ مگر ایک چیز مجھے بُری طرح کھٹکنے لگی تھی۔

بات یہ تھی کہ پرویز صاحب کی تحریروں سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ یہ مردِ خدا، قدیم روایات سے ناطہ توڑنا چاہتا ہے اور قرآنی نظامِ ربوبیت کی آڑ میں ملّتِ اسلامیہ کو احادیثِ نبوی کے گراں بہا دینی ورثے سے محروم کرنے کی فکر میں ہے۔ مجھے یہ احساس بہت پہلے ہو گیا تھا۔ مگر میں بہت دیر حسنِ ظن سے کام لیتا رہا۔ ہاں پانی جب سر سے اوپر گذرنے لگا تو مجھ سے رہا نہ گیا اور بھٹی صاحب سے ایک دن اپنے خدشات کا اظہار کر دیا۔ بھٹی صاحب اس زمانے میں پرویز صاحب کے حلقہ بگوشوں میں شامل تھے کہنے لگے کہ تم نہیں جانتے۔ اس مردِ خود آگاہ نے کس طرح دینِ اسلام کو خانقاہ سے نکال کر مہذّب دنیا کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو نئی نسل، مُلّا کے غلط مذہب سے کتنی بدظن ہو چکی تھی۔ اسی پرویز نے اپنے منطقی دلائل کے زور پر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اسلام ایک متحرک اور جاندار قوت کا نام ہے، تمہارے گرد و پیش اشتراکیت کا بڑا چرچا ہے اشتراکیت کیا ہے؟ یہی کہ وہ اسلامی نظامِ معیشت کا چربہ ہے۔ پرویز کو تم غور سے پڑھو تو تمہیں پتہ چلے کہ اس شخص نے کس طرح مارکسزم کے سر پہ قرآن رکھ دیا۔ جاؤ "معارف القرآن" کو ایک بار پھر پڑھو اور اپنی عقل کے ناخن لو۔ بھٹی صاحب کی دوسری باتوں کو میں نے زیادہ قابلِ التفات نہ سمجھا۔ البتہ مارکسزم کے سر پر قرآن

رکھنے والی بات۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسی الجھن کو دور کرنے کے لئے میں نے پرویز صاحب کو ایک بار پھر پڑھ ڈالا۔ اور ہاں اس بار واقعی مجھ پر یہ راز کھلا کہ پرویز صاحب درحقیقت اشتراکیت کے نظامِ اجتماعی سے بے حد متاثر ہیں۔۔۔۔ مرعوبیت کی حد تک! مگر وہ برملا اشتراکیت کا پرچار بوجوہ کرنا نہیں چاہتے اور انہوں نے آسان نسخہ تلاش کر لیا ہے کہ اشتراکی نظامِ حیات کا نام بدل کر نظامِ ربوبیت رکھ دیا ہے "تاکہ خدا بھی خوش رہے اور کارل مارکس بھی۔ بھٹی صاحب کو اس وقت میرے خیالات پسند نہ آئے۔ مگر بعد میں مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے اپنی رائے سے رجوع کر لیا۔ سنا ہے کہ بعد میں وہ مودودی صاحب کے خیالات سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے باقاعدہ جماعتِ اسلامی کی رکنیت اختیار کر لی۔ خیر، یہ ایک الگ داستان ہے۔

باب — ۱۰

سنٹرل ٹریننگ کالج کے شب و روز

میں نے سنہ ۱۹۵۰ء میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ بھٹی صاحب نے مجھے بی ٹی کلاس میں داخلہ لینے کا مشورہ دیا تاکہ میرے سکہ بند استاد بننے کی صورت پیدا ہو سکے۔ اب تک تو میں نیم پختہ (ان ٹرینڈ) مدرس کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس کیٹیگری کے اساتذہ کا مستقبل چنداں روشن نہ تھا۔ کسی وقت بھی انہیں ملازمت سے علیحدہ کیا جا سکتا تھا۔

کالج میں داخلہ لینے کا مرحلہ بآسانی طے ہو گیا۔ کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ان دنوں کالج کے پرنسپل پروفیسر ہاشمی تھے۔ موصوف نے بڑا شاہانہ مزاج پایا تھا۔ کبھی اپنے دفتر سے باہر دکھائی نہ دیتے۔ موٹر پر دفتر تشریف لاتے اور چند گھنٹے وہاں قیام کے بعد واپس لوٹ

جاتے۔ ۹ ماہ کے دوران انہیں ہم نے صرف دو بار دیکھا۔ ایک۔ پہلے دن انٹرویو کے موقع پر۔ دوسری بار، جب وہ ہماری کلاس کو لیکچر دینے آئے۔ موضوع تھا۔

"ROLE OF ENGLISH LANGUAGE IN DEVELOPING COUNTRIES"

کالج کی تمام انتظامی ذمہ داریاں کالج کے وائس پرنسپل پروفیسر ناظر کے سپرد تھیں۔ یہ حضرت، خوفناک حد تک سخت گیر تھے۔ جو بدنصیب ان کے ہتھے چڑھ جاتا، اس کے پُرزے اُڑا کر وہ فضائے بسیط میں بکھیر دیتے۔ لڑکے ہر وقت چوکس رہتے کہ کہیں ناظر صاحب کی لپیٹ میں نہ آ جائیں۔ انہیں دیکھتے ہی وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہونے کی کوشش کرتے۔

ہم لوگ ان کے دورِ اقتدار میں چھٹی لینے کا خیال بھی اپنے قریب نہیں لا سکتے تھے۔ چھٹی کی درخواست لے کر جونہی کوئی ان کے قریب جاتا، وہ اس پر برس پڑتے۔ سائل ہزار باور کرانے کی کوشش کرے۔ حضور! میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے یا میری ہمشیرہ اللہ کو پیاری ہو گئی ہے۔ وہ ایک نہ سنتے۔ کہتے محترمہ کا انتقال ہو ہی گیا ہے۔ اب آپ جا کر کیا کریں گے۔ مغفرت کی دعا یہاں بیٹھ کر بھی کی جا سکتی ہے۔ روحیں وقت اور فاصلے کی قید سے ماورا ہوتی ہیں۔

چوہدری نذیر ہمارے ساتھی تھے۔ سیالکوٹ کے رہنے والے

تھے۔ بڑے جہاندیدہ، بڑے چالاک۔ ایک دن کہنے لگے۔ یار ناظر صاحب سے ڈانٹ کھاتے ہوئے ایک عرصہ ہو چلا ہے۔ آج، چھٹی کی درخواست لے کر ان کے پاس جاتا ہوں۔ سر پہ دو چار جوتے پڑیں گے تو دلِ مُضطر کو کچھ قرار نصیب ہو گا۔ دعا کرو، میری دلی مراد پوری ہو۔

اور صاحبو! پھر بیسویں صدی کا ایک معجزہ رونما ہو گیا۔ نذیر ہنسی خوشی واپس لوٹا اور ہر کسی سے والہانہ انداز میں لپٹنے لگا۔ پوچھا، تو پتہ چلا کہ اس کی کامیاب اداکاری کے حضور ناظر صاحب بھی سرنگوں ہو گئے ہیں۔ نذیر نے اپنی داستانِ غم کچھ یوں بیان کی:۔ ”سر! پچھلی رات ہمارے گھر چور آ گھسے۔ وہ اپریشن مکمل ہونے کے بعد رفوچکر ہونے ہی والے تھے کہ والد صاحب نیند سے بیدار ہو گئے۔ اور انہوں نے فوراً اس کمرے کو باہر سے بند کر دیا جس کے اندر چور موجود تھے۔ اب پولیس والوں کو جائے وقوعہ پرے جانا مقصود ہے۔ والد صاحب ضعیف ہیں۔ ان میں اتنی سکت نہیں کہ پولیس والوں سے رابطہ قائم کر سکیں“۔

ناظر صاحب کا دل یہ داستان سن کر پسیج گیا۔ اُدھر نذیر کے وارے نیارے ہو گئے۔

ہمارے ہوسٹل وارڈن مرزا عبدالحکیم طبیعت اور مزاج ہر دو اعتبار سے ناظر صاحب کے مقلّدوں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ بھی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ ہر وقت جلے بھنے بیٹھے رہتے۔

ہوسٹل کی زندگی کو انہوں نے اپنی تنک مزاجی کی بدولت اجیرن بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اس "حسنِ سلوک" کے پیشِ نظر طالب علم برادری نے سنٹرل ٹریننگ کالج کا نام "سنٹرل جیل" رکھ چھوڑا تھا۔ بعد میں جب کالج انتظامیہ کو اس "تبدیلیٔ نام" کا علم ہوا تو انہوں نے اس بات کا سختی سے نوٹس لیا۔

ٹریننگ کالج ایک اقامتی ادارہ ہے جہاں مفت تعلیم کیساتھ طلباء کو وظیفہ بھی ملتا ہے۔ اُس زمانے میں وظیفے کی ماہوار رقم پچاس روپے تھی۔ اُدھر اباجی مجھے گھر سے پچاس روپے ہر مہینے بھیج دیا کرتے۔ اس طرح سَو روپے کے اندر اندر گزارہ چل جاتا۔ زمانہ اچھا تھا۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں مہنگائی کا یہ عالم نہ تھا جس سے آپ، ہم آج دوچار ہیں۔

میں جب ڈارمیٹری میں مقیم تھا، وہاں دو ساتھیوں سے میری دوستی ایسی پکی ہوئی جو اللہ کے فضل سے آج تک قائم ہے۔ میرا اشارہ چوہدری محمد اکرام، حال ہیڈ ماسٹر سیالکوٹ اور قاضی غلام معبود حال ہیڈ ماسٹر روپوال کی جانب ہے۔ ۱۹۵۰ء میں ہماری جان پہچان شروع ہوئی اور یہ ابتدائی شناسائی آج گھرے برادرانہ مراسم کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

میرے اور اکرام کے مابین حد درجہ مشابہت پائی جاتی تھی۔ قد، کاٹھ، ساخت، پرداخت، چال، ڈھال غرض ہر چیز میں ہم ایک دوسرے سے اتنی گہری مماثلت رکھتے تھے کہ اکثر احباب ہمیں سگے

بھائی سمجھتے۔ ہم دونوں اپنے اکثر ساتھیوں سے عمر میں کم تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ ویسے آپ کے لئے یہ امر شاید باعثِ دلچسپی ہو کہ اکرام ہنوز اپنی جوانی کی چمک اور بانکپن برقرار رکھے ہوئے ہے۔ پانچ بچوں کا باپ ہے مگر یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ابھی ابھی "گھوڑی چڑھیا" ہو۔ اِدھر، ہم البتہ "بڈھے بابے" ہو گئے ہیں۔

میرے دوسرے عمر بھر کے رفیق، قاضی غلام معبود صاحب ہیں۔ یہ صاحب، خاص چکوال کے رہنے والے ہیں اور ایک معزز، قابلِ احترام خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ مزاج میں سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ہنستے مذاق سے دور رہتے ہیں۔ البتہ ہلکے پھلکے مزاح سے ضرور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بلا کے صاف گو، جرّی اور صاحبِ کردار انسان ہیں۔ کھری بات کہنے کے عادی ہیں۔ بنیادی طور پر مذہبی انسان ہیں مگر زیادہ باعمل نہیں۔ اُس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں جو گردن جھکا کر دیدارِ یار کرنے کا آرزومند ہو۔ فلسفیانہ مزاج پایا ہے۔ اکثر اوقات گہری سوچ میں غلطاں دکھائی دیتے ہیں۔ شعر و شاعری کا بھی بڑا صحت مند ذوق پایا ہے۔ تنہائی میں شعر گنگناتے ہیں۔ جو شعر یا مصرع ان کے ہتھے چڑھ جائے، اس کے کس بل نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ وسیع ظرف پایا ہے۔ دوستوں کی ترقی پر انہیں دلی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ حسد، رقابت، چشمک نام کے کسی روگ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اسکول ماسٹر

کی حیثیت سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ خدا کے فضل سے میں نے ترقی کی منازل تیزی سے طے کر لیں۔ میری ہر کامیابی پر انہوں نے اپنی بے پایاں خوشی کا اظہار کیا۔ جیسے اس کامیابی نے ان کے اپنے در پر دستک دی ہو۔

بات کچھ طویل ہوگئی۔ میں ڈارمیٹری کے حوالے سے اپنے ساتھیوں کا ذکر رہا تھا۔ سب ساتھیوں سے میرے مراسم کافی خوشگوار تھے۔ مگر آخری چند ہفتوں میں، ہمیں دو گروپوں میں سے ایک کا ساتھ دینا پڑا۔ بات یہ تھی کہ قدوائی صاحب اور عزیز صاحب ہمارے دو ساتھی تھے۔ دونوں کے مابین علی گڑھ کے زمانے سے پرانی مخاصمت چلی آرہی تھی، جو یہاں سنٹرل ٹریننگ کالج میں آکر اپنے نقطۂ عروج پر آپہنچی تھی۔ ایک الیکشن کے سلسلے میں دونوں کے درمیان ٹھن گئی۔ اور ہم جیسی غیر جانبدار (NEUTRAL) مخلوق کو بھی اپنا وزن کسی ایک پلڑے میں ڈالنا پڑا۔ قاضی معبود صاحب نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہم تینوں دوست اپنا وزن قدوائی صاحب کے پلڑے میں ڈالیں گے۔ چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ عزیز صاحب تھوڑے دن کبیدہ خاطر رہے۔ پھر جب انہوں نے حالات کا معروضی جائزہ لیا تو انہیں ہماری حکمتِ عملی سمجھ میں آگئی۔ اور ان سے ہمارے دوستانہ مراسم پھر استوار ہوگئے۔

بی ٹی کے کلاس فیلوز میں سے ہم چار دوستوں نے فوج میں شمولیت اختیار کی۔ فضل حق، بشیر حسین شاہ، اعجاز اکبر اور راقم الحروف۔

فضل حق لیفٹیننٹ کرنل تھے، جب انہوں نے مرحوم مشرقی پاکستان میں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ بشیر حسین شاہ میجر کے عہدے پر فائز ہیں اور ان دنوں لاہور میں تعنیات ہیں۔ اعجاز صاحب۔ ماشااللہ برگیڈیئر ہیں اور جونیئر برن ہال ایبٹ آباد میں پرنسپل کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ "مابدولت" کا تو آپ کو علم ہی ہے۔ نیشنل ڈیفنس کالج لائبریری کی سربراہی کا اعزاز اس ناچیز کو حاصل ہے۔

اعجاز صاحب کا شمار چوٹی کے طلباء میں ہوتا تھا۔ ریاضی کا لے۔ بی کورس لے کر انہوں نے بی اے کا امتحان پاس کر رکھا تھا۔ اور وہ وظیفہ کے اہل قرار پاتے تھے۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی ان کی صلاحیتوں کے جوہر خوب کھلتے۔ ڈرامہ کے فن میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ٹریننگ کالج میں انہوں نے ایک تقریب میں چند SKITS پیش کئے۔ اس شو کی تفصیلات ہنوز میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ اعجاز صاحب ایک سکھ پلاٹون کو پریڈ کرا رہے ہیں۔ اور کچھ اس انداز میں کاشن (CAUTION) دے رہے ہیں۔ "خالصہ سوکھا" (STAND AT EASE)؛ خالصہ اوکھا (ATTENTION) خالصہ بھمبھیری (ABOUT TURN)

اس طرح دوسرے تمام کاشنوں کا بھی انہوں نے بڑا مزے دار ترجمہ کر رکھا تھا۔ اعجاز صاحب کی اداکاری اتنی نیچرل تھی کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔ ایک اور شو انہوں نے اس وقت اسٹیج کیا جب ہمارے وارڈن مرزا عبدالحکیم، ہمیں گھوڑا گلی لے گئے تھے تاکہ بقول

ان کے بھاری "ہاڈیاں" (ہڈیاں) مضبوط ہوں۔ اعجاز صاحب نے اس موقع پر ایک معرکہ آرا قوالی پیش کی، جس کی تان "تاڑ" مارنے کے ساتھ ساتھ اس بند پر ٹوٹتی:

زو لو کی ہم تلاش میں نکلے کہاں کہاں

یہ "شاعرانہ تک بندی" ماحول کی مناسبت سے ترتیب دی گئی تھی۔ مرزا صاحب کے "عہد حکومت" میں "قوم" نے جس کٹھن کا سامنا کیا تھا آج اس کے اظہار کا بڑا مناسب موقع تھا۔ اس قوالی کی یہی "شان نزول" تھی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج میں قیام کے دوران میں جن ہستیوں سے متاثر ہوا ان کے اسمائے گرامی ہیں۔ حاجی فضل احمد، چوہدری عبدالغفور، پروفیسر ڈاکٹر عبدالرؤف اجازت ہو تو ان حضرات کا مختصر سا تعارف کرا دوں۔

فضل احمد صاحب کا ذکر آیا ہے تو حالت یہ ہے کہ "نطق نے بوسے میری زبان کے لئے" حاجی صاحب، عظمت اور روشنی کا مینار ہیں۔ شرافت کا پیکر اور حسنِ اخلاق کی اعلیٰ صفات سے بہرہ ور۔ سادگی ان کی زندگی کا شعار ہے۔ رہی ان کی علمیت کی وسعت تو اسے بلا خوفِ تردید سمندر سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ چار پانچ مضامین میں ایم اے کی ڈگریاں لے رکھی ہیں۔ درجنوں کتابوں اور سینکڑوں طبع زاد مضامین کے مصنف ہیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر انہیں حیرت انگیز عبور حاصل ہے۔ بہت تیز لکھتے ہیں اور خاصے

کی چیز لکھتے ہیں۔ رطب و یابس کا ان کے ہاں سے گزر ہی نہیں ہوا۔

چوہدری صاحب سے میں نے اسلام کے مخصوص مزاج پر کتنی بار تذکرہ کیا۔ اپنی ذہنی کیفیات بھی بغیر کسی تحفظ کے ان کے سامنے رکھ دیں۔ گارڈن کالج اور پھر کونتریلہ کے تجربات، سبھی کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔ چوہدری صاحب میری مشکل سمجھ گئے۔ فرمانے لگے۔ حق کی جستجو کا جذبہ تمہارے اندر موجود ہے۔ مگر تم اپنی صحیح سمت ہنوز متعین نہیں کر سکے ہو۔ مگر اس میں گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ سچائی کے متلاشی بسا اوقات راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ جانتے ہو۔ امام غزالیؒ پر کیا گزری تھی؟ وہ ایک طویل عرصہ تک تشکیک کے انگاروں پر لوٹتے رہے۔ تشکیک کا کوئی کانٹا ایسا نہ تھا، جس کی چبھن انہوں نے اپنے سینے میں محسوس نہ کی ہو۔

میں چوہدری صاحب کی ان باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے ایمان کی کھوئی ہوئی دولت مجھے دوبارہ مل گئی ہو۔ قرآن فہمی کے سلسلے میں استادِ محترم اکثر فرمایا کرتے کہ آدمی اسوقت تک قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتا۔ جب تک عملاً وہ کام نہ کرے، جس کے لئے قرآن نازل ہوا ہے۔

چوہدری صاحب فرماتے: قرآن محض مجرد نظریات کی کتاب نہیں کہ آپ آرام کرسی پر دراز ہو کر اس کے معانی سمجھ سکیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ

"قاری سرے سے نزاعِ کفر و دیں اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھے اور اس کش مکش کی کسی منزل سے گزرنے کا اُسے اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں اس کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔

دوسرے بزرگ جن کی علمیت سے بہت متاثر ہوا، ان کا اسم گرامی تھا چوہدری عبدالغفور۔ جانے کس حال میں ہیں۔ ان سے رابطہ قائم نہ رکھ سکا۔ یہ صاحب ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ مطالعے کی گہرائی کا یہ عالم تھا کہ اِدھر ہسٹری میں ایم اے کی ڈگری لے رکھی تھی اُدھر کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رکھا تھا۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا۔ سر! ان دو مضامین میں کیا نسبت؟ فرمانے لگے۔ برخوردار! دیکھتے نہیں ہو ہسٹری اور کیمسٹری کے وزن میں کتنی ہم آہنگی ہے۔ انہوں نے کوئی سات بار رضاکارانہ طور پر بی اے اور بی ایس سی کے امتحانوں میں شرکت کی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کوئی مضمون ان کی گرفت سے بچ کر جانے نہ پائے۔ ہمیں وہ ہسٹری آف ایجوکیشن پڑھایا کرتے تھے۔ بڑے دھیمے انداز میں بولتے تھے۔ سامع کو ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھنا پڑتا تب جا کر کہیں ان کی بات پلے پڑا کرتی۔ کچھ عرصہ تو ہمیں یہ پتہ نہ چل سکا کہ وہ لیکچر دے رہے ہیں یا نوٹس لکھوا رہے ہیں۔ ہم اکثر کہا کرتے۔ یہ کسی فلسفی سے پالا پڑ گیا، جس کی بات ہی پلے نہیں پڑتی۔ بعد میں جب ان کے مزاج سے ہمیں آگاہی ہوئی اور ان کی قابلیت کے جوہر کھلے۔ تو ہم سب "ان کا فرمایا ہوا، مستند، سمجھنے لگے۔ ہندوستان

ہیں مسلمان زعما اور عمائدین کا تذکرہ اس جذبۂ ایمانی سے کرتے کہ ہمارا ایمان تازہ ہو جاتا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ، شاہ اسماعیلؒ شہید اور سید احمد بریلویؒ کے بارے میں ان کی بتائی ہوئی باتیں آبِ زر سے لکھی جانے والی ہیں۔ شاہ اسماعیلؒ کی شہادت کے حوالے سے انہوں نے جو درد بھرے اشعار ہمیں سنائے تھے، وہ مجھے اب بھی یاد ہیں۔ آپ بھی سنیئے:

اتنا پیغام درد کا کہنا
جب صبا کوئے یار سے گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے
دن بہت انتظار میں گزرے

اور یادش بخیر! پروفیسر ڈاکٹر عبد الرؤف کی نیاز مندی کا شرف بھی مجھے حاصل رہا ہے۔ موصوف ہمیں "تعلیمی نفسیات" پڑھایا کرتے تھے۔ آپ غالباً اسی زمانے میں لندن سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر وطن لوٹے تھے۔ ان کا تقرر پروفیسر عبد الحی علوی کی جگہ ہوا تھا جن کا شمار ملک کے نامور ماہرینِ نفسیات میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر رؤف بہت کم عمر تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد ان کے سامنے "بزرگ" دکھائی دیتے۔ رؤف صاحب بہت پایہ کے استاد ثابت ہوئے۔ اور ان کی قابلیت کو دیکھ کر ہم لوگ دنگ رہ گئے۔ موصوف کتابی بات ذرا کم ہی کرتے۔ اپنے تجربات زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کرتے۔

تجربات سناتے وقت وہ لگی لپٹی رکھنے کے قائل نہ تھے۔ گاہے گاہے، پاسبانِ دل کو تنہا بھی چھوڑ دیتے۔ ان کا لیکچر حد درجہ دلچسپ اور معلوماتی ہوتا۔ پروفیسر صاحب کی ہلکی پھلکی چٹکیاں بہار کا سماں پیدا کرتیں۔ کئی منچلے تو موقع ملتے ہی فرائڈ کے حوالے سے اپنے خوابوں کی تعبیر پوچھتے جسے پروفیسر صاحب بسا اوقات ہنسی مذاق میں ٹال دیتے۔ کبھی کبھی طنز کی ایسا کاری چپت اس کے گالوں پر رسید کرتے کہ منچلے کو منہ چھپانے کی کہیں جگہ نہ ملتی۔ بات یہ تھی کہ ڈاکٹر رؤف کو اپنے مضمون پر اس درجہ گرفت حاصل تھی کہ آپ جہاں سے چاہیں اور جو چاہیں، ان سے پوچھیں۔ شافی جواب ہر وقت حاضر۔ میں نے عمر بھر اتنا حاضر دماغ اور روشن خیال انسان نہیں دیکھا۔ ان کے علم کی وسعت کے علاوہ انگریزی زبان پر ان کی حیرت انگیز گرفت سے میں بہت متاثر تھا۔ پروفیسر صاحب بڑے خوبصورت، با محاورہ جملوں میں اپنے مدعا کا اظہار کرتے۔ بولتے تو منہ سے پھول جھڑتے۔ میں قلم۔ پنسل ہر وقت تیار رکھتا۔ جونہی ان کے منہ سے کوئی خوبصورت جملہ نکلتا، میں جھٹ اسے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا۔

پہلی نظر میں ڈاکٹر رؤف بڑے الٹرا ماڈرن دکھائی دیتے۔ مگر جب مجھے زیادہ قریب ہو کر انہیں دیکھنے کا موقع ملا تو میری خوشگوار حیرت کی انتہا باقی نہ رہی کہ یہ شخص تو انگریز کا بس یونہی لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اصل میں تو ایسا درویش ہے جو سرتاپا عشقِ رسولؐ میں

ڈوبا ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ میرا یہ تاثر صحیح ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رؤف نے دین کی جتنی خدمت کی ہے، اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ جو کام ایک ادارے کے کرنے کا تھا وہ ڈاکٹر موصوف نے تنہا کر دکھایا۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

کالج سے جب مجھے فراغت نصیب ہوتی تو میں داتا صاحب کے ہاں حاضری دینے چلا جاتا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے دوسرے روحانی مرشد کے ہاں پہنچتا کہ ہر دو آستانوں سے مجھے یک گونہ سکون نصیب ہوتا۔

خدا کا شکر ہے۔ مجھے بی ٹی کے دوران زیادہ مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ گزارہ اچھا چل جاتا تھا۔ جب کبھی میرا بٹوہ خالی ہوتا تو میں اپنے کیشیر چوہدری اکرام سے رقم ادھار لے لیتا۔ میں ہر نشے، ہر علت، ہر عیاشی سے محفوظ تھا۔ البتہ ریڈ بلڈ مالٹے کھانے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ اکرام، قاضی معبود اور میں ڈھیر سارے مالٹے منگوا لیتے اور پھر خوب جی بھر کر انہیں چوستے۔ گاہے گاہے، میں پان گلوری بھی منہ میں دبا لیتا کہ جگالی کا بھی ایک اپنا لطف ہے۔

باب — ۱۱

ہائی اسکول کو تربیلہ میں مراجعت

میں بی ٹی کا امتحان دے کر واپس اسکول لوٹا تو بھٹی صاحب بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ اب کی بار انہوں نے میرا پہلے سے بھی زیادہ احترام کرنا شروع کر دیا۔ میں دوبارہ اسکول میں پہنچا تو "عوام" میں خوشی کی لہر پھیل گئی۔ علاقہ کے زعماء لیفٹیننٹ نور حسن، کپتان راجہ ہریاسب خان، صوبیدار میجر عبدالرحمٰن، کرنل محمد اشرف، راجہ عبدالغنی، صوبیدار بوستان خان اور اس طرح کے دوسرے بزرگ بنفسِ نفیس مجھے خوش آمدید کہنے اسکول تشریف لاتے۔ یہ نام جو میں نے اوپر گنوائے ہیں، اُن دنوں علاقہ بھر میں ان کا طوطی صرف بولتا ہی نہ تھا، بلکہ چہکتا اور چہچہاتا تھا۔

چند دنوں بعد کونترلیہ اسکول میں یوم والدین منایا گیا۔ بھٹی صاحب کی خواہش پر میں نے بھی "حاضرین" سے خطاب کیا۔ موضوع تھا: "اسلامی نظام تعلیم کے اہم نکات" میں نے یہ سبق تازہ تازہ پروفیسر غفور صاحب سے سیکھ رکھا تھا۔ ظاہر ہے۔ اس میں ایسی معلومات تھیں جو عام طور سے کتابوں میں نہیں ملتی تھیں۔ تقریر کی دھوم مچ گئی۔

پھر چند دنوں بعد ہمیں اطلاع ملی کہ انسپکٹر آف اسکول میاں عبدالرشید اسکول کے معائنے پر تشریف لا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو سالانہ رپورٹ تیار کرنا تھی۔ انہوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ میں نے پوری دل جمعی کے ساتھ یہ رپورٹ مرتب کی۔ انسپکٹر صاحب نے اسے بڑی توجہ سے پڑھا۔ اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: بھٹی صاحب۔ آپ نے بہت عمدہ رپورٹ لکھی ہے۔ میں آپ کے اسلوب سے خصوصاً بہت متاثر ہوا ہوں۔ بھٹی صاحب نے شکریہ کے ساتھ ان تحسینی کلمات کو قبول کیا۔ اور اس موقع پر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے انسپکٹر صاحب کو بتایا۔ سر! آپ کی تعریف کا اصل مستحق میں نہیں میرا سیکنڈ ماسٹر غلام سرور ہے جو آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ یہ سب اس کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

میں بھٹی صاحب کے کردار کی عظمت اور ان کی صاف گوئی کا پہلے سے ہی معترف تھا۔ اس واقعے نے ان کے قد کاٹھ میں مزید اضافہ کر دیا۔ بھٹی صاحب نے میری سفارش کرتے ہوئے کہا۔ سر۔ یہ نوجوان استاد بڑا ذہین اور محنتی ہے۔ یہاں ڈسٹرکٹ بورڈ اسکولوں کی نوکری کرتے کرتے اپنے جوہر یونہی گنوا دے گا۔ آپ اجازت دیں تو ہم اسے گورنمنٹ سروس اختیار کرنے کی ترغیب دلائیں۔ انسپکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے ایک درخواست ڈی۔ پی آئی صاحب کے نام لکھ دی۔ اور اس کی ایک نقل چوہدری احمد خان صاحب کے حوالے کی۔ اب گیند چوہدری صاحب کی کورٹ میں تھی۔ وہ بھلا کہاں آرام سے بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے متعلقہ دفتروں کا تعاقب اتنے تواتر اور باقاعدگی سے کیا کہ بی ٹی کا نتیجہ نکلنے کے چند ہی دنوں بعد میری تقرری گورنمنٹ ہائی اسکول بوچھال کلاں (ضلع جہلم) میں ہو گئی۔ اس طرح ڈسٹرکٹ بورڈ اسکولوں کی ملازمت کا باب اختتام پذیر ہوا۔

باب — ۱۲

بوچھال کلاں میں تعیناتی

بوچھال کلاں کا قصبہ ضلع جہلم کے انتہائی مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس کی سرحدیں ضلع سرگودھا سے ملتی ہیں۔ یہ مقام سطح سمندر سے ۳-۴ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ موسم کے اعتبار سے ایبٹ آباد سے ملتا جلتا ہے۔ گرمیوں میں فضا خوشگوار اور معتدل رہتی ہے۔ البتہ سردیوں کے چند ماہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ کلر کہار کا نام تو آپ نے سنا ہوگا کہ یہ ضلع جہلم کا خوبصورت ترین مقام ہے۔ اس کا فاصلہ بوچھال کلاں سے ۸ میل کے لگ بھگ ہوگا۔ مغرب کی جانب آپ کو نورپور سیٹھی دکھائی دے گا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں اپنے لازوال حسن کی بنا پر

ضلع بھر میں خاصہ معروف ہے۔ اس گاؤں کی وجہِ شہرت یہ بھی ہے کہ اس نے شاہ شرف جیسا قادر الکلام صوفی شاعر پیدا کیا۔ اور پھر اسی گاؤں سے ماجد صدیقی جیسا مترجم بھی نمودار ہوا۔ ماجد نے شاہ شرف کے دوہڑوں کا اس خوبصورتی سے منظوم ترجمہ کیا ہے کہ ترجمے پر اصل کلام ہونے کا گمان گزرنے لگتا ہے۔ میرے گاؤں سے بوچھال کلاں کا فاصلہ کوئی ۸۰ میل کے لگ بھگ ہے۔ راستے کا کچھ حصّہ پہاڑی ہے۔

بوچھال کلاں کو ایک سال پہلے ہائی اسکول کا درجہ ملا تھا، اور وہاں تعلیمی سہولتوں کا بھیانک فقدان تھا۔ ٹرینڈ اسٹاف ناپید، لائبریری، لیبارٹری کی سہولتیں مفقود، عمارت ناکافی، مقامی آبادی تعلیمی مسائل سے بے نیاز .... اسکول اسی طرح کے بہت سے مسائل سے دوچار تھا۔ باہر سے آنے والے اسٹاف ممبرز کو کوئی سہولت نہ تھی۔ اس لئے کوئی آدمی دل لگا کر کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اس قصبہ میں پانی کا حصول جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ آج کل تو خیر پانی کی فراہمی کا خاطر خواہ انتظام موجود ہے، مگر اُس زمانے میں گاؤں سے باہر صرف ایک کنواں تھا۔ اور پانی بھرنے والی بیبیوں کو گھڑا

دو گھڑا پانی حاصل کرنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا۔ اس پانی کے مسئلہ پر قتل کی کئی وارداتیں بھی ہو چکی تھیں۔ روایت تھی کہ بوچھال کلاں کا پانی سال میں ایک آدھ بار خون کی قربانی ضرور مانگتا ہے۔ ناخواندگی کی وجہ سے عوام میں لڑائی بھڑائی اور مارکٹائی کے رجحانات زیادہ غالب تھے۔ پورا گاؤں دھڑوں اور پارٹیوں میں بٹا ہوا تھا۔ اسکول میں زیادہ تر مقامی اساتذہ تعینات تھے۔ پارٹی بازی یہاں بھی زوروں پر تھی۔ ماسٹر ظفر، منشی علی اور اس طرح کے دو ایک اور اساتذہ ایک گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُدھر ملک حق نواز، ملک نور خان اور چند دیگر حضرات، دوسرے گروپ کے سرکردہ رہنما تھے۔ ان دھڑوں کے درمیان دیرینہ دشمنی چلی آرہی تھی جس کا اظہار اب اسکول کی چار دیواری کے اندر بھی شروع ہو گیا تھا۔ نوواردوں کے لئے یہ صورت بڑی تکلیف دہ تھی۔ وہ اگر غیر جانبدار رہنا بھی چاہیں تو ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں کسی نہ کسی گروہ سے منسوب کر دیا جاتا۔

میں بوچھال کلاں ۱۰ر دسمبر ۱۹۵۱ء کی شام کو پہنچا۔ چکوال سے بس میں سوار ہوا تو اتفاق سے میری ساتھ والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا مسافر آن بیٹھا۔ تعارف ہونے پر

پتہ چلا کہ موصوف مولا بخش کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اور وہ بوچھال کلاں اسکول میں ہی پی۔ ٹی ماسٹر ہیں۔ راستے میں انہوں نے اپنے "وسیع و عریض" تجربے کی بنا پر مجھے اپنی "بیش بہا" نصیحتوں سے نوازا۔ انہوں نے مجھے کامیاب زندگی گزارنے کا گُر یوں بتایا کہ ماتحت کو دو جملے اچھی طرح ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔ ایک "بھُلّا جی" اور دوسرا "بھَلّا جی"۔ بھُلّا جی سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی ملازم کی کوئی ادا بڑے صاحب کو پسند نہ آئے اور وہ اپنی خفگی کا اظہار کرنے لگے تو ماتحت پر لازم ہے کہ وہ طیش کھانے اور بحث میں الجھنے کی بجائے بھُلّا جی (SORRY, SIR) کہہ کر اپنی جان چھڑا لے۔ اور اس کے برعکس اگر صاحب بہادر کسی موقع پر ماتحت کے کام سے خوش ہو کر اس کے کام کی تعریف کر دیں تو ایسے موقعوں پر لازم ہے کہ وہ صاحب بہادر کو "بھَلّا جی" (THANK YOU, SIR) کہنا کبھی نہ بھولے۔ میں نے موصوف کی نصیحتیں اپنے پلے میں باندھ لیں اور انہیں یقین دلایا کہ زندگی بھر ان پر عمل کرتا رہوں گا۔

میں نے شروع میں چند ہفتے منشی علی محمد صاحب کی بیٹھک میں قیام کیا۔ منشی صاحب اسی اسکول میں مدرس تھے

اور دیہاتی ماحول کے حوالے سے خاصے روشن خیال تھے۔ ان کی ایک بیٹی لڑکوں کے اسکول میں پڑھتی تھی۔ آج آپ کو یہ بات شائد عجیب نہ دکھائی دے، مگر ۱۹۵۰-۵۱ء کے جس دیہاتی ماحول کی بات کر رہا ہوں اس وقت یہ بات حد درجہ حیران کن تھی۔ منشی صاحب کے دوسرے بچے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میں نے ان کے ہاں تھوڑے ہی دن قیام کیا تھا کہ مجھے ہول سا اٹھنے لگا۔ منشی صاحب مقامی سیاست میں الجھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے ان کے ہاں زیادہ عرصہ قیام کیا تو ان کے مخالف مجھے بھی سیاست میں الجھا دیں گے۔ عافیت اسی میں جانی کہ میں وہاں سے کنارہ کش ہو جاؤں۔

اتفاق سے ان دنوں ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کا تقرر ہونے والا تھا۔ اس سے پہلے کئی سال سے یہ فریضہ اسی علاقے کے ایک استاد ملک ساول خان سر انجام دے رہے تھے، اور ہوسٹل سے انہیں دلی لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب بھی انہیں بہت چاہتے تھے۔ مگر قواعد کے اعتبار سے ہائی اسکول کا بورڈنگ ماسٹر صرف وہی استاد مقرر کیا جا سکتا تھا جو سینیئر اسٹاف سے تعلق رکھتا ہو۔ ملک ساول یہ شرط پوری نہ کرتے تھے، کہ وہ صرف ایس وی ٹیچر تھے۔

میرے آنے سے قبل ہائی کلاسوں کی ریاضی بھی ان کے ذمّے تھی ۔ اب یہ کلاسیں بھی ان سے لے کر میرے سپرد کی گئیں ۔ ملک صاحب نے ان فیصلوں پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ۔ ہیڈ ماسٹر کے خلاف تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے کہ وہ ان کے خاص نیاز مند تھے ۔ البتہ انہوں نے اپنی توپوں کا رُخ میری جانب موڑ دیا ۔ انہوں نے میرے خلاف جی بھر کر مُنافرت پھیلانے کی کوشش کی ۔ مگر خدا کا شکر ہے، ان کے سارے ہتھکنڈے دھرے کے دھرے رہ گئے ۔

خیر ۔ اُدھر ٹائم ٹیبل میں مجھے نویں، دسویں جماعت کی انگریزی اور ریاضی سپرد کی گئی ۔ انگریزی کے بارے میں تو مجھے چنداں پریشانی نہ تھی ۔ ہلکی سی تیاری کے بعد کام چل جائے گا ۔ البتہ ریاضی کا معاملہ خاصا ٹیڑھا اور پیچیدہ تھا ۔ دسویں کے طلبا حساب، الجبرا، جیومیٹری کا کورس ختم کر چکے تھے ۔ اور اب درسی ماڈل ٹیسٹ پیپروں کی مدد سے سارے کورس کی دہرائی جاری تھی میرے لئے یہ مشکل ترین مرحلہ تھا ۔ اب "کام اور وقت" کا سوال حل کرنا مقصود ہے ۔ تو عین ممکن ہے اگلا سوال "اوسط" سے متعلق ہو ۔ الجبرے میں ابھی (FACTORS سے نبرد آزمائی ہو رہی ہے ۔ تو ہو سکتا ہے اگلا

سوال SURDS یا INDICES سے تعلق رکھتا ہو۔ جیومیٹری میں ابھی THEORAMS اگلی ساعت میں EXERCISES بات یہ تھی کہ ٹیسٹ پیپرز صرف وہی استاد حل کرا سکتا تھا، جس کی ریاضی کے ہر قاعدے پر اپنی مضبوط گرفت ہو۔ اُدھر میں نے ریاضی کی تعلیم صرف میٹرک تک پائی تھی۔ بی۔ ٹی میں بس یونہی تدریس ریاضی کے نظری پہلوؤں پر بحث کی گئی تھی۔ میں اس مضمون کو تقریباً بُھلا چکا تھا۔ اور اب چُھوٹتے ہی سر پر ایسا ہتھوڑا آن پڑا تھا کہ میں سناٹے میں آگیا تھا۔ جگ ہنسائی کا خوف بھی دامنگیر تھا۔ اُدھر ملک ساول خان کی "کرم فرمائیاں" بھی اپنا جلوہ دکھا رہی تھیں۔

تو پیارے قارئین! سنیئے۔ ہم نے پھر ان کانٹوں سے نباہ کیونکر کیا۔

میں نے اسکول اوقات کے بعد حساب، الجبرا اور جیومیٹری کی تینوں کتب اور درسی ماڈل ٹیسٹ پیپرز ایک ساتھ پڑھنا شروع کردیئے۔ میرا طریق یہ تھا کہ ٹیسٹ پیپرز سے دیکھتا، پہلا سوال کس قاعدے سے متعلق ہے، پھر اسی قاعدے سے متعلق میں ریاضی کی کتب CONSULT کرتا اور اس طرح پورے قاعدے کو

سمجھنے کی کوشش کرتا۔ پھر دوسرے سوال کے ساتھ بھی یہی عمل دہرایا جاتا۔ اس طرح میں ٹیسٹ پیپرز کے ایسے تمام متعلقہ سوال حل کر لیتا جنہیں مجھے اوسطاً ایک دن میں دس، بارہ قاعدے سیکھنے پڑتے۔ اس عمل میں میری راتوں کی نیندیں ریاضی کے قواعد کی نذر ہو جاتیں۔ میں کسی رات ایک بجے سوتا، کسی رات دو بجے۔ میں نے اپنے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ خواہ ساری رات آنکھوں میں کیوں نہ کٹ جائے، سبق تیار کئے بغیر آرام کا نام تک نہ لوں گا۔

ویسے اس شب و روز کی محنت کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ پورے اسکول میں میری قابلیت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر ملک اللہ بخش نے مجھے بلا کر تھپکی دی اور فرمایا: سرور صاحب! ہم تو سمجھے تھے کہ آپ ریاضی کے ساتھ شاید انصاف نہ کر سکیں۔ مگر آپ نے تو کمال ہی کر دکھایا۔ آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ پھر میں نے جب اپنا "راز" فاش کیا تو وہ بہت متاثر ہوئے اور میری سالانہ رپورٹ میں انہوں نے بطورِ خاص میری محنت اور لگن کی تعریف کی۔

میں نے دسویں کلاس کو جب اپنی خصوصی توجہ کا مرکز

بنایا۔ تو یہ جان کر میری خوشگوار حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان میں بے شمار جوہر قابل موجود تھے۔ جن کی تخلیقی توانائیاں محض اس لئے ضائع ہو رہی تھیں کہ انہیں اعلیٰ تعلیم کی مناسب سہولتیں میسر نہ تھیں۔ گرے نے سچ ہی تو کہا ہے:

FULL MANY A GEM OF PUREST SLAY SERENE. THE
DARK UNFATHONED CAVES OF OCEAN BEAR.
FULL MANY A FLOWER IS BORN TO BLUSH
UNSEEN. AND WASTE ITS SWEETNESS ON THE
DESERT AIR.

برادرِ عزیز ضیا نے آٹھویں جماعت کا امتحان کونتریلہ اسکول سے ہی پاس کر لیا تھا۔ اب میں اسے اپنے ہمراہ بوچھال کلاں لے آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ضیا اپنی خداداد ذہانت کی بدولت بوچھال کلاں کے ماحول پر چھا جائے گا۔ مگر وہاں اسے زبردست مقابلے سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے ہم مکتب ایسے ذہین اور ہونہار ساتھی تھے جو بعد میں عملی زندگی میں بہت مشہور ہوئے۔ آپ اردو اور پنجابی کے مشہور شاعر ماجد صدیقی کے نام سے تو ضرور واقف ہوں گے۔ ابھی پچھلے صفحوں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ یہ صاحب میرے شاگرد تھے۔ اور ضیا کے کلاس فیلو۔

اس کے علاوہ کیپٹن (نیوی) افضل ملک، میجر ڈاکٹر عبدالرحمٰن، پروفیسر بقا الرسول اور اس طرح کے دوسرے کئی ایسے طالب علم تھے جو حد درجہ ذہین، حد درجہ قابل تھے۔

اسٹاف کی حالت شروع شروع میں بڑی "پتلی" تھی مگر بعد میں حسنِ اتفاق سے وہاں ایسے اساتذہ ایک ساتھ جمع ہو گئے، جن کی قابلیت اپنے اپنے شعبوں میں مسلّم تھی۔ ذرا دیکھئے۔ جس دُور افتادہ اسکول کو علی عباس جلالپوری جیسا نامور فلسفی اور محقّق میسّر آجائے، وہ اپنے نصیبوں پر کیوں نازاں نہ ہو۔ ان کے علاوہ اسکول اسٹاف پر ساجد علوی (مشہور شاعر)، قاضی غلام معبود (آپ ان سے متعارف ہیں ہی)، شیخ غازی احمد (نومسلم بیسوں دینی کتابوں کے مصنف)، خواجہ غلام جعفر (معروف تاریخ دان)، نعیم قریشی کے نام ہمیں جگمگاتے دکھائی دیتے ہیں۔

اس "حسنِ اتفاق" کے بہت مثبت نتائج برآمد ہوئے اسکول تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ اور اس کا شمار ضلع بھر کے چوٹی کے اداروں میں ہونے لگا۔

اور پھر یوں ہوا کہ موتیوں کا یہ ہار ٹوٹنے لگا۔ ایک ایک کرکے تمام اساتذہ کے تبادلے عمل میں آ گئے۔ کوئی یہاں گِرا، کوئی وہاں گِرا۔ میں نے مشکل سے ایک سال گزارا ہوگا کہ میرے تبادلے کے احکامات ہائی اسکول کھاریاں کے لئے جاری ہو گئے۔ ویسے آپ سے کیا پردہ۔ میں نے بوچھال کلاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہاں جی نہیں لگتا تھا۔

اور اب کھاریاں چلنے سے پہلے ذرا نعیم قریشی سے دو دو باتیں کر لیں۔

یہ حضرت پیدائشی فلسفی واقع ہوئے تھے۔ ان کے اندر سادگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ صحیح معنوں میں قلندر تھے۔ طبیعت میں عجیب قسم کی بے قراری پائی جاتی تھی جو اُنہیں کسی طور نچلا بیٹھنے نہیں دیتی تھی۔ لباس کے معاملے میں بڑے بے نیاز واقع ہوئے تھے۔ جو جی میں آیا پہن لیا۔ چشمِ غیر کی ستم ظریفیوں کو وہ ہرگز خاطر میں نہ لاتے۔ خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی خاصے "غیر معتدل" واقع ہوئے تھے۔ پڑھنے بیٹھتے تو وقت کی قیود سے بے نیاز ہوجاتے۔ موڈ نہ بنتا تو کئی کئی دن کتاب کو بھول کر ہاتھ نہ لگاتے۔ من کی موج پر سدا لبیک کہتے۔

ایک رات، کھانے سے فارغ ہوکر وہ ہارڈی HARDY

کے ناول JUDE THE OBSCURE کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ میں ساتھ والے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ صبح اٹھا تو دیکھا، نعیم ہنوز مطالعے میں مصروف ہیں۔ کتاب ختم ہونے کو ہے اور "کتاب خواں" کے چہرے پر یاسیت ہویدا ہے۔ میں دبے پاؤں لوٹ آیا۔ نعیم مطالعہ میں مصروف ہوں تو انہیں "دخل در معقولات" ناگوار گزرتا۔ میں اُن کی اس عادت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسکول جانے کا وقت قریب تھا اور نعیم محویت کے عالم میں مطالعہ میں گم۔ میں تیار ہو کر اسکول پہنچ گیا اور یہ حضرت کوئی دو گھنٹے بعد جھومتے جھامتے اسٹاف روم میں آ دھمکے۔ ان کی آنکھوں میں خمار کی کیفیت نمایاں تھی۔ کرب اور بے خوابی کے اثرات بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت! کیا بات ہے۔ آج رات تو آپ پل بھر کے لئے بھی نہیں سوئے۔ بولے۔ سرور بھائی! کیا پوچھتے ہو اس ظالم ہارڈی (HARDY) نے تو آج مجھے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ JUDE ابھی ابھی ختم کر کے اٹھا ہوں اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا کلیجہ پھٹ گیا ہو۔

پھر انہوں نے ناول کا پس منظر بیان کیا۔ اور مجھے

تلقین کی کہ میں بھی اس کتاب کو ضرور پڑھوں اور پھر اپنے تاثرات
سے انہیں آگاہ کروں۔ جی ہاں، میں نے ارشاد کی صرف تعمیل
ہی نہ کی بلکہ دو قدم آگے ہی نکل گیا۔ میں نے JUDE ختم کیا تو
"TESS" کی باری آگئی پھر "A PAIR OF BLUE EYES
اور FAR UNDER THE GREENWOOD TREES FROM THE MADDING
CROWD" اور دوسرے ناولوں کا ایک ایک کر کے مطالعہ کیا۔
HARDY پڑھتے وقت مجھے ہمیشہ یوں محسوس ہوا جیسے میں سوئی
کے ناکے سے نکل رہا ہوں۔ اس کی تمام تخلیقات اپنے
قاری پر عجب وارفتگی کی کیفیت مرتب کرتی ہیں۔ میرا تاثر یہ ہے
کہ زندگی کی بے بسی اور بے بضاعتی کا جو گہرا احساس ہارڈی کے
مطالعے کے بعد ابھرتا ہے، اُس کے اثرات بڑے دیرپا ہوتے
ہیں۔ قاری یوں محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس آزمائش گاہ میں
جھونک کر فطرت کی بے رحم قوتیں اس کے اعصاب کو شل کر دینا
چاہتی ہیں۔ حادثاتِ زمانہ (CHANCE) کی ہولناک تباہ کاریوں
کی تفصیل پڑھ کر قاری سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، کہ فطرت کا
غیر محسوس ہاتھ، عین اس وقت جبکہ لبِ بام دو چار ہاتھ رہ
جاتا ہے، آگے بڑھ کر مسرت و شادمانی کی کیفیت کو زیر و زبر
کر کے رکھ دیتا ہے اور بے بس اور ستم زدہ انسان اس نتیجہ پر
پہنچتا ہے کہ ناحق اِس پر مختاری کی تہمت دھری جا رہی ہے

اسے تو اپنے کسی فیصلے پر کوئی اختیار نہیں۔

میرے خمیر میں غم کی آمیزش کچھ زیادہ ہی ہے۔ ہارڈی نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور مجھے اس کے روپ میں اپنا ایک آئیڈیل (IDEAL) مل گیا جس کی ہر بات کو میں حجت کا مقام دینے لگا۔ میں حد درجہ کلبیت اور بے یقینی کا شکار ہو گیا اور ایقان و ایمان کا دامن میرے ہاتھوں سے سرکنے لگا۔ آزمائش کی تپتی ہوئی کٹھالی سے گزرنے اور جان لیوا اعصابی تشنج سے دوچار ہونے کی "سعادت" نصیب ہونے والی تھی۔

حساس لوگوں کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ زندگی کا بوجھ اٹھانا انہیں دوبھر دکھائی دیتا ہے۔ ہارڈی کا انسان تو ایک تابع مہمل ہے جسے اپنے ارادے پر کوئی اختیار نہیں۔ جذباتی طور پر اس نقطہ نظر سے کلی اتفاق کے باوجود میں نے قرآن کے حوالے سے جبر و قدر کے مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہا۔

ذہنی انتشار اور فکری گمراہی کے باوجود میرے خمیر میں الہی قوت کی کچھ رمق باقی رہ گئی تھی۔ اور اسی قوت کی تحریک پر میں نے ہارڈی کے خیالات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا چاہا اور پھر آہستہ آہستہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر ہم ہارڈی کے تصور حیات پر ایمان لے آئیں تو لامحالہ ہمیں انسان کو محض کٹھ پتلی تسلیم کرنا پڑے گا

جیسے کوئی اور نچا رہا ہو اور پھر پتھر، لوہے، درخت، جانور اور انسان میں کوئی حقیقی فرق باقی نہ رہے گا۔ اختیار نہ اُن کو حاصل ہے نہ انسان کو۔ پھر انسان اشرف المخلوقات کیسے ٹھہرا؟ سچ بات تو یہ ہے اب مجھے ہارڈی کے محکوم و مجبوس انسان پر ترس آنے لگا۔

لیکن محض ترس کھانے سے میری الجھن دُور نہ ہو سکی۔ مجھے تو اس مسئلہ کا مثبت حل درکار تھا۔ میں نے قرآنِ پاک کا دامن مضبوطی سے تھام کر اپنی الجھن اور پریشانی کا ازالہ کرنا چاہا۔

اور پھر اللہ نے میری مشکل آسان کر دی اور مجھ پر یہ راز فاش ہوا کہ انسان نہ تابع مہمل ہے نہ مختارِ کل۔ حقیقت ان کے درمیان ہے۔ جو زبردست ارادہ کائنات کے اس نظام کو چلا رہا ہے اس سے آزاد ہو کر کوئی چیز دنیا میں کام نہیں کر سکتی۔ کسی میں اتنی مجال نہیں کہ اس اسکیم کے خلاف چل سکے یا اس کو بدل سکے یا اس پر کوئی اثر ڈال سکے۔

اور پھر میرے مطالعہ میں جوں جوں پختگی آتی گئی، مجھے یقین ہونے لگا کہ اس کائنات کی تدبیر و انتظام میں انتہا درجہ کی سنجیدگی ہے۔ مذاق اور کھیل تمسخر کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا حقیقت یہی ہے کہ فی الواقع ہم کو یہاں ایک محدود

پیمانے پر بھی کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہم کسی حد تک آزاد بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ آزادی حاصل کی ہوئی نہیں ہے، بلکہ دی ہوئی ہے۔ کائنات کی عالمگیر اسکیم میں ہمارے لئے یہی جگہ تجویز کی گئی ہے کہ ہم ایک محدود پیمانہ پر آزادانہ کام کرنے والے ایکٹر کا پارٹ ادا کریں۔

اتنا کچھ جان لینے کے بعد ظاہر بات ہے، ہارڈی کے "ملفوظات" سے مجھے کیا عقیدت باقی رہ سکتی تھی۔ نعیم صاحب سے میں نے عرض کیا کہ میں تو ہارڈی کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کرنے سے تائب ہو گیا ہوں۔ تو بولے۔ ناہنجار! تو کسی ملّا کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔ میں نے بحث میں الجھنے سے اجتناب برتا۔ مگر الحمد للہ! میں پورے اطمینان کے ساتھ یہ حقیقت قبول کر چکا تھا کہ مذہب اسلام ہمیں ایک طرف قادرِ مطلق خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اور ہمارے گرد و پیش کی ساری دنیا خدا کی محکوم ہے اور اس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے تو دوسری طرف وہ ہم کو اخلاق کے تصورات دیتا ہے، نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم ایک راستہ اختیار کریں گے تو ہمیں نجات حاصل ہوگی اور دوسرے راستہ پر

چلیں گے تو ہم کو سزا دی جائے گی۔ یہ بات صرف اسی صورت میں معقول ہو سکتی ہے کہ ہم واقعی اپنے اختیار سے اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں۔

ہارڈی کے خیالات نے مجھے گمراہ کرنا چاہا، مگر اللہ پاک کا کرم ہے مجھے اسی واسطے سے حق کا سراغ مِل گیا۔ کسی نے سچ کہا:

"EVEN THE DARKEST CLOUDS HAVE SILVER LININGS."

بوچھال کلاں میں نعیم قریشی کی صحبت میرے لئے نعمتِ غیر مترقّبہ ثابت ہوئی۔ میرے اندر انگریزی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنے میں نعیم صاحب نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہارڈی سے میرا تعارف انہیں کی وساطت سے ہوا۔ افسوس، میری اور اُن کی رفاقت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ بوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد۔

باب — ۱۳

بوچھال کلاں سے کھاریاں تک

میں نے دسمبر ۱۹۵۲ء کی اٹھارہ تاریخ کو کھاریاں ہائی اسکول میں چارج سنبھالا۔ اُس زمانے میں عبدالروف ہاشمی (مرحوم) ہیڈ ماسٹر تھے۔ مرحوم بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے اور مجھے ہر قسم کے تعاون کا یقین دلایا۔ مرحوم مُتضاد صفات کے مالک تھے۔ گاہے بریشم کی طرح نرم، گاہے فولاد کی مانند سخت۔ لوگ ان سے اکثر خائف رہتے، جانے کس وقت ان کے مزاج برہم ہو جائیں۔ ہنسنے پہ آتے تو تمام محفل کشتِ زعفران بن جاتی۔ بگڑنے پہ آتے تو ان کے منہ سے آگ اور آنکھوں سے شعلے برسنے لگتے۔ ایسے متلون مزاج انسان میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔

ہاشمی صاحب اعلیٰ درجے کی انتظامی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔ علاقے کے عمائدین سے ان کے مراسم بڑے خوشگوار تھے۔ وہ ہر شخص کے وزن اور اس کے قد کاٹھ سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اساتذہ میں سے ایک حلقہ ان کے بہت قریب تھا۔ یادش بخیر۔ کاظمی صاحب، ریاض صاحب، غنی صاحب اور شاکر صاحب کے درجات بہت بلند تھے۔ باقی اساتذہ سے ان کے مراسم بس گوارا سے تھے۔

میں نے کھاریاں اسکول میں رپورٹ کی تو چند دنوں بعد ایک اور استاد ملک سلیم اختر کی تقرری عمل میں آ گئی۔ یہ حضرت، بی ٹی کے زمانے میں میرے ہم مکتب رہ چکے تھے۔ میں نے سوچا۔ خوب گزرے گی ،.... اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میری اور سلیم اختر کی رفاقت مثالی حیثیت حاصل کر گئی۔ ہم دونوں انتہائی محنت اور لگن سے اپنے فرائض سرانجام دیتے۔ تمام اسکول میں ہم دونوں کی قابلیت کا چرچا ہونے لگا۔

ہاشمی صاحب مجھے ہمیشہ شفقت اور پیار کی نظروں سے دیکھتے۔ میں دسویں جماعت کو انگریزی اور ریاضی پڑھایا کرتا۔ ہاشمی صاحب بھری محفل میں میری بھرپور تعریف فرمایا کرتے۔ اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوتی۔ طلبا کے ساتھ

میرا برتاؤ بڑا جمہوری تھا۔ میں بچوں پر تشدد کرنے کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک جور و جبر کا برتاؤ بچے کی شخصیت کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوتا ہے۔ بچے کو اگر تشدد کا شکار بنا دیا جائے تو اس کی قوتِ نمو کملا جاتی ہے۔ اس کی فکری اور تخلیقی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں اور وہ ہمیشہ کے لئے احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ افسوس، ہمارے اساتذہ کی غالب اکثریت اس بنیادی نکتے کی اہمیت سے بے خبر ہے۔ اور وہ آج کے اس مہذب دور میں بھی "لِتّر پریڈ" پر عمل پیرا ہے۔ "جوتوں" کے سائے میں پلنے والے جوانوں سے کسی فکری انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

میں عرض کر رہا تھا کہ بچوں کے ساتھ میرا سلوک مشفقانہ ہوا کرتا۔ میں اپنے اور اپنے شاگردوں کے درمیان اجنبیت اور غیریت کے کسی پردے کو حائل ہونے کا کوئی موقع نہ دیتا اور درس و تدریس کے لئے ذہنی ہم آہنگی اور فکری یکسوئی کی فضا فراہم کرتا۔ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوتے۔ بچے دل و جان سے اپنے سبق میں دلچسپی لیتے۔ جستجو اور تلاش کا جذبہ بھی ان کے اندر ابھرتا دکھائی دیتا۔ میں اپنے طریق تدریس پر نازاں تھا۔ مگر میرے چند ساتھی مجھ سے خفا تھے۔ ان کا خیال تھا، لاتوں کے بھوت باتوں

سے نہیں مانتے۔ وہ مجھے یہی تلقین کرتے کہ بچّوں کے ساتھ اتنی بے تکلفی ٹھیک نہیں۔ انہیں "کھینچ" کر رکھنا چاہئے میں ان کی بات سُنی، اَن سُنی کر دیتا۔ ہاشمی صاحب میرے طریق کار سے البتہ مطمئن تھے۔ انہوں نے میرے کام میں کبھی دخل نہیں دیا۔

ہاں تو بات بچّوں کے ساتھ "دوستی" کی ہو رہی تھی۔ اس سلسلے میں عرض کرتا چلوں کہ میری کلاس میں کبھی کسی بچّے نے گستاخی اور بدتمیزی کی جرأت نہیں کی۔ وہ مکمل سپردگی کے ساتھ میری خواہشات کا احترام کرتے۔ میرے پڑھائے ہوئے اسباق کو وہ حرزِ جان بنا لیتے اور کلاس سے کبھی غیر حاضر نہ ہوتے۔ کسی دن میں اسکول سے چھٹی کرتا تو وہ سخت بے قرار ہو جاتے۔ اگلی صبح مجھے دیکھ لیتے، تو انہیں اطمینان نصیب ہوتا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک سال کے قیام کے بعد جب کھاریاں سے میرا تبادلہ ہوا تو لڑکوں نے مجھے پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا تھا۔

اور جس بس میں، میں سوار ہوا، اسے بھی دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ بس میں سوار دوسرے مسافر حیران تھے۔ یہ کس "پیر صاحب" کی سواری جا رہی ہے جس کے لئے اتنا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے۔ کچھ جذباتی بچّوں نے تو دیوار سے سر ٹکرا کر اپنے آپ کو زخمی کر ڈالا۔ چند ایک "عقیدت مند"

بس کے آگے سڑک پر دراز ہو گئے اور چیخ چیخ کر پکارنے لگے کہ سرورؔ صاحب کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ سود و زیاں کے پیمانوں سے ہر چیز ناپنے والوں کو یہ حرکتیں شاید احمقانہ دکھائی دیں۔ مگر جذب و شوق کی لُغت میں ان کا مقام ہی اور ہے۔ گلاب کی خوشبو کو ترازو میں تولنے والے ان کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

میں شدتِ جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہو کر ایسی باتیں کہہ گیا ہوں، جنہیں تعلّی اور پندار پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ستائی کے روگ سے محفوظ رکھے۔ یہ بلائے بے درماں جس سے ایک بار چپک گئی، سمجھ لیجئے اس کی اخلاقی موت واقع ہو گئی۔ میں ہمیشہ شعوری طور پر اس سے اجتناب کی پوری کوشش کرتا ہوں۔

قارئین! بات ہیڈ ماسٹر رؤف ہاشمی صاحب کی ہو رہی تھی کہ میں اپنی ذات کے پیچ و خم کی سیاحت کرنے لگا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ہاشمی صاحب باتوں کے بڑے دھنی تھے۔ بولتے تو محفل پر ان کی گھن گرج کا سکہ بیٹھ جاتا۔ اکثر اوقات صبح کی اسمبلی سے خطاب فرماتے۔ مجھے اس ضمن میں رمضان شریف کی ایک صُبح کبھی نہیں بھولے گی۔ میں اپنے گھر سے نکل کر سکول آ رہا تھا۔ راستے میں ان کے صاحبزادے

سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ میں نے پوچھا۔ ابو کیا کر رہے ہیں۔ مصلحت کے تقاضوں سے بے نیاز، معصوم بچہ بولا۔ سر! ابو ناشتہ کر رہے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں اسکول آنے ہی والے ہیں۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد ہاشمی صاحب کی تقریر دلپذیر یوں شروع ہوتی ہے پیارے بچو! اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر روزے فرض کئے ہیں، جس طرح پہلی اُمتوں پر فرض کئے گئے تھے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یاد رکھو۔ روزے کا تارک جہنمی ہے۔ قیامت کے روز اسے سخت ترین عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا؟

ہاشمی صاحب کے ارشادات جاری تھے۔ اُدھر میرے کانوں میں ان کے بیٹے کی صدا گونج رہی تھی... ابو ناشتہ کر رہے ہیں۔

کھاریاں اسکول میں ہمارے ایک رفیقِ کار تھے۔ سیّد بشیر حسین شاہ۔ ضلع گجرات سے تعلق رکھتے تھے۔ غالباً ہیڈ رسول کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے ریاضی میں ایم اے کا امتحان پاس کر رکھا تھا۔ بے حد خاموش، متین اور سنجیدہ انسان تھے۔ ہر وقت گہری سوچ میں ڈوبے رہتے۔ کلاس روم میں داخل ہوتے تو لڑکے ان کا مذاق اڑاتے۔ بولتے، تو کچھ ایسے دھیمے انداز میں کہ ان کی بات کسی کے پلّے

نہ پڑتی۔ ان کی شخصیت بڑی پُراسرار تھی۔ اسٹاف روم میں وہ کسی دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے کے قائل نہ تھے۔ کلاس سے فارغ ہوتے تو اپنی کرسی دھوپ میں بچھا کر سب سے الگ تھلک بیٹھے رہتے۔

البتہ سارے اسٹاف میں سے ان کے صرف ایک معتمدِ خاص تھے جن کا نام تھا، چوہدری اسلم۔ ان کا شمار اُن کے "خلیفوں" میں ہوتا تھا۔ آپ شاید خلیفہ کے لفظ پر مسکرا دیں، میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ سید بشیر حسین شاہ اپنے آپ کو مہدی موعود سمجھتے تھے۔ اور اس امر کا انہوں نے باضابطہ اعلان بھی کر رکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے، لوگ بیعت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے کچھ ایسے بے چین نہیں تھے۔

اللہ میاں کی اس وسیع و عریض سرزمین میں انہیں ایک ہی خلیفہ ملا تھا..... اور وہ تھا، چوہدری اسلم جو ہر لحظہ شاہ صاحب کے "معجزات" گنوانے میں مصروف دکھائی دیتا۔ اسلم صاحب کا کہنا تھا کہ شاہ صاحب کی پیٹھ پر "مہرِ امامت" ثبت ہے، جو چاہے دیکھ لے۔ لیکن "بے یقین عوام" ان کی بات ہنسی میں اڑا دیتے۔

ویسے، شاہ صاحب کی "امامت" گاہے گاہے اپنا جلوہ دکھاتی۔ وہ باآوازِ بلند "بھٹکے ہوئے عوام"

کو اپنی "دعوتِ حق" سے نوازتے۔ انہوں نے بہت سے تبلیغی پمفلٹ بھی تیار کر رکھے تھے جس میں انہوں نے اپنے "ورودِ مسعود" کی جملہ تفصیلات درج کر رکھی تھیں۔ دوزخ اور جنت کے بارے میں ان کے مخصوص نظریات تھے۔ فرماتے۔ دوزخ اور جنت کا روایتی تصور محض خیالی ہے۔ (نقل کفر، کفر نباشد)۔ ان کے نزدیک خوشحالی اور آسودگی سے بہرہ مند قومیں جنت میں بس رہی ہیں، جبکہ غربت اور افلاس کے شکنجے میں کسی ہوئی قومیں جہنم کی آگ میں بھسم ہو رہی ہیں۔

"مہدی موعود" تبلیغ کا کام وسیع پیمانے پر پھیلانا چاہتے تھے۔ اس کام کے لئے وہ شہزادی مارگریٹ کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ "محترمہ" کے نام بڑے تفصیلی خطوط لکھا کرتے تھے۔ اور اسے "دعوتِ حق" سے نوازنے کے بعد تلقین کرتے کہ وہ ان کی امامت پر ایمان لے آئے۔ خطوط کا جواب نہ پاکر وہ اپنے پیغامات بذریعہ تار بھجواتے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ وہ کال بک کرانے کے بعد پہروں انتظار کرتے دیکھے گئے۔ ایک بار وہ گردن جھکا کر "تصویرِ یار" دیکھنے میں منہمک تھے کہ پولیس والوں نے نازل ہو کر انہیں دھر لیا۔ اور پھر انہیں دماغی امراض کے ہسپتال کا مہمان بھی بننا پڑا۔

اپنے "نزول" کی جملہ نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرماتے:

"صاحبو! یقین جانو۔ میں مہدی ہوں۔ میں وہ تمام شرائط پوری کر رہا ہوں جن کا ذکر آپ کو حدیث کی کتابوں میں ملتا ہے۔۔ بجلی کے جو فلک بوس کھمبے آپ کو دکھائی دے رہے ہیں، ان پر میرا نزول وقوع پذیر ہوا!"

ہم نے "مہدی موعود" کے ملفوظات آپ کو سنا دیئے۔
اب کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

میں نے کھاریاں میں قیام کے دوران ایم اے انگریزی کا مطالعہ جاری رکھا۔ سلیم اختر ملک، دیال سنگھ کالج لاہور میں ایم۔ اے۔ انگریزی کی کلاسیں ATTEND کر چکے تھے۔ گو، امتحان پاس کرنے کی "غلطی" ان سے سرزد نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے ازراہِ کرم اپنی کتب اور نوٹس میرے حوالے کر دیئے جن سے میں نے بھرپور استفادہ کیا۔ انگریزی ادبیات کا تمام کورس، سلیم کی نظروں سے گزر چکا تھا۔ وہ کئی مقامات پر میری رہنمائی بھی کرتے۔ میں نے ان کے احسان کو ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

میرے مالی حالات اُس زمانے میں خاصے پریشان تھے۔ کل تنخواہ ایک سو ساٹھ ١٦٠ روپے ماہوار ملا کرتی۔ میں

نصف رقم کے لگ بھگ والد صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ باقی رقم اپنے تصرف میں لاتا۔ اُس زمانے میں ہمارا کنبہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ راقم الحروف، بیگم، برادرِ عزیز ضیاء اور شوکت (چچا زاد بھائی)۔ بیٹی شفقت خالدہ، ماں کی گود میں کھیل رہی تھی۔ اُس کو شامل کریں تو ہو گئے ہم پانچ۔

ہم لوگ پہلے ایک ایسے مکان میں مقیم تھے جو کافی کشادہ اور ہوا دار تھا۔ اُس کا ماہوار کرایہ آٹھ روپے تھا۔ یہ رقم ادا کرنا میرے لئے بڑا مشکل تھا۔ اس لئے ہم لوگ پڑوس میں واقع ایک اور چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے جس کا ماہوار کرایہ صرف دو ۲ روپے تھا۔ یہ گھر ہمارے لئے بڑا تکلیف دہ ثابت ہوا۔ گرمیوں میں تو رہائش کے قابل ہی نہ تھا۔ دیواریں تنور کی مانند گرم۔ پانی کی قلت۔ ہوا اور روشنی مفقود۔ جون، جولائی کے روزے بھی ہم نے اسی آگ میں جھلستے ہوئے گزارے۔ اُن دنوں کی یاد آتی ہے تو اب بھی دل ڈوبنے لگتا ہے۔

ہاشمی صاحب کے زیرِ سایہ میں نے چند ماہ ہی گزارے ہوں گے کہ ان کی ریٹائرمنٹ عمل میں آ گئی۔ ان کی جگہ دین محمد فاخر صاحب نے چارج سنبھالا۔ ہماری خوش قسمتی۔ وہ اعلیٰ پایہ کے شاعر نکلے۔ صوفی منش بزرگ تھے۔ سادگی

اور خلوص کا پیکر۔ موصوف اُس زمانے میں قرآنِ حکیم کے منظوم ترجمے میں مصروف تھے۔ گاہے گاہے مجھے اس کتابِ ہدایت کے منظوم حصّے سننے کی سعادت نصیب ہوتی۔ فاخر صاحب سے تصوّف کے موضوع پر بھی سیر حاصل بحث ہوا کرتی۔ موصوف کا تصوّف بڑا مُثبت اور صحت مندانہ تھا۔ وہ بیمار تصوّف کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تصوّف کا اسلامی تصوّر تو متحرک، فعال اور صحت مندانہ قدروں سے عبارت ہے۔ یاسیت، قنوطیت اور مردم بیزاری کا اسلامی تصوّف سے کوئی علاقہ نہیں۔ در اصل تصوّف کے اس منفی تصوّر نے ہی ملّتِ اسلامیہ سے قوتِ نمو سلب کر لی ہے اور ان کی سرگرمیوں کو حجروں اور خانقاہوں تک محدود کر ڈالا ہے۔ فاخر صاحب حضرت مولانا رومؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ کے مقلّد تھے۔ مثنوی کے بارے میں تو انہیں پورا یقین تھا "ہست قرآں در زبان پہلوی"۔ علامہ مرحوم سے بھی انہیں گہری عقیدت تھی۔ احیائے اسلام کے لئے مرحوم کی کوششوں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھتے۔ فرماتے: برِّ صغیر کے مسلمانوں کی خوش بختی ہے کہ انہیں علامہ جیسا مردِ خود آگاہ نصیب ہوا۔ فاخر صاحب بجا طور پر کہا کرتے کہ علامہ اقبال کی شاعری نے مغربی افکار کے بپھرے

ہوئے تند و تیز ریلے کو روک رکھا ہے۔ اقبالؔ نہ ہوتے تو الحاد و زندقہ کی باطل قوتیں ہمارے "روشن خیال" طبقے کو اپنے رُخ پر بہا لے جاتیں۔ اور پھر ان کا ملّی تشخّص بھی ان لہروں کی نذر ہو جاتا۔ فاخر صاحب کی وساطت سے مجھے پہلی بار علم ہوا کہ علامہ اقبالؔ، عشقِ رسولؐ میں فنا کی حد تک جذب ہو چکے تھے۔ حضورؐ سرورِ کائنات سے علامہ مرحوم کی بے پایاں عقیدت میرے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی اور میں نے اپنے طور پر سیرتِ پاک کا مطالعہ شروع کیا۔ میں نے تاریخی عوامل کی روشنی میں محسنِ انسانیت کے مقام کو پہچاننے کی کوشش شروع کر دی۔ مطالعے کے دوران مجھ پر یہ راز کھلا کہ حضورؐ کا ظہور ایسے حالات میں ہوا جب پوری انسانیت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی کہیں وحشت کا تسلّط تھا، کہیں شرک اور بُت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا۔ مصر اور ہندوستان، بابل اور نینوا، یونان اور چین میں تہذیب اپنی شمعیں گل کر چکی تھی۔ روم اور ایران میں تمدّن کے نام پر بدترین مظالم کا دور دورہ تھا۔ یونان کا فلسفہ سکتے میں تھا، کنفوشیس (CONFUCIUS) اور مانی کی تعلیم بے اثر ہو چکی تھی۔ ویدانت اور بدھ مت کے تصورات اور منو شاستر کے نکات

سربگریباں تھے۔ جسٹینین کا ضابطہ اور سولن کا قانون بے بس تھا۔ غرض، کسی طرف کوئی روشنی نہ تھی۔ عرب کی سرزمین پر دورِ وحشت کی رات چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف ایک انتشار تھا۔ انسان اور انسان کے درمیان تصادم کا بھیانک منظر۔

ان حالات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی نیّا کو طوفان کی موجوں سے نکالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ آپؐ نے بدی کے ہلاکت انگیز گردابوں سے لڑکر ساری اولادِ آدم کے لئے نجات کا راستہ کھولا۔ تمدّن کی کشتی کی پتوار سنبھالی اور اسے ساحل مراد کی جانب رواں کر دیا۔ آپ نے روم و ایران دونوں کو للکارا۔ آپ کے فدائیوں نے قیادت کے ان دونوں مدّعیوں سے مرعوب ہونے کے بجائے ان کے تخت الٹ دیئے۔ ٹھکرائے ہوئے اور کچلے ہوئے عوام کو اُس خوفناک تمدنی قفس سے نکال کر آزاد فضاؤں میں اڑان کا موقع فراہم کیا۔ محسنِ انسانیتؐ کے حضور لاکھوں سلام۔

سلسلۂ کلام کچھ طویل ہو گیا ہے۔ مگر اپنی ایک مجبوری ہے۔ حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر چل نکلے تو منطق کے آداب اور مصلحت کی گرفت سپر انداز ہو جاتی ہے۔ عشق کی بات چلی ہے تو آیئے۔ آپ کو پھر کھاریاں لئے چلتے ہیں جہاں فاخر صاحب کے حوالے سے قرآن کے منظوم ترجمے اور عشقِ رسول کی بات ہو رہی

تھی۔ فاخر صاحب کی زندگی ایک کھلی کتاب کی مانند تھی۔ ان کے قول و فعل میں کوئی تضاد دکھائی نہ دیتا تھا۔ خود حد درجہ محنتی اور باعمل انسان تھے اور دوسروں کو بھی سعی و عمل کی تلقین کرتے۔ ان کے عہد میں اسکول نے شہرت کی نئی بلندیوں کو چھوا۔ اسکول کے نتائج نہایت حوصلہ افزا تھے۔ فاخر صاحب صرف خیالی دنیا کے بسنے والے شاعر نہ تھے بلکہ عملی دنیا کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی پسند کا واحد معیار کام اور ان تھک کام تھا۔ محنتی استاد کی وہ دل و جان سے قدر کرتے۔ نکمے آدمی کو البتہ قریب پھٹکنے نہ دیتے۔ اس لحاظ سے وہ شمشیرِ برہنہ تھے۔ رکھ رکھاؤ اور مصلحتوں سے بالکل بے نیاز۔

میں نے کھاریاں قیام کے دوران انگریزی ادب کا مطالعہ جاری رکھا۔ مگر اس میدان میں کوئی نمایاں پیش رفت نہ ہوسکی۔ تدریسی مصروفیات بیچ میں حائل تھیں۔ مجھے ہر ہفتے چھتیس ۳۶ پیریڈ پڑھانا پڑتے۔ یہ ایک جان لیوا عمل تھا۔ مگر میں اس کام کو عبادت سمجھ کر سر انجام دیتا۔ اس سے میرا رزقِ حلال جو وابستہ تھا۔ بہرحال، فراغت کے لمحوں میں، میں انگریزی ادب کی گل چینی میں مصروف رہتا۔ انگریزی ادب بھی تو ایک

بحرِ بیکراں ہے۔ جتنی غواصی کرو، اسی نسبت سے گوہر مراد پاؤ۔

خیر۔ اس پر تفصیلی گفتگو اب چکوال جاکر کریں گے کہ وہاں کے لئے ہماری پوسٹنگ کے احکامات جاری ہو چکے ہیں۔

باب ـــــ ۱۴

جانب چکوال

مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ ٹھیک ایک سال بعد میرے کھاریاں سے چکوال تبادلہ کے احکامات موصول ہو گئے۔ میرے لئے یہ تبدیلی بے حد خوش آئند تھی۔ میرا آبائی گاؤں ..... سرگ ڈھن .... چکوال سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ آمد و رفت کی بھی خاصی سہولتیں میسّر تھیں۔ ان سب سے بڑھ کر خوشی کی بات یہ امید تھی کہ قیام چکوال کے دوران میں زیادہ یکسوئی کے ساتھ اپنا تعلیمی معیار بلند کر سکوں گا۔ اس سے پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میں اُن دنوں بی۔ اے۔ بی ایڈ تھا اور بحیثیت انگلش ماسٹر اپنے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔

میں نے کھاریاں سے روانگی سے قبل اپنے والدین کو سفر کے پروگرام سے مطلع کر دیا تھا۔ ان دنوں، اللہ بخشے، ابا، امی دونوں بقیدِ حیات تھے۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ اگر وہ اڈہ لاریاں پر (جو میرے گاؤں سے کوئی میل بھر فاصلے پر واقع ہے) تشریف لا سکیں تو میں ان کے نیاز حاصل کر سکوں گا۔ ایسا ہی ہوا۔ جب بس اڈہ سرگ ڈھن پر رُکی تو میں نے ابو، امی دونوں کو چشم براہ پایا۔ میں نے انہیں جُھک کر سلام کیا۔ دونوں نے بڑھ کر میری پیشانی کو چوما، میری پیٹھ پر تھپکی دی اور ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ امی جی پوچھنے لگیں۔ بیٹا! آج اس بس میں برات کس کی جا رہی ہے۔ تمہاری بس پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ میں یہ سنکر مسکرایا، اور عرض کیا۔ امی۔ برات ورات کسی کی نہیں۔ یہ تو "پُت تیرا لاری چڑھیا" کے موقع پر کھاریاں اسکول کے لڑکوں نے اس بس کو پھولوں سے لاد دیا ہے۔ امی یہ سن کر بہت خوش ہوئیں۔ اور اباجی بھی۔ اُس شام گھر میں میری "گریڈنگ" کا گراف خاصہ اونچا ہو گیا۔

بس، اڈہ چکوال پر رُکی تو، میرے دوست قاضی غلام معبود صاحب میرے منتظر تھے۔ مصافحہ و معانقہ

کی رسوم سے فارغ ہو کر میں نے اپنے گھر کا رُخ کیا۔ رہائش کا اہتمام پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ایک بوسیدہ سا متروکہ مکان میرے نام الاٹ ہو چکا تھا۔ ماہوار کرایہ غالباً ۴ روپے اور کچھ آنے تھا۔ یہ مکان اُوپر والی منزل پر واقع تھا۔ نیچے گودام تھے جنہیں صرف بوقت ضرورت کھولا جاتا تھا۔ یہ مکان میرے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ تفصیل آگے آئے گی۔

اگلی صبح میں اسکول پہنچا اور ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ موصوف سے مل کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا، تو بڑے تامّل کے بعد انہوں نے اپنی تین انگلیاں آگے بڑھائیں۔ اور پھر انہیں بھی جھٹ پیچھے کھینچ لیا۔ ایک آدھ رسمی سی بات ہوئی اور معاملہ ختم۔ اس کے بعد یہ حضرت جتنا عرصہ اسکول میں موجود رہے (غالباً سال کے لگ بھگ) ان سے کبھی مڈبھیڑ نہ ہوئی۔ وہ سخت قسم کے مردم بیزار واقع ہوئے تھے۔ اساتذہ سے ملنا اور اسکول کے معاملات پر ان سے تبادلۂ خیال کرنا ان کے مسلک میں روا نہ تھا۔ سامنے سے کسی کو آتا دیکھتے، تو راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے سے نکل جاتے۔ عجیب وہمی طبیعت پائی تھی۔ کسی سے بامرِ مجبوری ہاتھ ملا لیتے تو جب تک صابن سے ہاتھوں کو صاف نہ کر لیتے، انہیں چین

نہ ملتا۔ ہم لوگ ان کی عجوبۂ روزگار حرکتوں پر زیرِ لب مسکرایا کرتے تھے۔ موصوف جانؔ صاحب کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ ان کا اصل نام اس وقت ذہن میں محفوظ نہیں۔ ان حضرت کے بارے میں باغ و بہار قسم کے کئی لطیفے مشہور تھے۔ دو ایک آپ بھی سن لیجئے۔

ایک بار موصوف امتحان میں اِنسپکٹر مقرر ہوئے، آپ ایک صبح امتحانی سینٹر کا معائنہ کرنے چکوال سے تلہ گنگ پہنچے اور وہاں کمرۂ امتحان میں داخل ہونے کے بجائے سیڑھیوں کے راستے ہال کی چھت پر جا پہنچے، اور روشن دانوں کے شیشوں سے کمرۂ امتحان کے اندر جھانکنے لگے۔ اُدھر سُپرنٹنڈنٹ صاحب کی نگاہ، اتفاق سے، اوپر جا پڑی۔ دیکھا کہ کوئی اجنبی آنکھ چھت کے اوپر سے کمرۂ امتحان میں جھانک رہی ہے۔ انہوں نے شور مچا دیا۔ سارے امیدواروں کی نگاہیں چھت کی جانب اٹھ گئیں۔ چوکیدار، چپڑاسی اوپر لپکے، اور جان صاحب کو دھر لیا گیا۔ انہوں نے بہتیرا باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ محکمۂ تعلیم کے بہت بڑے افسر ہیں اور وہ اس وقت اپنے فرائض منصبی سرانجام دے رہے ہیں، مگر کسی نے ان کی نہ سنی۔ بڑی لے دے کے بعد ممتحن حضرات کو یقین آیا کہ "عالی مقام"

تو واقعی چیکر ہیں۔ جب یہ لطیفہ تلہ گنگ کے شہریوں کے ہاتھ لگا تو کئی دن محفلوں میں قندِ مکرر کی چاشنی کے ساتھ اس کا تذکرہ ہوتا رہا۔

ایک اور واقعہ، اس سے ملتا جلتا۔ جان صاحب، اگلی بار سرائے عالمگیر میں سپرنٹنڈنٹ امتحان مقرر ہوئے۔ شام کے وقت وہ نہر کے کنارے سیر کرتے ہوئے پائے گئے۔ آگے آگے ان کا چپڑاسی سر پر خُفیہ صندوق" (CONFIDENTIAL BOX) اٹھائے چلا جا رہا تھا۔ استفسار پر پتہ چلا کہ بکس میں امتحانی پرچے بند ہیں۔ اور جان صاحب کی خبطی طبیعت کو یہ گوارا نہیں کہ وہ ان پرچوں کو تنہا چھوڑ کر خود سیر کے لئے نکل پڑیں۔ انہوں نے آسان راستہ تلاش کر لیا۔ خود بھی سیر کرو، چپڑاسی اور پرچوں کو بھی سیر کراؤ۔ آخر سربراہ کو اتنا خیال تو ہونا ہی چاہئے۔

آئیے، جان صاحب کو ان کے حال پر چھوڑ کر ہم واپس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال چلتے ہیں۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں لوگ میرے نام سے آشنا تھے۔ ٹائم ٹیبل میں مجھے نویں اور دسویں درجے کے دو اہم مضامین .... انگریزی اور ریاضی الاٹ کئے گئے۔ میں نے خوشی خوشی یہ ذمہ داریاں سنبھالیں اور پوری جانفشانی

سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس سلسلے میں دھیرے دھیرے پیش رفت بھی شروع کر دی۔ چوہدری احمد خان صاحب نے جو چند کتب عنایت فرمائی تھیں، میں ان کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ کچھ کتابیں میں نے خود بھی خرید لیں۔ میرے رفیق کار، سلیم اختر ملک سے بھی چار، چھ کتابیں تحفے میں مل گئی تھیں۔ اس طرح میرے پاس انگریزی ادب پر چالیس پچاس کتابیں جمع ہو گئیں۔ میں نے سوچا۔ سفر کا آغاز تو کر دینا چاہئے۔ راستے کی مشکلیں اللہ میاں خود آسان کر دیں گے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

مگر وا حسرتا! سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ موسم گرما کی تعطیلات ہوئیں تو میں اپنے گاؤں چلا آیا۔ اور آتی بار صرف دو چار کتابیں ہی اپنے ہمراہ لایا۔ باقی الماری میں بند کر کے وہیں چھوڑ آیا۔ میری غیر حاضری میں کسی منچلے نے میرے مکان کا تالا توڑا، گھر کی تلاشی لی۔ اسے ملتا کیا۔ چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ مایوس لوٹ کر جا رہا تھا کہ اس کی نگاہ کتابوں پر جا پڑی۔ انہیں اٹھایا اور

چلتا بنا۔ چھٹیاں ختم ہونے پر جب میں گاؤں سے لوٹا تو دیکھا، تمام کتابیں غائب۔ اپنی متاعِ عزیز کو یوں لٹتے دیکھ کر میری چیخ نکل گئی۔ دوستوں کی عنایت کی ہوئی اور اپنے خون پسینے کی کمائی سے خریدی ہوئی سب کتابیں غائب پاکر مجھے دنیا اندھیر دکھائی دینے لگی۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ میں انتہائی مشکل حالات میں بھی، اپنے اعصاب برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اُس دن میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔

میری طبیعت کچھ دن تو بڑی بجھی بجھی سی رہی۔ پھر سوچا . . . ۔ ٹوٹے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک۔ برخوردار، اٹھ اور کمر ہمّت باندھ۔ اب کی بار میں نے زیادہ پختہ ارادے کے ساتھ مطالعے کا پروگرام مرتب کیا اور اپنے اجڑے ہوئے کتب خانے کی آشیاں بندی میں نئے عزم کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ میں ٹیوشن پڑھانے سے بہت گھبراتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ ٹیوشن پڑھانے والے اساتذہ کلاس روم میں اپنی توانائیوں کو ضرور بچا کے رکھتے ہیں۔ تب ہی شام کے وقت وہ اپنے اپنے گھر میں "عزم نو" کے ساتھ "علم بکھیرنے" میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہفتے میں چھتیس، چالیس پیریڈ پڑھانے والا استاد

گھر لوٹے تو دوبارہ اسی کاروبار میں جُت جائے۔ ٹیوشن سے اس واضح الرجی (ALLERGY) کے باوجود میں نے خالص مجبوری کے تحت، دو ایک ٹیوشنیں پڑھانا شروع کر دیں۔ اس طرح میری ماہوار آمدنی میں دو تین سو روپے کا اضافہ ہونے لگا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس رقم سے صرف کتابیں خریدوں گا۔ اپنی ذات پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کروں گا۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح دھیرے دھیرے پھر انگریزی ادب پر کتابیں جمع ہونے لگیں۔ حُسنِ اتفاق سے میرا تعارف میرے پڑوس میں رہنے والے ایک نوجوان سے ہوا۔ یہ حضرت ایک سال پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی کے طالب علم رہ چکے تھے۔ اور اب پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ اُن سے راہ و رسم بڑھی تو ہمارے درمیان کتب اور نوٹس کا تبادلہ ہونے لگا۔ ادب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کا سلسلہ بھی چل نکلا۔ اس طرح ہم دونوں کو ایک دوسرے کی رفاقت سے فائدہ پہنچا۔ یہ صاحب، اُس زمانے میں قاضی اللہ بخش کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ بعد میں جب وہ فوج میں شامل ہو گئے تو صرف اللہ بخش رہ گئے۔ قاضی جی غائب!

آج کل ماشاء اللہ لفٹیننٹ کرنل ہیں اور خوب مزے میں ہیں۔ بڑے قوی اعصاب کے مالک ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۴ء کے اوائل میں انگریزی ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ اور ۱۹۶۶ء میں ایم۔ اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔ درمیانی عرصہ مطالعے میں منہمک رہے اور علم وحکمت سے اپنی جھولیاں بھرتے رہے۔ میرا اور اللہ بخش کا یہ ساتھ بڑا سودمند ثابت ہوا۔ ہم دونوں شام کے وقت سیر کے لئے باہر نکل جایا کرتے۔ میں اپنے دن بھر کے مطالعے کا نچوڑ ان کی نذر کرتا اور وہ اپنے مطالعے کے ماحصل سے مجھے نوازتے۔ اس طرح باہمی بات چیت سے بہت نکات نکھر کر سامنے آجاتے۔ اللہ بخش میرے مطالعے کی وسعت سے متاثر نہ تھے۔ (انہیں ہونا بھی نہیں چاہیئے تھا) مگر وہ میری قوتِ تحریر (EXPRESSION) کی بہت تعریف کرتے۔ ان کا خیال تھا۔ میں اپنی جاندار تحریر کے بل بوتے پر امتحان پاس کر لوں گا۔ میرا مطالعہ دراصل (INTENSIVE) نوعیت کا تھا۔ میں جو کچھ بھی پڑھتا، اسے اچھی طرح حرزِ جان بنالیتا۔ اس کے معانی پر غور کرتا اور اس ادبی تخلیق کے پس منظر سے آگاہی حاصل کرتا۔ میرا یہ طریق کار بڑا کارگر ثابت ہوا۔ اُدھر اللہ بخش کا مطالعہ بہت وسیع (EXTENSIVE) قسم کا تھا۔ وہ کسی

شاعر، ڈرامہ نویس، نقاد پر پڑھنا شروع کرتے تو مہینوں اسی ایک فنکار کی رسی کو ہی مضبوطی سے تھامے رکھتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے۔ وہ چھ سات ماہ تک صرف پہلے پرچے کی تیاری میں مصروف رہے۔ جب بھی ذکر چھڑتا، تان چاسر (CHAUCER)، اسپنسر (SPENSOR) اور ملٹن (MILTON) پر جا ٹوٹتی۔ باقی پرچے غائب۔ اُدھر اپنا عالم یہ تھا کہ ہر پھلواری سے تھوڑے پھول چُن کر اپنا گلدستہ ترتیب دے لیا کرتے۔ لکھنے کی کچھ صلاحیت اللہ نے دے رکھی تھی۔ بات سے بات پیدا کرنے کا فن بھی تھوڑا بہت آتا تھا۔ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر خود اعتمادی بڑھنے لگی۔ میں نقادوں کے نام تو زیادہ نہیں گنوا سکتا تھا، مگر میری تحریریں "اپنے" افکار کا رنگ زیادہ ہوتا تھا۔ اللہ بخش کی تحریروں میں گیرائی اور میری تحریروں میں شاید گہرائی زیادہ ہوتی۔ ع

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ

میں کیا اور میری تحریروں کی گہرائی کیا۔ نہیں صاحب۔ بس یونہی "گزارہ موافق" کام چل رہا تھا۔ جس "ماسٹر جی" کو چکی کی مشقت سے ہی چھٹکارا نہ ملے، وہ بھلا، ادب کی لطافتوں سے کیا لطف اندوز ہو گا۔

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ قاضی اللہ بخش کو چاسر، اسپنسر اور ملٹن سے گہری "عقیدت" تھی۔ آئیے۔ قاضی جی کے ان دوستوں کا تھوڑا ذکر ہی ہو جائے۔

چاسر، عمر کے اعتبار سے اور انگریزی شاعری کے حوالے سے بھی واقعی "باوا" یعنی "جدِّ امجد" تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں، انگریزی شاعری کو انہوں نے نئی رفعتوں سے روشناس کرایا اور اسے غیر انگریزی اثرات سے آزاد کرایا۔ یہ روایت شکن شاعر حقیقی معنوں میں انگریزی شاعری کی روحِ رواں ہے۔ اور مجھے اس "بڈھے" سے بڑی عقیدت ہے۔ ویسے آپ سے کیا پردہ۔ اس بڈھے کا دل ہمیشہ جوان رہا اور وہ چٹکیاں لینے سے کبھی نہیں چوکتا۔ CANTERBURY TALES کا ابتدائیہ (PROLOGUE) ہی پڑھ لیجئے۔ آپ کی طبیعت صاف نہ ہو جائے، تو اپنی وہی سزا جو چور کی۔

چاسر نے پرولوگ (PROLOGUE) میں اپنے معاشرے کی سچی تصویر پیش کی ہے۔ اس کے کردار جیتے جاگتے اور تندرست و توانا دکھائی دیتے ہیں۔ اُن میں بڑا تنوّع ہے۔ وہ زندگی کے ہر طبقۂ خیال کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کی گفتگو سے ان کے معاشرتی

عوامل کا صحیح شعور حاصل ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مذہب کے نمائندوں کو بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ چاسر نے اخلاقیات کے ان اجارہ داروں کے حوالے سے کتنی بلیغ بات کہی ہے :

IF GOLD RUSTS, WHAT SHALL THE IRON DO?

یعنی "چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی"۔

قارئین! آیئے، چاسر کو اپنے "حاجیوں" (PILGRIMS) کی چٹکیاں لیتے چھوڑ کر ہم اسپنسر (SPENSOR) سے دو دو باتیں کر لیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے، ایک محفل میں اللہ بخش زور شور سے اسپنسر کی شاعری کے محاسن بیان کر رہے تھے۔ میرے منہ سے بس یونہی، بے خیالی کے عالم میں نکل گیا۔ میرے بھائی، اسپنسر پڑھتے وقت تو میری حالت مچھلی کی سی ہو جاتی ہے۔ قاضی بڑی ہنسوڑ چیز واقع ہوا ہے۔ بخشتا کیسے؟ فوراً بولا۔ بھولے بادشاہ! تم سپنسر پڑھنے کے بعد اگر اپنے آپ کو ماہیٔ بے آب سمجھنے لگتے ہو تو پھر تمہاری قابلیت کو میرا اسلام۔ میں نے عرض کیا۔ قبلہ! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں، کس کافر نے ماہی کے ساتھ بے آب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ بات تو تم نے سنی نہیں۔ اور یونہی غل غپاڑہ مچا دیا۔ پھر میں نے اپنی

ادھوری بات کچھ اس طرح مکمل کی :۔ اسپنسر کی شاعری پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک الھڑ، بے پروا، مستانہ ادا مچھلی کے روپ میں تبدیل ہو گیا ہوں .. ایسی مچھلی جو آہستہ خرام لہروں کے بہاؤ پر اپنے پر ول (FINS) کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہو اور جو مدھر نغمگی اور سحر کن موسیقی کی دنیا میں جذب ہو چکی ہو۔

اللہ بخش نے میری " عارفانہ " گفتگو سنی تو بولا۔ استاد، تو نے آج اسپنسر کی شاعری کو چند جملوں میں پوری طرح سمو دیا ہے۔ تمہارے یہ چند جملے تو کئی تنقیدی کتابوں پر حاوی ہیں۔ میں نے اپنی تعریف سنی تو کچھ ریشہ خطمی سا ہو گیا۔

اور آیئے۔ اب "قاضی جی" کے تیسرے دوست ملٹن (MILTON) سے بھی ذرا مل لیں۔ ملٹن شروع شروع میں مجھے بڑا بور لگا۔ بس یونہی فلسفہ بگھارتا ہے۔ اخلاقیات اور مابعد الطبعیات (METAPHYSICS) کی بوجھل زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ملٹن پڑھتے وقت اپنے پلّے کچھ پڑتا ہی نہ تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا۔ ملٹن کو اتنے لاتعداد حوالہ جات تلاش کرنے میں بڑی کاوش کرنا پڑتی ہوگی۔

مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی، جب مجھے پتہ چلا کہ یہ "مردِ درویش" تو بینائی کی نعمت سے محروم ہو چکا تھا۔ یہ جان کر مجھے اور تعجب ہوا کہ فردوس گم گشتہ (PARADISE LOST) جیسی عظیم تخلیق کی تمام جلدیں ملٹن نے اپنی دو بیٹیوں کو بطور املا DICTATE لکھوائیں۔ ملٹن دونوں بچیوں کو اپنے دائیں، بائیں بٹھا لیا کرتا تھا۔ اور بغیر کسی وقفے کے کئی کئی گھنٹے انہیں DICTATION دیا کرتا۔ یہ عمل ہر روز چھ چھ سات سات گھنٹے جاری رہتا۔ ملٹن کی شاعرانہ عظمت اور اس کی بیٹیوں کے صبر و استقلال کو میرا سلام!

بات کا سرا بہت دور نکل گیا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میں ہر ماہ دو تین سو روپے پس انداز کر لیتا، اور اس رقم سے کتابیں خریدتا۔ اس طرح پانچ، چھ ماہ کے اندر اندر میرے پاس نصابی اور تنقیدی کتب کا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اور اب میں پورے انہماک کے ساتھ ان کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ میرا معمول یہ تھا کہ دن بھر جان توڑ کر اپنے فرائضِ منصبی بجا لاتا۔ شام کو دو ایک ٹیوشنیں پڑھاتا۔ اور اس سے فارغ ہو کر میل، دو میل سیر کے لئے نکل جاتا۔ پھر رات گئے تک مطالعے میں مصروف رہتا۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ میرے پڑھنے کا انداز حقیقت پسندانہ ہے۔ میں سرسری

مطالعے کا قائل نہیں۔ پڑھتا ہوں تو فن پارے کی وسعتوں میں ڈوب جانا چاہتا ہوں اور مجھے گرد و پیش کی کچھ خبر نہیں رہتی۔ مطالعے سے فارغ ہو کر میں غور و فکر کی منزل میں داخل ہو جاتا ہوں۔ اپنے نتائج خود اخذ کرتا ہوں۔ میں اندھا دھند تقلید کا قائل نہیں، نہ مجھے کتابوں اور مصنفوں کے نام گنوانے کا شوق ہے۔ مجھے اس چیز سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں کہ شیکسپیئر کی TRAGEDIES کے بارے میں بریڈلے نے کیا کہا۔ یا BOAS کی رائے کیا ہے۔ یا ڈاوڈن (DOWDEN) اور آئی اے رچرڈز (I.A RICHARDS) کے ارشادات کیا ہیں۔ میری کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ میں اپنی "رائے" معلوم کروں۔ خوشہ چینی کا میں قائل نہیں۔

شیکسپیئر کا نام لبوں پر کیا آیا۔ نطق نے زبان کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ اللہ، اللہ۔ کیا نابغۂ روزگار ہستی عالمِ وجود میں آئی۔ اقبال نے ٹھیک ہی تو کہا ہے:

تجھ کو جب دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تابِ خورشید کو خورشید میں پنہاں دیکھا

چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا
رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

شیکسپیئر کے مطالعے سے مجھے انسانی فطرت کی وسعتوں کا صحیح ادراک حاصل ہوا۔ میری سوچ میں نکھار پیدا ہو گیا اور میں وسعتِ نظر اور وسیع القلبی جیسی نعمتوں سے آشنا ہو گیا۔ شیکسپیئر بلاشک، عظیم ہے اور یوں لگتا ہے جیسے کائنات سرنگوں ہو کر اس کے حضور ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ اور اپنے سربستہ راز ایک ایک کر کے واشگاف کر رہی ہے۔

بات پھر دور نکل گئی۔ میں اپنے امتحان کی تیاری کی بات کر رہا تھا اور ذکر چل نکلا شیکسپیئر کا۔ کہاں شیکسپیئر کہاں امتحان۔ اُسی کو تو FROM SERIOUS TO RIDICULOUS کہتے ہیں نا! بہرحال، یہ دھندا بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے جب امتحان دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو معروضی انداز میں کورس کی تمام وسعتوں کا جائزہ لیا۔ نصاب میں شامل، شاعروں، نثر نگاروں، ڈرامہ نویسوں اور نقادوں کی فہرست مرتب کی۔ ترجیحات کا تعین کیا اور پھر ایک معمول کے مطابق اپنے ذاتی نوٹس تیار کرنے لگا۔ خدا کا شکر ہے، اُس زمانے میں خلاصوں، گائیڈوں

اور "شورٹ ناٹ" گیس پیپروں کی وبا نہیں پھیلی تھی۔ میں ۱۹۵۶-۵۷ء کی بات کر رہا ہوں۔ بعد میں تو بی آر مولک (B.R MULLICK) کے خلاصوں نے ایم اے انگریزی کے "تقدس" کو پامال کر کے رکھ دیا۔ اب تو عالم یہ ہے کہ یہ خلاصے حشرات الارض کی مانند ہر طرف رینگتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ ایم اے کے طالب علموں کو (FIVE MINUTES BEFORE EXAMINATION) جیسی مجرب (KEYS) بھی دستیاب ہیں۔ تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو!

چکوال کے قیام کے دوران گرمیوں کی چھٹیاں مجھے راس نہیں آئیں۔ پہلی چھٹیوں کی داستان تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ چور کتابیں لے اڑے تھے۔ اس بار کا حادثہ زیادہ اعصاب شکن تھا۔ ہوا یوں کہ میں تعطیلات گزارنے کے بعد گاؤں سے چکوال پہنچا۔ اُس سال غیر معمولی طور پر بارش زیادہ ہوئی تھی۔ میرا مکان برسات میں بند پڑا رہا تھا اور اس کی عمارت گل سڑ چکی تھی۔ صحن (گوداموں کی چھت) بظاہر "صحت مند" دکھائی دے رہا تھا، مگر وہ "سپر انداز" ہونے کے لئے ہر لحظہ تیار تھا۔ میری شامت جو آئی تو ایک کمرے سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں جانے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ جونہی میرا قدم اینٹوں پر پڑا، وہ پکے ہوئے پھل کی مانند زمیں بوس ہونے لگیں۔ سانحہ اتنا اچانک تھا کہ میں اپنے حواس برقرار

نہ رکھ سکا۔ اور میں چند لمحوں بعد ان اینٹوں کے ساتھ ہی گودام کے فرش پر جا گرا۔ میری پیٹھ اینٹوں کے ڈھیر سے جا ٹکرائی اور ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر (FRACTURE) ہو گیا۔ میں درد کے مارے کراہنے لگا۔ افتاں و خیزاں دروازے تک پہنچ کر دستک دینے لگا۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد دروازہ کھلا۔ اور مجھے وہاں سے نکال کر ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اے پی سی اور سلفا جیسی "مقبول عام" ادویات دے کر مجھے رخصت کر دیا۔ ایکسرے وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی انہوں نے زحمت ہی گوارا نہ کی۔ میں کئی دن درد کے مارے کراہتا رہا۔ اور اپنے طور پر مالش (MASSAGE) وغیرہ کرتا رہا۔ اب حالت یہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی جُڑ تو گئی ہے مگر غلط طریق سے۔ جس کی وجہ سے بائیس سال گزر جانے کے باوجود میری تکلیف ہنوز قائم ہے اور میری کمر سے ہر وقت درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ باوجود ہزار علاج کے، اس درد کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اب تو یہ درد میرا دیرینہ رفیق بن چکا ہے۔ کسی دن اس کی شدت میں کمی واقع ہو جائے تو میں سمجھنے لگتا ہوں، میرا ساتھی آج کہیں غائب ہے۔ چند لمحوں بعد جب یہ پوری آب تاب کے ساتھ لوٹ کر آتا ہے تو میری "جان میں جان" آتی ہے۔ پرانی دوستی جو ٹھہری!!

کہتے ہیں۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ میں ستمبر ۱۹۵۶ء کے مہینے میں چھت سے گِرا۔ اُدھر میری پیاری امی اُسی سال اکتوبر میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملیں۔ یہ موت اتنی اچانک تھی کہ ہم سب اہلِ خانہ سناٹے میں آ گئے۔ مجھے تو اپنے لُٹ جانے کا اتنا شدید احساس ہوا کہ اس کے صدمے سے آج تک سنبھل نہیں سکا ہوں۔ امّی جی کی وفات کے بعد میں اپنے آپ کو اُس بے سہارا کشتی کی مانند سمجھتا ہوں جس کا ملاح سمندر کی لہروں کی نذر ہو چکا ہو اور جو خود بیچ منجدھار پھنس چکی ہو۔ میرے مالک! والدین سے جدائی بھی اولاد کے لئے کتنے گہرے کرب کا موجب بنتی ہے۔

میں والدہ محترمہ کی لحد پر آنسوؤں کا نذرانہ پیش کر کے چکوال لوٹا تو کئی دن پڑھائی میں میرا دل نہیں لگا۔ مفلس کے چراغ کی مانند میں ہر وقت بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ اور تنہائی کا احساس ہر لحظ مجھے ڈسنے میں مصروف دکھائی دیتا تھا۔ اس موقع پر قاضی غلام معبود صاحب نے میری ڈھارس بندھائی اور میں پھر سے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ اسی اثنا میں قاضی اللہ بخش لاہور جا چکے تھے۔ اب میں اور قاضی غلام معبود ادب کی "گتھیاں سلجھانے" لگے۔

قاضی صاحب، انگریزی ادب کے باضابطہ طالب علم تو نہ تھے۔ البتہ انہیں اُردو اور فارسی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ انگریزی بھی

اچھی لکھ لیتے تھے۔

میں نے اور قاضی صاحب نے اب مختلف ادبی موضوعات پر "خامہ فرسائی" کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان دنوں "پاکستان ٹائمز" میں ETHICS OF ART پر بڑی دلچسپ بحث چل رہی تھی۔ ہم دونوں بھی میدان میں کود پڑے۔ دو دانشور، مسٹر مقبول عزیز اور مسٹر خالد حسن آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ میں نے مقبول صاحب کے حق میں آواز اٹھائی اور قاضی صاحب جواب آں غزل کے طور پر خالد حسن کے ہم نوا بن بیٹھے۔ اس طرح یہ دلچسپ نوک جھونک کوئی دو ماہ جاری رہی۔ میرے پاس اُس دور کے تمام خطوط محفوظ ہیں۔ اِدھر ETHICS OF ART پر بحث ختم ہوئی، اُدھر میں نے LONELY HEARTS کے زیرِ عنوان ایک خط داغ دیا۔ میری بحث کا مرکزی خیال یہ تھا کہ اس مشینی دور میں حساس لوگ عجیب کرب کی کیفیت سے دوچار ہیں۔ زندگی ان کے لئے اجیرن ہے اور بے یقینی اور شکوک کے ناگ ہر لحظہ انہیں ڈستے رہتے ہیں۔ میں نے خط کے اختتام میں DOVER BEACH سے میتھو آرنلڈ (MATTHEW ARNOLD) کی درج ذیل سطریں نقل کیں۔

AH LOVE, LET US BE TRUE TO ONE
ANOTHER ! FOR THE WOLD WHICH SEEMS

TO LIE BEFORE US LIKE A LAND OF DREAM,
SO VARIOUS, SO BEAUTIFUL, SO NEW,
HATH REALLY
NEITHER JOY, NOR PEACE
NOR HELP FOR PAIN;
AND WE ARE HERE AS ON A DARKLING
PLAIN SWEPT WITH CONFUSED ALARM
OF STRUGGLE AND FLIGHT,
WHERE IGNORANT ARMIES CLASH
BY NIGHT"

خط کے آخر میں، میں نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام "تنہا روحوں" کو مل بیٹھ کر اپنے درد کا درماں کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں مجھے کئی تجویزیں بھی وصول ہوئیں۔ افسوس، میری تساہل پسند طبیعت کوئی سرگرمی نہ دکھا سکی۔ اس طرح یہ تجویز محض نظری مباحث تک ہی محدود رہی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ اُس زمانے میں "پاکستان ٹائمز" کے کالموں میں تیس کے لگ بھگ ادبی موضوعات پر میرے مضامین چھپے تھے۔ اب میرے اندر اتنی خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی کہ میں ایم اے انگلش کے امتحان میں بطور پرائیویٹ اُمیدوار شریک ہونے

کی جرأت کر سکتا تھا۔

یادش بخیر! ہمارے "دلچسپ" ہیڈ ماسٹر جان صاحب اس دوران ریٹائرمنٹ پر جا چکے تھے۔ ان کی جگہ قاضی محمد صدیق بھیروی ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ موصوف بہت فاضل انسان تھے مگر تھے ذرا تنک مزاج۔ خدا کے فضل سے وہ میرے کام سے بہت متاثر ہوئے۔ اللہ بخشے، میرے رفیقِ کار راجہ غلام مصطفےٰ، اپنی محنت، نیازمندی اور بے لوث خدمت کے طفیل ہر ہیڈ ماسٹر کی آنکھ کا تارا ہوا کرتے۔ قاضی صاحب ہم دونوں پر خصوصی توجہ فرمایا کرتے۔ میں انگریزی کے ساتھ ساتھ ریاضی کی کلاسیں بھی لیا کرتا۔ اُدھر راجہ صاحب انگریزی اور معاشرتی علوم کے منجھے ہوئے استاد تھے۔ اس کے علاوہ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ کے فرائض بھی وہ سالہا سال سے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہے تھے۔

قاضی صاحب کو بھی جلد ہی ریٹائرمنٹ کا پروانہ مل گیا۔ اُدھر حسن اتفاق سے انہیں پنچایت اسکول ڈھڈیال تحصیل چکوال کی سربراہی کی پیش کش ہوگئی۔ ان کے ریٹائر ہونے میں ہنوز چند ماہ باقی تھے۔ مگر قاضی صاحب نے اسکول کے حالات سدھارنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

طے پایا کہ قاضی صاحب بمعہ اپنے دو "فاضل اساتذہ" کے اتوار کا دن ڈھڈیال اسکول میں گزاریں گے۔ اور خود انتظامی امور پر توجہ

دیں گے ۔ میرے اور راجہ مصطفےٰ صاحب کے ذمے یہ کام سونپا گیا کہ ہم دونوں میٹرک کے بچوں کی انگریزی، ریاضی اور معاشرتی علوم میں رہنمائی کریں تاکہ بچے میٹرک کا اچھا نتیجہ دکھا سکیں۔ یہ کام ہمارے فرائض منصبی کے ضمن میں نہ آتا تھا۔ مگر ہم اسے ایک عرصہ تک خوشی خوشی نبھاتے رہے۔ ہم لوگ قاضی صاحب کے حسن سلوک سے اتنے زیادہ متاثر تھے کہ سرتابی کو جی نہ چاہتا تھا۔ افسوس، قاضی صاحب کو ڈھڈیال اسکول کی ہیڈ ماسٹری راس نہ آئی۔ چند ماہ کے اندر اندر انتظامیہ سے اختلافات پیدا ہو گئے اور انہیں مستعفی ہونا پڑا۔

قاضی صاحب رخصت ہوئے تو ملک دلیر خان تشریف لائے جو ایک سخت گیر حاکم اور ایک اعلیٰ منتظم کی حیثیت سے ضلع بھر میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ ملک صاحب کے دور میں اسکول نے بہت ترقی کی..... پڑھائی اور کھیلوں دونوں میں..... ملک صاحب بڑے مزاج شناس واقع ہوئے تھے۔ وہ HAWKS اور DOVES کے درمیان توازن قائم رکھنے کے فن میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔ ”دبنگ“ قسم کے اساتذہ سے ان کی دوستی پکی۔ اور مجھ جیسے ”اللہ لوگوں“ کا اللہ حافظ ـــــــ حساب صاف۔ ملک صاحب کی ”دوستی“ جن اصحاب سے مسلم تھی، ان میں سر فہرست علی عباس جلالپوری تھے۔ جناب ادیب صاحب اور علامہ صاحب (مرحوم) کی باری ذرا بعد میں آتی تھی، گو کہ ہر دو کا مقام خاصہ بلند تھا۔ راجہ مصطفےٰ صاحب

برقی کتب (E_books) کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے

حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو جوائن

کریں

ایڈمن پینل :

محمد ذوالقرنین حیدر: 03123050300

محمد ثاقب ریاض: 03447227224

سدرہ طاہر: 03340120123

Imagitor

کی نیازمندی تو برحق تھی۔ ملک صاحب، ان پر خصوصی عنایات فرماتے۔ ہر شام سیر کے وقت انہیں ساتھ رکھتے۔

ملک صاحب کے ساتھ میرے مراسم بس رسمی سے تھے۔ میں نے ان کے قریب ہونے کی کبھی کوشش نہ کی اور نہ ہی ان کی طرف سے کوئی سلسلہ جنبانی ہوئی۔ ایم اے انگریزی کا داخلہ بھجوانے کا وقت قریب آیا تو مجھے ان سے رجوع کرنا پڑا۔ افسوس ان کا طرزِ عمل خاصہ مایوس کن تھا۔ انہوں نے میرے فارم کے مندرجات کو دیکھا۔ پھر غصہ ان کی آنکھوں میں اتر آیا اور حقارت کے عالم میں میرا فارم مجھے لوٹا دیا۔ میں مایوسی کا بوجھ اٹھائے ان کے دفتر سے نکل آیا۔ اب میں ملازمت کو خیرباد کہنے کا پروگرام بنانے لگا۔ میں گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال میں تعینات تھا۔ اور ملک دلیر خان کے ایک دیرینہ ہم مکتب چوہدری عبد المالک صاحب اسلامیہ ہائی اسکول میں استاد تھے۔ چوہدری صاحب، میرے اباجی کے کسی زمانے میں رفیق رہ چکے تھے۔ میں نے سوچا ان سے مشورہ کر لوں۔ چوہدری صاحب نے بڑی ہمدردی کے ساتھ میری کہانی سنی اور پوری امداد کا وعدہ فرمایا۔ ملک دلیر اور چوہدری مالک شام کے وقت ہر روز بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ اُس شام چوہدری صاحب نے موقع غنیمت جان کر میری پریشانی سے انہیں آگاہ کیا۔ زہے نصیب! ملک صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اگلی صبح جب

فارم ان کی خدمت میں دوبارہ پیش ہوئے تو انھوں نے بلا پس و پیش اس پر دستخط ثبت فرما دیئے۔ اس طرح اللہ نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب میرے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو چکی تھیں۔ پھر میں نے پوری توجہ کے ساتھ ساتوں پرچوں کی تیاری کر دی۔ میں جو کتاب پڑھتا، اس کے نوٹس ضرور تیار کرتا۔ پھر ان بھاری بھر کم نوٹس کا خلاصہ تیار کرتا۔ امتحان کے نزدیک اس خلاصے کے خلاصے کو کشید کر کے ایک "شافی" قسم کا محلول تیار کرتا۔ میں یہ "تعویذ" نما نوٹس اتنے تکرار سے پڑھتا کہ بیشتر عبارتیں مجھے ازبر ہو جاتیں اور کمرہ امتحان میں ان جواہر پاروں کو اپنی تحریروں میں مناسب مقامات پر جڑ دیتا۔ ۱۹۵۷ء کے دنوں کے تیار کردہ نوٹس اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مجھے اس زمانے کی تحریروں سے بڑا لگاؤ ہے۔ جب کبھی انہیں دیکھتا ہوں جذباتی سا ہو جاتا ہوں۔ میں جب یہ نوٹس تیار کر رہا تھا تو مجھے اپنے مستقبل کا نقشہ بھی تبدیل ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ خدا کا شکر ہے۔ میرے خواب شرمندۂ تعبیر ہوئے۔ سچ! ایم اے انگلش نے میری تقدیر پلٹ ڈالی۔ آپ پوچھیں گے۔ کیسے؟ لیجئے سنیئے۔

میں جون ۱۹۵۷ء کے مہینے میں امتحان سے فارغ ہوا اور نتیجہ کا اعلان ستمبر کے آخری ہفتے میں کیا گیا۔ قدرت نے ہماری محنت کی لاج رکھ لی تھی۔ ہم نے اپنی کامیابی کی خبر سنی تو خوشی کا کوئی

ٹھکانہ نہ تھا۔ اس سال شرح کامیابی ۱۸ فیصد تھی۔ اپنا شمار کامیاب امیدواروں کی فہرست میں دیکھ کر بڑا خوشگوار تعجب ہوا۔ میں نتیجہ سن کر بھاگا بھاگا اپنے گاؤں پہنچا۔ اپنے اباجی کے قدموں پر گر پڑا اور انہیں آنسوؤں سے تر کر دیا۔ پھر میں اپنی امی جی کی قبر پر پہنچا۔ اور دیوانہ وار قبر سے لپٹ کر رویا۔ اس طرح اپنے والدین کو مژدہ جانفزا سنا کر میں چکوال واپس لوٹا اور ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن (DPI) کے نام ایک درخواست دے دی۔ ٹھیک دو ہفتے بعد مجھے یہ خوشخبری ملی کہ گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال سے میری تقرری گورنمنٹ کالج چکوال میں بطور لیکچرار کر دی گئی ہے۔ میں سجدۂ شکر بجالایا۔ اور اب کالج جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔

قارئین! اب کالج چلنے سے پہلے آئیے، آپ کو اپنے اسکول کے چند رفیقان کار سے ملواتا چلوں۔ مشہور فلسفی اور مفکر، سید علی عباس جلالپوری کے نام سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ موصوف ان دنوں گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال میں تعینات تھے۔ وہ بوچھال کلاں میں بھی میرے رفیق رہ چکے تھے۔ اور میرے بڑے کرم فرما تھے۔ اپنی لیاقت، مطالعے، ذہانت، تعلیمی قابلیت ـــ غرض ہر لحاظ سے اپنے ساتھیوں سے منزلوں آگے تھے۔ ہم لوگ تو ان کے سامنے بالکل بونے دکھائی دیتے۔ سید صاحب طبعاً کم گو تھے۔ اسکول ماسٹری کے ماحول میں انہیں ایسے "بذلہ سنج" ساتھیوں سے پالا پڑا،

جوان کے ہم پلہ تو کجا، ان کے پاسنگ بھی نہ تھے۔ ان کے اور شاہ صاحب کے مابین فکری ہم آہنگی ناپید تھی۔ یار لوگ، سید صاحب کو حد درجہ متکبر اور انانیت پسند سمجھتے۔ سید صاحب بھی انہیں گھاس نہ ڈالتے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب سارے اسٹاف نے سید صاحب سے سماجی مقاطعہ کر دیا۔ بول چال، علیک سلیک سب ختم۔ خلیلی صاحب اُردو کے استاد تھے۔ شاعرانہ "تک بندی" میں خاصی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے شاہ صاحب کی شان میں ایک دفعہ ہجو بھی لکھی۔ جلالپوری صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے کہلوا بھیجا خلیلی کو بتا دو۔ وہ نظم میں ہجو لکھے گا تو میں نثر میں اسکا جواب دوں گا۔ اُدھر "نثری ہجو گوئی" میں شاہ صاحب کے خلاف دوسرے صاحب جو بہت پیش پیش تھے۔ ان کا نام تھا چوہدری فضل داد۔ بڑی کائیاں چیز تھے۔ سوائے پڑھنے لکھنے کے باقی تمام مشاغل میں بھرپور دلچسپی لیا کرتے تھے۔

جلالپوری صاحب کی نظرِ عنایت مجھ پر ارزاں رہتی۔ گاہے گاہے میں، شاہ صاحب اور قاضی غلام معبود صاحب سیر کے لئے باہر نکل جایا کرتے۔ شاہ صاحب کے علم کے کیا کہنے۔ بات کرتے تو دکھائی دیتا۔ علم کی حدوں کو چھُو رہے ہیں۔ جس دور کی میں بات کرتا ہوں، اُس زمانے میں وہ تشکیک کے دور سے گزر رہے تھے۔ اقبال کے بارے میں بھی حسنِ ظن نہ رکھتے تھے۔ اکثر کہا کرتے: "اٹھو، میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" جیسی زوردار شاعری کرنے والا شاعر

آخر "تبلیغ اور وعظ" کے چکروں میں الجھ کر اپنی صلاحیتیں گنوا بیٹھا ہے!!

پھر، ہم نے ایک رات بڑا تکلیف دہ منظر دیکھا۔ جلالپوری صاحب دردِ گردہ میں مبتلا ہیں اور بستر پر بسمل کی مانند تڑپ رہے ہیں۔ میں اور قاضی معبود صاحب دونوں تیمارداری کے لیے ان کے ہاں حاضری دیتے ہیں۔ مگر انہیں کچھ ہوش نہیں۔ وہ زمین اور آسمان کے درمیان کہیں معلق ہیں۔ ہم رات گئے تک ان کے سرہانے بیٹھ کر لوٹ آتے ہیں۔ اگلی صبح پھر ان کے گھر جا کر ان کی صحت کا حال پوچھتے ہیں۔ اب ان کی طبیعت سنبھل چکی ہے۔ جواب میں فرماتے ہیں: اللہ کا شکر ہے۔ اب تو ٹھیک ہوں ایک متشکک کے منہ سے "اللہ" کی کرم فرمائی کا ذکر سن کر ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ بے شک، اللہ عظیم ہے وہ جب چاہے، جس سے چاہے، اپنا وجود تسلیم کرا لے۔

اسکول کے ایک اور استاد ادیب صاحب بھی بڑی قد آور شخصیت تھے۔ انہوں نے عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ چکوال اسکول میں ہی گزارا تھا۔ اس علاقے کی دو تین نسلیں ان کے علم سے فیض یاب ہو چکی تھیں۔ ادیب صاحب باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ مشرقی قدروں کا حسین نمونہ۔ ہمیشہ مشرقی لباس میں ملبوس دکھائی دیتے۔ رفتار میں وقار، گفتگو میں بانکپن، مسکراہٹ ہر لحظہ ان کے ہونٹوں پر رقصاں رہتی۔

ادیب صاحب تقسیمِ ہند سے قبل کے ایام کا تذکرہ بڑے حسرت

بھرے انداز میں کرتے۔ کہتے کہ اُس زمانے کے شاگرد بہت برخوردار تھے۔ آج کل کی نسل تو حیا اور شرم کی صفات سے تہی دامن ہوتی جا رہی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے فردوس کے نام پر اسٹیشنری کی ایک چھوٹی سی دکان بھی کھول رکھی تھی اور اخباروں کی ایجنسیاں بھی لے رکھی تھیں۔ افسوس، اس ضمن میں بھی انہیں کئی حلقوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ دوستوں کی "عنایات" پر وہ اکثر دلفگار دکھائی دیتے۔ اسکول کے ایک اور بزرگ جن کی شخصیت کا بڑا دبدبہ تھا، علامہ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ علامہ صاحب، چکوال کے مشہور اور قابلِ احترام قاضی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کا شمار پیر صاحب گولڑہ شریف کے خصوصی حلقہ بگوشوں میں ہوتا تھا۔ ادیب صاحب اور علامہ صاحب آپس میں بڑے بے تکلف تھے۔ اکٹھے بیٹھتے تو ہنسی مذاق کا سلسلہ چل پڑتا۔ ہلکی پھلکی نوک جھونک بھی بہار کا سماں پیدا کرتی۔ ویسے، آپ سے کیا پردہ، دونوں بزرگوں کے مابین دیرینہ چشمک چلی آرہی تھی۔ مگر انہوں نے اپنے حسنِ تدبر سے اسے کبھی تلخی کی بھینٹ چڑھنے نہیں دیا۔

ادیب صاحب اور علامہ صاحب میرے خصوصی کرم فرما تھے۔ دونوں مجھ پر بڑی شفقت فرماتے۔ جس زمانے میں ملک دلیر خان مجھے ایم اے انگریزی کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ دونوں بزرگ میری خاطر پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا، پہلے میں خود

قسمت آزمائی کروں۔ خدانخواستہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو پھر وہ میری وکالت کریں گے۔ یہ تو خدا کا کرم ہے، ان کی آزمائش کا وقت ہی نہیں آیا اور ہمارا مقصد چوہدری مالک صاحب کی وساطت سے ہی حل ہو گیا۔

میں نے چکوال اسکول میں کوئی ساڑھے تین سال کا عرصہ گزارا۔ خدا کا شکر ہے مجھے اپنے رفقا کا تعاون اور اپنے شاگردوں کا بے پایاں خلوص اور پیار ملا۔ چند شاگردوں کے ساتھ تو تعلقات نے دائمی شکل اختیار کر لی۔ میرے "عقیدت مندوں" میں سے جن چند طلبا کے نام گنوائے جا سکتے ہیں ان میں سر فہرست محمد اعظم فاروقی ہے۔ اس صاحبزادے کا خاندان ہندوستان سے ہجرت کر کے یہاں چکوال میں آن مقیم ہوا تھا۔ اس کے خاندان کے دوسرے افراد سکھر میں مقیم تھے۔ اعظم پڑھائی میں تو بس اوسط درجے کا تھا۔ مگر کھیلوں میں اس کا جواب نہ تھا۔ ہاکی سے اس کو خصوصی شغف تھا۔ اس بچے نے میری بھرپور خدمت کی۔ میں جس زمانے میں کمر کی چوٹ کی وجہ سے بیمار تھا۔ اس نے میری دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اللہ اسے جزائے خیر سے نوازے۔ جانے، ان دنوں کہاں اور کس حال میں ہے؟ عرصہ سے نامہ و پیام کا سلسلہ بند ہے۔

جمیل یوسف کے نام سے تو علمی اور ادبی حلقے اچھی طرح

متعارف ہیں۔ یہ حضرت بھی اسکول کے زمانے میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ اسی طرح میجر ڈاکٹر مظفر، (پروفیسر) حافظ محمد سریف میجر بی اے ضیا، ڈاکٹر نثار ایم بی بی ایس، کرنل اورنگ زیب راجہ بھی میرے اُسی دور کے شاگرد ہیں۔ ان کی سعادت مندی ہے کہ یہ حضرات جہاں بھی ملتے ہیں، پیار اور عقیدت سے ملتے ہیں۔

باب — ۱۵

اسکول ماسٹر سے پروفیسر بننے کی روئداد

اسکول کی چار دیواری میں ہم نے جی بھر کر سیر کر لی۔ آیئے، اب گورنمنٹ کالج چکوال چلتے ہیں جہاں ہمارا "تقرر" بحیثیت لیکچرار انگریزی عمل میں آچکا ہے۔ میں نے اکتوبر ۱۹۵۷ء کی کسی "تاریخ" کو کالج میں چارج سنبھالا۔ کالج کے طلبا کی غالب اکثریت مجھے پہلے ہی جانتی تھی۔ یہ لوگ اسکول کے زمانے میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ اور میری "قابلیت" کے بڑے معترف تھے۔ اس طرح نئے ماحول سے مانوس ہونے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یار لوگ یونہی ڈراتے تھے کہ بچو! تو لیکچر دینے کلاس میں جائے گا تو تیری آواز حلق میں اٹک جائے گی۔ تیری ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں گی۔ تیرا دل دھک دھک کرنے لگے گا۔ اور تیری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جائے

گا۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس قسم کی آزمائش سے دوچار ہونے کی نوبت ہی نہیں آئی ۔ میں جس کلاس میں گیا، لڑکوں نے حد درجہ احترام کیا۔ نہ کسی نے ہوٹنگ کی، نہ کسی نے چاک کے ٹکڑے پھینکے، نہ کسی نے کتے، بلیوں کی آوازیں نکالیں۔ ہم بہ ہوش و حواس، جیسے کلاس روم میں داخل ہوتے تھے اسی طرح سے لوٹ بھی آتے۔

دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشہ نہ ہوا

اس زمانے میں چکوال کالج میں مخلوط تعلیم کا رواج تھا۔ لڑکیوں کا کوئی الگ کالج نہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ ایک ہی کمرے میں مصنوعی پارٹیشن (PARTITION) کر دی گئی تھی۔ ایک حصے میں لڑکے بیٹھتے تھے اور دوسرا حصہ لڑکیوں کے لئے مخصوص تھا۔ میں پیریڈ ختم ہوتے ہی کمرے سے باہر نکل آتا۔ لڑکیوں کی سرگرمیوں سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہی چیز میری کامیابی کا راز بنی۔ ورنہ اس سے پہلے بہت سے پروفیسر صاحبان "عزت سادات" سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ میں تو اس درجہ محتاط تھا کہ یہ بات مشہور ہو گئی کہ سرور صاحب لڑکیوں سے پردہ کرتے ہیں۔

کالج کے پرنسپل چوہدری سلطان بخش بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ مگر ان کے مزاج میں ہٹ دھرمی (RIGIDITY) کا عنصر غالب تھا۔ کام کرنے والے کی البتہ وہ بہت عزت کیا کرتے

تھے اس زمانے میں انگریزی کے دو استاد تھے۔ ایک میں، دوسرے بزمی صاحب۔ میری جتنی عمر تھی، اتنا موصوف کا تدریسی تجربہ تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے، ان کے پڑھانے کا انداز کچھ ایسا الٹا تھا کہ طالب علم کشاں کشاں میرے سیکشن کی جانب لپکتے پرنسپل صاحب نے بزمی صاحب کو کئی بار سخت سست بھی کہا کہ دیکھو۔ کل کا چھوکرا اتنا کامیاب استاد ہے۔ اور ادھر آپ ہیں کہ اپنے بے ہنگم طرزِ تدریس سے اپنی اور کالج کی رسوائی کا موجب بن رہے ہیں۔ بزمی صاحب یہ سن کر کچھ جھینپ سے جاتے۔

اس زمانے میں کالج کا تعلیمی معیار خاصہ بلند تھا۔ میں فورتھ ایئر اور تھرڈ ایئر کی کلاسیں لیا کرتا تھا۔ میری فورتھ ایئر کلاس کے بائیس کے بائیس لڑکے پہلی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں سے چھ لڑکوں نے وظیفہ حاصل کیا تھا۔ یہی حال تھرڈ ایئر کلاس کا تھا۔ ان لڑکوں میں سے بیشتر آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ برکت ضیا فوج میں میجر ہیں۔ اقبال منہاس کرنل ہیں۔ حافظ شریف انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ جمیل یوسف اور ماجد صدیقی نے شاعری کے میدان میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ہر دو ان دنوں پنڈی میں مقیم ہیں۔ اوّل الذکر رینٹ کنٹرولر ہیں اور مؤخّر الذکر اردو کے پروفیسر۔ افضل کہوٹ کہیں کمشنر کے عہدے پر متمکن ہیں۔ منظور حسین اور افتخار جنجوعہ

دونوں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ چکوال جیسے پسماندہ مقام سے اتنے جوہر قابل کا ایک ہی سال میں نمایاں ہونا یقیناً حیرت کی بات ہے۔ چشم بد دور! اس حیرت انگیز کامیابی میں "ما بدولت" کا بھی کچھ حصہ ہے۔ مانتے ہیں نا آپ؟

میں یہ بتانا بھول گیا کہ اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنا رہائشی مکان خالی کر دیا تھا۔ اب رہائش کا مسئلہ درپیش تھا۔ مکان کا ملنا مشکل مسئلہ تھا۔ مگر اللہ نے میری یہ مشکل بھی آسان کر دی۔ اس زمانے میں BHQ (BACHELOR HEADQUARTER) کی بڑی دھوم تھی۔ اس "ادارے" کے سربراہ، پروفیسر ستنار چاولہ تھے (جو آج کل کہیں پرنسپل ہیں) میں نے عارضی طور پر B-H-Q کی ممبرشپ کی درخواست دی۔ گو "چھڑے" (BACHELOR) ہونے کی شرط میں پوری نہ کرتا تھا تاہم چاولہ صاحب نے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے میرے لئے یہ شرط نرم کر دی۔ اور مجھے اپنے حلقہ بگوشوں میں شامل کر لیا۔

چاولہ صاحب "تاریخ کے منجھے ہوئے استاد تھے۔ اس کے علاوہ ان کا عام مطالعہ بہت وسیع تھا۔ انگریزی ادب سے بھی انہیں خاصا لگاؤ تھا۔ مگر ان کا اصل میدان تصوّف تھا جس سے بہت سے اصحاب ناواقف تھے وہ ماڈرن قسم

کے مرد درویش تھے۔ بوٹ، سوٹ میں ملبوس دکھائی دیتے مگر ان کا قلب بڑا شفاف، پاکیزہ اور معصوم تھا۔ حد درجہ ہمدرد اور غمگسار۔ طالب علموں کی بھلائی کا انہیں ہر لحظہ خیال رہتا۔ برادرِ عزیز ضیا ان کا منظورِ نظر شاگرد تھا اسے وہ ہمہ وقت اپنی خصوصی توجہ کا مرکز بنائے رکھتے۔

چاولہ صاحب فلسفہ، تاریخ، ادبیات اور تصوف کے ساتھ ساتھ ڈرامہ اور سٹیج کے فن میں یکتا تھے۔ ان کی آواز میں بلا کی گھن گرج تھی۔ تقسیم ہند سے پہلے وہ ریڈیو سے بھی منسلک رہ چکے تھے اور ان دنوں کا بڑی حسرت سے تذکرہ کیا کرتے۔

میں نے B.H.Q میں تھوڑے دن ہی قیام کیا۔ پھر میرے اور پروفیسر امین کے نام ایک مکان الاٹ ہو گیا اس میں ہم دونوں منتقل ہو گئے۔ گھر کافی کشادہ تھا۔ بالائی منزل میرے تصرف میں تھی۔ نچلے حصے پر امین صاحب کے جملہ حقوق محفوظ تھے۔ امین صاحب بنیادی طور پر ریاضی کے استاد تھے۔ مگر فنونِ لطیفہ سے انہیں گہرا لگاؤ تھا۔ موسیقی آرٹ، کلچر، ڈرامہ فلم سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب کے صدر بھی تھے۔ دل کے بہت اچھے انسان تھے۔ مگر مزاج میں ٹھہراؤ اور توازن کی قدرے کمی تھی۔ اپنی فلسفیانہ عادات و خصلات کے حوالے سے کالج میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ موصوف کی صحبت میں جتنے

دن کٹے، عمدہ کٹے۔ ان دنوں کی خوشگوار یادیں ہنوز میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

قارئین کرام کالج میں میرے ایک دیرینہ محسن اور کرم فرما تعینات تھے۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر عبدالغنی۔ ان کے احسانات کا سلسلہ بہت پرانا تھا۔ مجھے یاد ہے جس زمانے میں میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا ڈاکٹر صاحب ان دنوں سوہاوہ ضلع جہلم میں بطور اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر (چھوٹے بابو) تعینات تھے۔ والد صاحب ایک دن مجھے ان کے پاس لے گئے۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ ہم لوگ اُٹھ کر آنے لگے تو ڈاکٹر صاحب نے اباجی کو مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا۔ منشی صاحب، آپ کا بیٹا بہت ذہین ہے بڑا ہو کر انشاءاللہ آپ کا نام روشن کرے گا۔

اباجی کو یہ بات ہمیشہ یاد رہی۔ میں جب لیکچرار بنا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو ان کی پیشگوئی یاد دلائی۔ ڈاکٹر صاحب یہ بات سن کر بہت خوش ہوتے۔

ڈاکٹر صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔ زہد، تقویٰ اور پارسائی میں اپنا مخصوص مقام رکھتے ہیں۔ سادگی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ حد درجہ خلیق اور ملنسار ہیں۔ ہر ملنے والا ان کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ پیر صاحب جلالپور شریف کے خصوصی مریدوں میں سے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں

نے حضرت پیر فضل شاہ صاحب مرحوم پر ایک بلند پایہ کتاب بھی تصنیف کی ہے۔

کالج کے پرنسپل چوہدری سلطان بخش اپنی مخصوص عادات کے باوصف چکوال کی خاصی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ کسی زمانے میں خاکسار تحریک سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان کی قوتِ فیصلہ بہت مضبوط تھی۔ مصائب کے پہاڑ کیوں نہ ٹوٹ پڑیں چوہدری صاحب گھبراہٹ کو کبھی پاس پھٹکنے نہ دیتے بات کے دھنی تھے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتے۔ اور ایک بار فیصلہ صادر ہوجاتا، تو اس پر قطعاً نظرِ ثانی نہ کرتے۔ اصولوں پہ سمجھوتہ تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ اچھے کارکن کی تہ دل سے قدر کرتے۔ خوشامدیوں اور چاپلوسوں کا وجود انہیں گوارا نہ تھا۔

قارئینِ کرام! میں نے کالج میں بمشکل ایک سال گزارا ہوگا کہ مجھے فوج میں کمیشن مل گیا۔ میں نے ملے جُلے جذبات کے ساتھ اس خبر کا استقبال کیا۔ مجھے خوشی تھی کہ اللہ نے مجھے کامیابی سے نوازا تھا۔ مگر تشویش اس بات کی تھی کہ اگر خدانخواستہ چوہدری صاحب نے ایک بار مجھے فارغ کرنے سے انکار کر دیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں منوا نہیں سکے گی۔ امید و بیم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے اپنی کامیابی کی خبر سنائی

تو بہت خوش ہوئے۔ اور بلا تامّل انہوں نے مجھے کالج سے فارغ کر دیا۔ ۳۰؍ جون ۱۹۵۸ء کو مجھے چکوال کالج سے پروانۂ رہائی ملا۔ اور اگلے دن صبح یعنی یکم جولائی ۱۹۵۸ء کو میں نے بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ آرمی اپرنٹس اسکول راولپنڈی میں اپنے نئے عہدے کا چارج سنبھال لیا۔ اب کہانی ایک نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔

باب — ۱۶

قصّہ اپنے لفٹین بننے کا

یکم جولائی ۱۹۵۸ء کا دن میری زندگی میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اُس دن میں نے کالج کے پرسکون ماحول کو خیرباد کہہ کر عسکری زندگی کی کٹھن منزلوں میں قدم رکھا۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میری پہلی پوسٹنگ آرمی اپرنٹس اسکول، راولپنڈی میں کر دی گئی تھی۔ میں نے سوچا، ابتدا اچھی ہوئی۔ پنڈی اپنی پسند کا اسٹیشن مل گیا۔

میں یکم جولائی کی صبح تیار ہو کر جب اپرنٹس اسکول پہنچا تو سب سے پہلے مجھے ٹریننگ ایڈجوٹینٹ سے ملایا گیا۔ جنہوں نے سرتاپا میرا جائزہ لینے اور کچھ کاغذات کی تکمیل کے بعد مجھے ہدایت کی کہ میں ڈائرکٹر آف اسٹڈیز (DIRECTOR OF STUDIES)

کے ہاں حاضری دوں۔ اُن دنوں جو صاحب اس عہدے پر فائز تھے ان کا نام تھا آر۔ اے۔ قریشی اور عہدے کے اعتبار سے وہ لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ کرنل صاحب نے میری تعلیمی قابلیت اور تدریسی تجربے کے حوالے سے کافی تفصیلی گفتگو کی۔ اور جب انہیں پتہ چلا کہ اسکول ماسٹری کے زمانے میں، میں انگریزی کے علاوہ ریاضی کا مضمون بھی پڑھاتا رہا ہوں تو انہوں نے مجھے لیفٹیننٹ کرنل (تب میجر) ستار بخش ملک کے حوالے کر دیا۔ موصوف اس زمانے میں شعبۂ ریاضی کے صدر تھے۔

میجر ملک نے بڑی تفصیلی ہدایات سے مجھے نوازا۔ ان کے ارشادات کی تفصیل تو اس وقت ذہن میں محفوظ نہیں۔ صرف اتنا یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے مجھے ہر لحظہ چاق و چوبند رہنے اور عمدہ لباس پہننے کی تلقین کی۔ ملک صاحب نے پابندیٔ وقت کی بھی سختی سے تاکید فرمائی۔ وہ خود ایک ریاضی دان تھے حساب کتاب کے فن میں یکتا۔ کہنے لگے۔ فرض کرو، تم کسی دن کلاس میں ایک منٹ لیٹ پہنچتے ہو اور تمہاری کلاس میں چالیس طالب علم ہیں۔ کہو۔ تمہارے خیال میں کلاس کا کتنا حرج ہو گا؟ عرض کیا: سر، ایک منٹ۔ یہ بات سُن کر وہ مُسکرائے اور پھر فرمانے لگے: یہی ہم لوگوں کی غلطی ہے۔ آپ کے خیال میں تو کلاس کا ایک منٹ ضائع ہو گا۔ اُدھر میرے حساب میں کلاس کے چالیس

منٹ (۱ × ۴۰) گول ہو گئے۔ شروع شروع میں تو "معرفت"، کا یہ نکتہ کچھ پلے نہ پڑا۔ مگر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ صرف میجر ملک ہی اس فارمولے کے قائل نہ تھے۔ ماشا اللہ، ہمہ خانہ آفتاب تھا۔ نیچے سے اوپر تک تمام افسر صاحبان پابندیٔ وقت کی نعمتوں سے بہرہ ور تھے۔

ملک صاحب نے ایک اور بات کی بھی تاکید کی۔ اور وہ تھی سبق کی بھرپور تیاری۔ انہوں نے ڈائری لکھنے کی ضرورت واضح کی اور پھر اس کے آداب بھی سکھائے۔ اس ضمن میں ہمیں متنبہ کر دیا گیا کہ کوئی لغزش یا کوتاہی برداشت نہیں کی جائے گی۔ ہم نے صبر و سکون سے یہ تمام باتیں سنیں اور بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیا۔ پند و نصائح سے اپنی جھولیاں بھر کر جب شام کے وقت میں اپنی قیام گاہ کو لوٹا تو طبیعت کافی بوجھل تھی۔ مجھے تمام ماحول میں ایک تکلیف دہ گھٹن کا احساس ہوا اور پھر میں سوچنے لگا کہ گل و بلبل کی داستانیں سننے سنانے والا اور میر کے سرہانے آہستہ بولنے والا یہ فقیر سرودہ، شاید لفٹینی کا بارِ گراں زیادہ دیر نہ اٹھا سکے گا۔ اسی ادھیڑ بن میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ مجھے فوجی ماحول میں ایک تکلیف دہ قسم کا تناؤ دکھائی دیا اور باتوں کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ فوج میں استعمال ہونے والے روزمرہ الفاظ بھی عجیب سے لگتے:

VETT ، ETA ، TO&E ، ETG

CORO ، ATG ، PMC

جیسے غیر مانوس الفاظ سے آئے دن پالا پڑتا تھا۔ میرے سینیئر رفیقان کار بڑی بے تکلفی کے ساتھ ان "تراکیب" کو استعمال میں لاتے تھے۔ اور میں کھڑا، حیرت کے عالم میں، ان کا منہ تکتا رہتا تھا۔ زبان یارِ من ترکی ومن ترکی نمی دانم۔ اللہ بخشے، کرنل فضل حق (اس زمانے میں وہ کپتان کے عہدے پر فائز تھے) ان دنوں اپرنٹس اسکول میں سائنس کے شعبہ سے وابستہ تھے۔ ہم دونوں بی ٹی کے زمانے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ پہلے دن مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور علیک سلیک کے بعد فرمانے لگے۔ سرورا! کیا بنا تمہاری "CASUALTY" کا؟ میں یہ لفظ سن کر حیران ہوا۔ اور عرض کیا۔ سر! میں تو خدا کے فضل سے ہنوز زندہ و سلامت ہوں۔ پھر یہ CASUALTY کیسی؟ یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ میرے اس احمقانہ جواب پر وہ بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ میاں اس لفظ کی وسعتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ فوج میں ہر قابلِ ذکر موقع پر تمہارا اس سے پالا پڑے گا۔ اب تم فوج میں شامل ہوئے ہو تو دفتر والے تمہاری CASUALTY RETURN بھیجیں گے۔ تم نصف لفٹین سے لفٹین بنو گے، تو پھر تمہاری CASUALTY ہوگی۔ امتحان پاس

کرتے، بچوں کے پیدا ہونے، افرادِ کنبہ کے انتقال..... غرض ہر قابلِ ذکر موقع پر CASUALTY کا بپا ہونا برحق۔ میں نے "امرت دھارا" کی طاقتوں پر جتنا غور کیا، اتنا ہی ورطۂ حیرت میں ڈوبتا چلا گیا۔

اگلی صبح اپنے "ٹائم ٹیبل" کے مطابق میں نے کلاس روم میں مشکل سے قدم رکھا ہی تھا کہ میجر ملک اسی کلاس کی جانب لپکتے دکھائی دیئے۔ میں نے اپنی بوکھلاہٹ اور سراسیمگی پر قابو پانے کی پوری کوشش کی۔ مگر بے سود۔ میں گذشتہ سات سالوں سے درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ چلا آ رہا تھا۔ اور اپنی "پشت" پر اسکول اور کالج، ہر دور کے تجربات اٹھائے فوجی تعلیمی ادارے میں قدم رکھ رہا تھا، مگر یہاں کا ماحول یکسر مختلف پایا۔ سول تعلیمی اداروں میں استاد کو "احتساب" کی کسی کٹھالی سے گزرنا نہیں پڑتا۔ وہ کلاس روم میں بے تاج بادشاہ ہوتا ہے۔ چاہے تخیل کے پروں پر پرواز کرتا، نیلگوں فضاؤں میں نکل جائے۔ چاہے آسمان سے تارے نوچ کر کلاس روم میں لا بکھیرے۔ چاہے حسن کی دیوی کے حضور ہدیۂ دل پیش کر کے جمالیاتی تذکروں سے محفل گرما ڈالے۔ اسے ڈر کاہے کا؟ مگر جناب۔ ادھر اپرنٹس اسکول میں ہمارے شکیسپیر، ورڈز ورتھ، اور کیٹس (KEATS) کی بڑی دُرگت بنی۔ ہم بمشکل کلاس روم میں داخل ہوئے تھے کہ

اولے ہماری "ٹنڈ" پر آن پڑے۔ میجر ملک ابھی رخصت ہونے کو ہی تھے کہ ٹریننگ ایجوٹنٹ آن دھمکے۔ وہ فارغ ہوئے تو چیف انسٹرکٹر موجود۔ آمد و رفت کا یہ نہ ٹوٹنے والا سلسلہ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ سیدھا کئے جانے کی جو آرزو برسوں سے انگڑائیاں لے رہی تھی، اب اس کے بر آنے اور ہمارے کس بل نکلنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ میں نے پہلے دن گرتے پڑتے تین چار پیریڈ پڑھائے۔ سوچا، میری جانچ پڑتال کے لئے میرے افسرانِ بالا نے کلاس روم میں پہلے دن "قدم رنجہ" فرمانے کی زحمت گوارا کی ہو گی۔ اب یہ طوفان تھم جائے گا اور ہم اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر اپنی تدریسی تکنیک بروئے کار لائیں گے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! افسرانِ عالی مقام کا ورود ہر روز بڑی باقاعدگی سے جاری رہا۔ طبیعت اس "دخل در معقولات" پر پریشان تو بہت زیادہ تھی مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش!!

پہلے دو چار دن تو اسی آنکھ مچولی میں گزرے۔ پھر ہفتہ کے اختتام پر ی. ہ. د صاحب نے ایک کانفرنس بلائی، جس میں تمام شعبوں کے انسٹرکٹروں کو "مدعو" کیا گیا۔ صاحب بہادر نے چھوٹتے ہی اپنی خفگی اور ناراضگی کا اظہار شروع کر دیا۔ انکی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ نو وارد لفٹین تدریس کے جدید طریقوں سے

نابلد ہیں۔ وہ لیکچر بازی زیادہ کرتے ہیں۔ مگر کلاس کی بھرپور شمولیت کے فن سے نابلد ہیں۔ ڈی۔ او۔ ایس صاحب کا اشارہ تھا کہ بچے کو اس تخلیقی فن میں برابر کا شریک بنایا جائے۔ بچے کی عملی شرکت کی جو شکل انہوں نے تجویز فرمائی وہ کچھ یوں تھی۔ کہ آپ انگریزی، ریاضی یا سائنس کا جو سبق بھی پڑھائیں، اس میں بچے کی عملی شمولیت کا ضرور اہتمام کریں۔ استاد کا کلاس روم میں اکیلے "نغمہ سرا" ہونا اور بچوں کا گُم سُم بیٹھے رہنا انہیں گوارا نہ تھا۔ ان کے خیال میں، سوال جواب کا عمل جتنا تیز ہوگا، اسی نسبت سے سبق میں دلچسپی پیدا ہوگی۔ بچوں کو ہر قسم کے احساسِ کمتری سے بچانے کا ایک جدید گُر بھی ہمیں سمجھایا۔ اور وہ یہ تھا کہ جب استاد بچے سے کوئی سوال پوچھے، تو اسے اُٹھ کر جواب دینے پر مجبور نہ کیا جائے۔ انہیں بے مقصد اٹھک بیٹھک پسند نہ تھی۔ ہمیں ذاتی طور پر ان کا فرمان اچھا نہ لگا۔ مگر اختلاف؟ یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے۔

موصوف نے دورانِ گفتگو طالب علم کو ایک نرم و نازک گھڑے سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ اچھا استاد وہ ہے جو اس گھڑے کو الٹا کر کے علم کی بوندیں اس پر دھیرے دھیرے اس طریق سے چھڑکے کہ یہ بوندیں غیر محسوس طور پر گھڑے کے مساموں میں جذب ہوتی چلی جائیں۔ وہ گھڑے کو سیدھے منہ رکھنے اور ایک ہی "وار" میں

اس کے اندر علم انڈیلنے کے مخالف تھے۔ اس سے گھڑے کے چھلک پڑنے (OVERFLOW) کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

کرنل قریشی کے جدید تعلیمی نظریات سے ہم لوگ بہت متاثر ہوئے اور صدقِ دل سے ان کے تجویز کردہ طریقِ کار پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ ایک چیز جو ہمیں کھٹکتی تھی، وہ تھی افسرانِ بالا کا بھرپور "ورودِ مسعود"۔ ہم نے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ تدریس کا فن تخلیق سے مماثل ہوتا ہے اور استاد کو سوچ اور عمل کی پوری آزادی ہونی چاہیئے۔ مگر یہاں معاملہ اس سے یکسر مختلف تھا۔ فکری اور ذہنی آزادی نام کی کسی چیز کا اس کوچے سے گزر نہیں ہوا تھا۔ محتسب کی لاٹھی تھی اور ہمارا سر۔ اللہ اللہ خیر صلّا!

آرمی اپرنٹس اسکول میں قیام کے دوران دو ایک واقعات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہوا یوں کہ مجھے کیپٹن ملے بمشکل دو ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ میرا اکلوتا بیٹا خالد محمود عمر ۴½ سال آنِ واحد میں ہمیں تڑپتا، چیختا چھوڑ کر اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملا۔ بچہ ماشا اللہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب کی تصویر تھا۔ حد درجہ تندرست و توانا، حد درجہ خوبصورت۔ قدرت کی بے مثال صنّاعی کا ایک نادر نمونہ۔

لختِ جگر کو ہم سے جدا ہوئے اب اکیس ۲۱ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ مگر اس معصوم پھول کے کملانے پر آج تک میں

چپکے چپکے آنسو بہاتا رہتا ہوں۔ رہی، بیگم کی بات، تو کچھ نہ پوچھئے۔ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ ذرا خالد کا ذکر چھیڑئیے پھر دیکھئے آنسوؤں کی جھڑی بے اختیار اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتی ہے۔ اللہ بخشے، اباجی اس زمانے میں بقیدِ حیات تھے۔ انہوں نے اپنے پوتے کی جدائی پر اتنے آنسو بہائے کہ ان کی بینائی کم وبیش زائل ہو گئی۔ گھر کے دوسرے تمام افراد کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ مگر تقدیر کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے!

پیارے قارئین! کہانی ذرا بوجھل ہوتی جا رہی ہے۔ آیئے، آپ کو آفیسرز میس لئے چلوں، وہاں تھوڑی دیر آرام سے بیٹھیں گے۔ ذرا بات کریں گے!!

میں ۱۹۵۸ء کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ ہمیں آزادی ملے دس برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر ہنوز انگریز کی چھوڑی ہوئی روایات ہمیں بڑی عزیز تھیں۔ آفیسرز میس میں جملہ "تکلفات" اور "لوازمات" کے ساتھ ساتھ بس "تھوڑی سی" پینے کا اہتمام بھی کیا جاتا۔ "کہنہ مشق" حضرات تو اس میدان کے شناور تھے ہی، نو واردان بھی دیکھا دیکھی ان کی تقلید پر اُتر آیا کرتے۔ یہ مشغلہ "جدیدیت" کی علامت سمجھا جاتا۔ اور "روشن خیال" افسر صاحبان اس "سعادت" سے محروم رہ کر اپنے آپ کو "کٹ ملاؤں" کی صف

میں شامل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

مجھے ٹھیک طرح یاد ہے کہ ہمارے دوست لیفٹیننٹ آئی اے خان نے کمیشن پانے کے فوراً بعد "گلابی" کو ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور اس کے نتیجے میں بہکنا بھی شروع کر دیا۔ ہم چند دوستوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی؛ مگر بے سود۔ "صاحب" کا خیال تھا۔ روم میں رہو تو رومیوں جیسے طور طریقے بھی اختیار کرو۔ انہیں یہ بات پسند نہ تھی کہ محفل میں تو جام کھنک رہے ہوں اور وہ کسی کونے میں دبکے، مٹھی بھر "زاہدانِ خشک" کے ساتھ ہاتھ میں کوکا کولا تھامے کھڑے دکھائی دیں۔

اس خانہ خراب کا ذکر چل نکلا ہے تو دو ایک واقعات سن لیجئے۔

میرے ایک افسر تھے۔ میجر مرتضیٰ عمر ۴۵ - ۴۶ کے پیٹے میں ہو گی۔ مگر تھے کرانک بیچلر (CHRONIC BACHELOR) ازدواجی زندگی کی بندشیں برداشت کرنے پر وہ راضی نہ تھے۔ البتہ پاسبانِ عقل کو وہ اکثر تنہا چھوڑ دیا کرتے تھے۔ میس میں قدم رکھتے ہی دوپہر کے وقت وہ "بیئر" کا دور چلاتے۔ مجھے بھی بلاناغہ شرکت کی دعوت دیتے۔ مگر میں معذرت طلب کر لیتا۔ میرے مسلسل اور پیہم انکار پر وہ حسرت سے کہتے: ہائے، ظالم تو نے پی ہی نہیں، خیر۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دن یہ "مُلا" سیدھی راہ پر آ ہی جائے گا۔ ان کے بقول بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

اور پھر ہوا یوں کہ ایک ڈنر نائیٹ (DINNER NIGHT) کے موقع پر انہوں نے جامِ صحت تجویز کرتے وقت اپنے سامنے پڑی ہوئی صراحی سے میرے گلاس میں شراب انڈیلنے کی کوشش کی۔ یہ حرکت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور سود و زیاں کے نتائج سے بے پروا ہو کر میں نے بھری محفل میں انہیں سخت سست سنا دیں۔ اس عمل میں اعتدال کا دامن میرے ہاتھ سے سرک گیا۔ میں نے موصوف پر واضح کر دیا کہ مجھے فوجی ملازمت عزیز ضرور ہے، مگر اصول اس سے عزیز تر ہیں۔ میں اس دنیاوی چمک دمک کی خاطر اپنے ایمان کو یوں داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ ہر چہ باداباد ....

"صاحب" میری "بدتمیزی" پر سیخ پا تو بہت ہوئے۔ مگر اس ناخوشگوار واقعہ کے بعد انہوں نے مجھے "ناقابل اصلاح" (HOPELESS CASE) سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ وہ روٹھے، ہم چھوٹے۔

ایک دوسرا چشم دید واقعہ۔ مرتضےٰ صاحب ترقی پا کر میجر بنے تو انہوں نے چند بلانوشوں کو ایک شام اپنے کمرے میں مدعو کیا۔ پھر جام پہ جام لنڈھانے کا عمل شروع ہو گیا۔ یہ سلسلہ رات دو بجے تک جاری رہا۔ سخت جان حضرات تو گھڑوں کے حساب سے پینے کے باوجود کامیابی سے یہ معرکہ سر کر گئے۔ مگر بے چارے کیپٹن ظریف، ہوش و خرد کی بازی ہار گئے۔ اور "آؤٹ" ہونے کے

بعد انہوں نے "عارفانہ" گفتگو شروع کر دی۔ بڑی مشکل سے انہیں قابو میں لایا گیا۔ پھر وہ چار دن تک اپنے کمرے میں پڑے "خمار" اتارتے رہے۔ اس دوران ان کی "معرفت" کا ہر سو چرچا ہونے لگا۔ یار لوگوں کے ہاتھ ایک دلچسپ لطیفہ آگیا اور ظریف صاحب کی ظرافت، مسخروں کے ہتھے چڑھ کر برباد ہو گئی۔

اس زمانے میں پنڈی میں رہائش (ACCOMMODATION) کی سخت قلت تھی.... وہ اب بھی ہے۔ جائے تنگ است و مردم بسیار۔ ناچار، آفیسرز میس میں آٹھ، نو ماہ قیام کے بعد مجھے پنڈی شہر میں کرائے کے ایک مکان میں منتقل ہونا پڑا۔ مجھے مکان محلہ قاسم آباد (وہی محلہ جہاں میں نے کالج کے دنوں میں قیام کیا تھا) میں ملا۔ اسکول اور گھر کے مابین مسافت ۵ میل اور اس فاصلے کو طے کرنے کے لئے اپنے پاس خشکی میں داد پاتے" والی ایک پرانی سائیکل

.....میری جیون ساتھی!!

میں نے کوئی پندرہ سولہ ماہ کا عرصہ اسی سائیکل کے تعاون سے طے کیا۔ مجھے دفتر علی الصبح ۷ بجے پہنچنا ہوتا تھا اور میں صبح ۶ بجے کے لگ بھگ گھر سے نکل پڑتا تھا۔ ۶ بجے تیاری تب ہی ممکن تھی جب بیچاری "گھر والی" چار، ساڑھے چار بجے بیدار ہو۔ چنانچہ اللہ کی یہ نیک بندی ایسا ہی کرتی۔ اللہ اسے جزائے خیر دے۔ ذرا غور فرمائیے۔ دسمبر، جنوری کے مہینوں میں

علی الصبح ۶ بجے سڑک پر بھاگنے والے لفٹین پر کیا گزرتی ہو گی۔ خیر۔ گرتے پڑتے ہم نے یہ معرکہ بھی سر کر لیا۔

ہمارے کمیشن کی عمر کوئی ایک برس ہو چلی تھی جب ہماری باضابطہ ٹریننگ کا اپر ٹوپہ میں اہتمام کیا گیا۔ اپر ٹوپہ قیام کے کے دوران ہمیں عسکری زندگی کی جھلک دکھائی دی۔ ہمارے بہت سے کس بل تو آرمی اپرنٹس اسکول نے نکال دیئے تھے۔ رہی سہی کسر اپر ٹوپہ نے پوری کر دی۔ مدت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی!

علی الصبح ایک حوالدار ہمیں گراؤنڈ میں پی ٹی کیلئے "فال اِن" کرآتا۔ اور یہ پیریڈ کوئی گھنٹہ بھر جاری رہتا۔ پھر ناشتہ۔ اور اس کے بعد دن بھر ڈرل۔ اس عمل میں نڈھال ہو جاتے، مگر فرار کی کوئی راہ دکھائی نہ دیتی۔ ہمارے کورس انچارج کیپٹن (حال کرنل) سلیمی تھے۔ مرنجاں مرنج مگر سخت گیر۔ سیکنڈ ان کمانڈ سیکنڈ لیفٹیننٹ (حال کرنل) انور خان انور۔ جانِ محفل، ہنسوڑ، خوش باش مگر گراؤنڈ میں ان کے "تیور" جداگانہ۔ خیر، گرتے پڑتے، ہماری تربیت کے چار ہفتے گزر ہی گئے۔ اسی طرح کورس کے اختتام پر جب "قلۂ کوہ" سے میدان میں اترے تو ہم چاق و چوبند لفٹین بن چکے تھے۔ اب ہمارے کندھوں پر جھلمل جھلمل کرتے ہوئے دو پھول کِھل چکے تھے۔ بلاشک، انہیں ہم نے سوئی کے ناکے سے

گزر کر پایا تھا۔

بارے، برادرِ خورد ضیا (حال میجر) کا تھوڑا سا ذکر ہو جائے۔ مجھے کمیشن ملا تو وہ فورتھ ایئر کا طالب علم تھا۔ نتیجہ نکلا تو اس نے امتیازی شان کے ساتھ امتحان کا معرکہ سر کر لیا اور انگریزی کے مضمون میں وظیفہ کا "سزاوار" پایا گیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اسے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ دلوا دیا۔ جہاں سے دو سال بعد اس نے ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کر لی۔

لاہور میں قیام کے دوران ضیاء کو پروفیسر حمید احمد خان اور پروفیسر ایرک سپرین جیسے فاضل اساتذہ کی رہنمائی کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے بھی بالواسطہ ضیا کے استادوں سے استفادہ کیا۔ انگریزی ادب کے حوالے سے ضیا سے جب بھی بات ہوتی تو میں اس کے مایۂ ناز اساتذہ کے افکار سے بھی آگاہی حاصل کر لیتا۔ ایک بار مجھے پروفیسر حمید احمد خان مرحوم سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے عرض کیا۔ قبلہ آپ تو اس ہیچمداں کے GUIDE IN ABSENTIA ہیں۔ پھر اپنی عقیدت کی داستان سنائی، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد میرے دماغ میں ڈاکٹریٹ کا سودا سمایا۔ اس سلسلے میں پروفیسر صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ افسوس، ان کی بھرپور کرم گستری کے باوجود میرا یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکا۔ مگر یہ ایک الگ داستان ہے۔ میری اس ناکامی میں کتنی پردہ

نیشنوں کے نام بھی آتے ہیں۔ لہٰذا چپ ہی بھلی۔

لوگ اکثر و بیشتر "افسر" بننے کے بعد پڑھنے لکھنے سے اپنا ناطہ توڑ لیتے ہیں۔ مگر میں نے یہ کیفیات اپنے اوپر طاری نہیں ہونے دیں۔

میں فارغ اوقات میں انگریزی ادب کے مطالعہ میں مصروف رہتا۔ اور میری اکثر شامیں پنڈی میں متعیّن انگریزی ادب کے پروفیسروں کے جلو میں بسر ہوتیں۔ ہوتا یوں، کہ ہم دو چار دوست، امجد ملک ایوب گورا، محمد حسین قریشی (M.H.Q)، غلام حسین قریشی (G.H.Q) پنڈی کے کسی ریستوران میں بیٹھ جاتے اور پھر چائے کی پیالی میں مقدور بھر طوفان بپا کرتے۔ کبھی BOHEMIANISM کا تذکرہ چھڑتا۔ تو کبھی EXISTENTIALISM (وجودیت) کی بات چل نکلتی۔ باقی تمام ISMS ازقسم۔ IMPRESSIONISM ROMATICISM SUR-REALISM، NEO CLASSICISM بھی ہماری لپیٹ میں آجاتے۔ میرے دوست دھوئیں کے مرغولے اڑاتے۔ میں اس "سعادت" سے محروم تھا۔ مگر میں چائے کے جام انڈیل کر کسر پوری کر لیا کرتا۔ میں چائے پیالوں کے حساب سے نہیں، گیلنوں (اب لیٹروں) کے حساب سے پیتا ہوں۔ چائے کے گرم گرم گھونٹ میرے فکر کے لئے ہیمنز کا کام کرتے ہیں۔

میں نے اس زمانے میں خالص ادبی موضوعات پر کئی ایک مضامین بھی لکھے۔ جو "پاکستان ٹائمز" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ"

میں چھپ کر قارئین سے " داد تحسین " وصول کرتے رہے ۔ میرے چند مضامین از قسم THE MODERN MIND ، CULT OF UGLINESS ، OBJECTIVITY IN LITERATURE ، کو بڑی پذیرائی نصیب ہوئی ۔ اور اس طرح میں علمی اور ادبی حلقوں میں اجنبی نہ رہا ۔

اور پھر ۱۶ مئی ۱۹۶۰ء کو ہمیں ایک پروانہ ملا جس میں یہ " بشارت " درج تھی کہ ہمارا تبادلہ آرمی اپرنٹس اسکول سے ملٹری کالج جہلم کر دیا گیا ہے ۔ سرِ تسلیم خم !! ہم نے دو چار دن کے اندر اندر اپنی بساط لپیٹی اور پھر پنڈی سے تلخ ، ترش اور شیریں یادوں کو سمیٹ کر جہلم جا وارد ہوئے ۔ " مسافروں کے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں ۔ "

باب — ۱۷

ملٹری کالج جہلم کے شب و روز

۱۶ مئی ۱۹۶۵ء کی شام، ہم لوگ پنڈی سے سرائے عالمگیر پہنچے۔ کالج کے اربابِ اختیار نے ہمارے طعام قیام کا خاطر خواہ بندوبست کر رکھا تھا۔ آفیسرز کالونی میں ایک کوارٹر ہمارے نام الاٹ ہو چکا تھا۔ یہ کوارٹر جملہ آسائشوں سے آراستہ تھا؛ بالخصوص پانی کی بڑی فراوانی تھی۔

پانی کے ذکر سے مجھے ایک بات یاد آگئی۔ آپ بھی سن لیجئے۔ پنڈی میں قیام کے دوران جملہ پریشانیوں کے علاوہ پانی کی قلت سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ میں جس علاقے میں مقیم تھا، وہاں جوتے شیر لانا آتنا مشکل نہ تھا جتنا پانی کے چند گھونٹ حاصل کرنا۔ نل گھروں میں موجود ضرور تھے۔ مگر سال ہا سال سے خشک سالی کا شکار چلے آ رہے تھے۔ جس روز حسنِ اتفاق سے ان نلوں سے

پانی کی چند بوندیں ٹپک پڑتیں، اہل خانہ خوشی کے مارے مرغانِ چمن کی مانند چہکنے چہچہانے لگتے "عوام کمیٹی والی گاڑی کے انتظار میں گھنٹوں انتظار ساغر کھینچتے۔ اور جونہی یہ "محترمہ" نمودار ہوتیں عاشقوں کے غول کے غول اس پر مستانہ وار پل پڑتے۔ اور اس عمل میں کئی رقیبوں کے ہاتھ قلم ہوتے اور کئی کے سر دولخت!!

ادھر سرائے عالمگیر پہنچ کر میں نے گھر میں قدم رکھتے ہی نل پر خصوصی توجہ "ارزانی فرمائی"۔ جونہی اسے ہلکی سی جنبش دی، ساز کو تشنۂ مضراب پایا۔ پانی کی تیز دھار بہنے لگی۔ اور میں اسے دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ کہاں شبنم کی بوندوں کے لئے ترسنا اور کہاں یہ سیلاب کا سا سماں!! میں نے موقع پر موجود تمام "میزبانوں" کو اشارہ کیا کہ وہ گھڑے، مٹکے، بالٹیاں، دیگچے صراحیاں، جگ، گلاس، پیالیاں، ...... سب پانی سے بھر لیں۔ تعمیل ارشاد تو ہوتی کہ فوج میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر جملہ احباب میری "تشنگی" پر کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ وہ بھی سوچ رہے ہوں گے۔ عجیب صحرائی مخلوق سے پالا پڑا ہے جو چلتے کی پیالیاں تک پانی سے بھر رہا ہے۔ ان بیچاروں کو کیا خبر۔ پنڈی کے قیام کے دوران ہم کرب وبلا کے کس جانگسل دور سے گزر چکے تھے۔

میں اگلی صبح اپنی "نوک پلک" درست کر کے کالج پہنچا۔ بڑے

صاحب" سے رسمی ملاقات کے بعد میں اسٹاف روم میں لوٹا تو جملہ احباب کے علاوہ ایک صاحب، بلگرامی صاحب سے میرا تعارف کرایا گیا۔ یہ صاحب، بزرگی کی سرحدوں میں قدم رکھ چکے تھے اور ان کی ریٹائرمنٹ کی آمد آمد تھی۔ مگر زندہ دلی میں کوئی منچلا ان کا ثانی نہ تھا۔ بات سے بات پیدا کرنا کوئی ان سے سیکھے۔ سنجیدہ محفل کو پل بھر میں کشتِ زعفران میں بدل ڈالنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بلاشک ان کی باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔ بلگرامی صاحب مصافحہ کرتے ہی مجھ سے کہنے لگے۔ اچھا، تو آپ ہیں "سرور صاحب۔ بھیّا۔ آج صبح ہی صبح کالج کا مالی آپ کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ میں یہ سن کر بڑا حیران ہوا سوچا۔ میں تو نووارد ہوں۔ کالج کے مالی کو میری آمد کی خبر کیونکر ہوئی۔" غالبِ خستہ" کے بغیر "گلشن" کا کون سا کاروبار بند پڑا ہوگا۔

میں نے حیرت کے لہجے میں پوچھا۔ قبلہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ کالج کے مالی کا بھلا میرے ساتھ کیا تعلق؟

"ارے سرور صاحب۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ شجرکاری کا موسم تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ ادھر آپ ہیں کہ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ کالج کے مالی کو آپ کی "مونچھوں کی قلم" درکار ہے۔ اسے آپ کی "پلی پوسی" کنگ سائز مونچھوں کی چند شاخیں باغ میں لگانی ہیں۔ میں نے اپنی جواں سال اور تنومند

مونچھوں کی شان میں یہ قصیدہ سنا تو اپنی ندامت کو ان کے گھنے سائے تلے چھپانے میں مصروف ہو گیا۔ کالج سے لوٹ کر میں نے "چھانگا مانگا" کے اس گنجان جنگل کی وسیع پیمانے پر قطع و برید کر دی اس کے بعد سے چند کلیوں پر قناعت کرنے کا خوگر ہو گیا ہوں۔ اور یہ رسم آج تک نبھائے چلا آ رہا ہوں۔

کیپٹن (حال بریگیڈیئر) محمد اعجاز اکبر نے جو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں میرے ہم مکتب اور آرمی اپرنٹس اسکول راولپنڈی میں میرے رفیق کار رہ چکے تھے؛ مجھے رازداری کے انداز میں بتایا کہ میں جس افسر کی جگہ پر تعینات ہوا ہوں وہ ادبی قد کاٹھ کے اعتبار سے خاصا اونچا ہے۔ اس کے طلبا صرف درسی کتابوں پر انحصار نہیں کرتے بلکہ ان کی سوچ کا معیار بہت بلند ہے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے بتایا کہ موصوف (آپ سے کیا پردہ میں لیفٹیننٹ کرنل شاہد کی بات کر رہا ہوں۔ جو اس زمانے میں کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے) فراق گورکھپوری کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ اور اس حوالے سے ان کی فکر میں پختگی اور سوچ میں نکھار ہے۔ اور یہی خوبیاں انہوں نے اپنے طلبا تک منتقل کی ہیں۔ میں نے اعجاز صاحب کی باتیں غور سے سنیں اور دل میں تہیہ کیا کہ شاہد صاحب کی کلاس کو مایوس نہیں ہونے دونگا۔ سر دھڑ کی بازی لگا دوں گا۔

شاہد صاحب والا ٹائم ٹیبل میرے حوالے کیا گیا۔ دیکھا، تو گیارھویں اور بارہویں جماعت کی انگریزی میرے کھاتے میں ڈالی گئی تھی۔ گھنٹی بجنے پر میں جماعت کے کمرے میں داخل ہوا تو "تعارف" "تعارف" کا شور ابھرا۔ یہ طالب علم برادری کی پرانی ادا ہے۔ میں نے عالمِ وحشت میں اپنا نام، قابلیت تجربہ وغیرہ بتانے کی رسم نبھائی۔ شکر ہے۔ بات نے طول نہ پکڑا ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے!!

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ انسان اگر اپنے مخاطب کی ذہنی سطح، اس کے مخصوص مزاج اور اس کی پسند، ناپسند کو ملحوظ رکھے اور اسی کے مطابق گفتگو کا معیار مقرر کرے تو اسے بہت سی الجھنوں سے نجات مل سکتی ہے۔ مجھے اعجاز صاحب کی وساطت سے بارھویں جماعت کے ذہنی پس منظر کا علم ہو چکا تھا، اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ کلاس فراق گورکھپوری کے کلام کی رسیا ہے۔ حسن اتفاق سے میں خود بھی "فراق" کا بے حد مدّاح ہوں اور انہیں اس صدی کا ایک قد آور شاعر سمجھتا ہوں۔ میں نے سوچا میری اور میری کلاس کی یہ قدرِ مشترک تو کام آئے گی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ "فراق" نے واقعی میرے اور طالب علموں کے مابین "وصل" کی کیفیت پیدا کر دی۔

کلاس ان دنوں شیلے کی نظمیں پڑھ رہی تھی۔ اور زیر

نظم اسٹینزا (STANZA) زیر بحث تھا

"O LIFT ME FROM THE GRASS!
I DIE, I FAINT, I FAIL!
LET THY LOVE IN KISSES RAIN
ON MY LIPS AND EYELIDS PALE
MY CHEEK IS COLD AND WHITE, ALAS!
MY HEART BEAT LOUD AND FAST;
O PRESS IT CLOSE TO THINE AGAIN
WERE IT WILL BREAT AT LAST;

اس شعری فن پارے کے لازوال حسن کی تشریح کرنا، کسی "دانشور" کے بس کی بات نہیں - اس حسن کو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے، سمجھایا نہیں جا سکتا۔ یہ ایک "نازک" آبگینہ ہے، تندیٔ صہبا سے پگھلنے والا !!

میں نے مقدور بھر ان اشعار کا حسن نکھارنے کی کوشش کی۔ جا بے جا، میں نے فراقؔ اور ندیمؔ قاسمی کے کلام کا سہارا بھی لیا۔ تشریح و توضیح کے دوران جن اشعار نے میری دستگیری کی، انہیں آپ بھی سن لیجئے ؎

سہل نہیں ہے عشق و محبت ہوتی ہے تکلیف بہت
یارو، میرے حال کو دیکھو، اپنا تو نہ یہ حال کرو
فراقؔ

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں چلتا اے دوست
یہ وہ معاملہ ہے جس میں یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں
فراقؔ

زندگی نبض تو دیکھیں تیری
ہم بھی اک نسخۂ غم جانتے ہیں
فراقؔ

میں پھیل جاؤں گا چاروں طرف خلا کی طرح
ابھی وجود ہے میرا، فصیلِ جاں میں اسیر
ندیمؔ

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے
ندیمؔ

اللہ کا شکر ہے، میں نے دورانِ گفتگو اپنے طالب علموں کے چہروں پر شادابی اور طمانیت کی کیفیت نمایاں طور پر بکھری ہوئی دیکھی۔ شام کو بریگیڈیئر اعجاز اکبر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ کہنے لگے۔ استاد تمہاری شاعری کی آج دھوم مچ گئی ہے۔ طالب علم برادری تمہارے شاعرانہ اندازِ بیان سے بہت متاثر ہوئی ہے۔ میں نے محترم سے اپنی تعریف سنی تو قدرے شرما سا گیا۔

دوسری کلاسوں سے بھی میرا پہلے ہی دن تعارف مکمل ہو گیا۔ وہی ریشمی باتیں، وہی گھسے پٹے جملے، وہی معصومانہ نوک جھونک وہی موجِ بلا کے ہلکے پھلکے تھپیڑے!

کالج کے کمانڈنٹ کرنل سردار خان ان دنوں صاحبِ فراش تھے۔ ان کی غیر حاضری میں کالج کی کمان میجر منظور الحسن کے سپرد تھی۔ موصوف انگریزی ادبیات کے استاد تھے۔ ذرا متلوّن مزاج۔ ان کے دو صاحبزادے، مقصود الحسن نوری اور مسعود الحسن نوری میرے شاگرد تھے۔ مصلحت کی لغت کا اصرار تھا کہ میں ان بچوں کی موجودگی میں احتیاط کا دامن ہرگز ہاتھ سے سرکنے نہ دوں، مبادا میرا کوئی غیر محتاط جملہ "صاحب" کی طبع پر گراں گزر جائے۔ اور مجھے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مگر میری یہ کمزوری ہے کہ کلاس روم کے اندر اپنے مرغِ تخیل کو پرواز کی کھلی اجازت دیتا ہوں۔ فکر پہ پہرہ بٹھانے کا میں قائل نہیں، اس سے تمام تخلیقی قوتیں سلب ہو جاتی ہیں۔

میرے "منفرد" اندازِ تدریس کی خبر میجر منظور تک بھی پہنچ گئی (اسے پہنچنا بھی چاہئے تھا) ایک دن وہ مجھے دفتر میں بلا کر کہنے لگے:

سرور صاحب! مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ کتابی اسباق پر توجہ ذرا کم دیتے ہیں، اور اس کی بجائے بچوں کی سوچ میں رچاؤ اور گہرائی پیدا کرنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ چند

کلیوں پر قناعت کر بیٹھنا، ایک اچھے استاد کا شیوہ نہیں۔ آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں۔ یہی تعلیم کی اصل روح ہے۔ لیجیے اب بڑے صاحب کی جانب سے بھی آشیرباد مل گئی۔ اب میں بہت خوش تھا۔ دوسرے دن پہلے پیریڈ میں مجھے بارھویں کلاس میں جانا تھا۔ سو وہاں گیا۔ اُس دن مطلع ابر آلود تھا۔ باہر ہلکی پھلکی پھوار پڑ رہی تھی ..... بالکل "کم کم باد و باراں" والی کیفیت فضا پر عجیب کیف اور سرمستی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کلاس روم میں قدم رکھا ہی تھا کہ "آوازِ دوست" یوں بلند ہوئی، سر! آج موسم بڑا کافرادا ہے۔ آج آپ کسی بڑے فنکار کی کتابِ زندگی کا کوئی ورق پلٹیں۔ درسی کتابوں کو آج چھٹی!! میں یہ فرمائش سن کر فوراً سپر انداز ہوگیا۔ میں نے بات فراق صاحب کے حوالے سے شروع کی۔ اور زلفِ یار جوں جوں دراز ہوتی گئی، کلاس کے انہماک میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ فراق صاحب الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے پروفیسر تھے۔ اور وہ واحد شخص تھے جنہیں یونیورسٹی قواعد کے خلاف کلاس روم میں سگریٹ سلگانے اور دھوئیں کے مرغولے اڑانے کی اجازت تھی۔ ایک دن ہوا یوں کہ فراق صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے۔ موسم سہانا تھا۔ شاعر کی طبیعت مچل گئی۔ انہیں حسن اتفاق سے اُس دن ورڈز ورتھ (WORDS WORTH.) پر لیکچر دینا تھا۔ بات شروع

کرنے سے پہلے انہوں نے ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر اسے سلگانے کی غرض سے میچ بکس کے قریب لائے۔ سلگانے کا عمل شروع ہونے ہی کو تھا کہ "ورڈز ورتھ" صاحب آدھمکے فراق پر حال کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اور انہوں نے عالم بے خودی میں حکمت کے موتی بکھیرنا شروع کر دیئے۔ اسی عمل میں پورا پیریڈ نذر ہوگیا۔ سگریٹ والے کا دابارہ گیا۔ اور دیا سلائی منتظرِ التفات ہی رہی۔

میری کلاس سراپا انہماک بن کر یہ واقعہ سنتی رہی۔ بات ختم ہوئی تو ایک منچلے نے مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔ سر آپ بھی شاعر ہیں۔ آپ بھی کبھی ایسا کر کے دکھائیں۔ سچ، بڑا مزا آئے گا۔ میں نے کہا، پگلے کہیں کے۔ کہاں فراق، کہاں یہ ہیچمدان۔ نہ ہر کہ سر تراشد قلندری داند!!

فراق کے حوالے سے ایک اور واقعہ، جسے سن کر میری کلاس کے چودہ طبق روشن ہوئے، آپ بھی سن لیجئے۔ ہوا یوں کہ گرمیوں کا موسم تھا اور فراق صاحب دنیا و مافیہا سے بے خبر، "گلابی" کی کائنات میں گم، اپنی ذاتی لائبریری میں خالص "معصومانہ" رنگ میں براجمان تھے، لباس (حتےٰ کہ زیر جامہ) کی تمام قیود سے بے نیاز۔ اتنے میں ان کے ایک شاگردِ رشید نے لائبریری میں جھانک کر جو دیکھا تو یہ منظر دیکھتے ہی اس کے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ الٹے پاؤں وہاں سے بھاگا اتنے میں فراق صاحب کی چھٹی حس بیدار ہوگئی۔ انہوں نے نیم مدہوشی کے عالم میں اپنی دھوتی سرکا کر "قابلِ اعتراض" حصول کو ڈھانپ

لیا۔ اور بلند آواز میں اپنے شاگردِ رشید کو پکارا۔ میاں صاحبزادے اندر آجاؤ۔ پردہ ہوگیا ہے۔

ادبی لطائف سننے، سنانے کے اس عمل نے میرے اور میرے شاگردوں کے درمیان خیرسگالی کی ایک بہت عمدہ فضا پیدا کردی۔ اب پڑھائی کے ساتھ ساتھ "عارفانہ" گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ سبق خشک ہو جائے تو دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس میں چاشنی پیدا کردی جائے تو بہار کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ میں نے یہ گر کامیابی کے ساتھ آزمایا ہے۔ میری اس جمہوری اور آزادانہ روش سے میرے سخت گیر قسم کے رفیقانِ کار ہمیشہ نالاں رہے ہیں۔ مگر میں نے اس کی کبھی پروا نہیں کی۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

میری ایماندارانہ رائے ہے کہ استاد اور شاگرد کے مابین اجنبیت اور غیریت کے تمام پردے چاک کردینے چاہئیں۔ اور فکری ہم آہنگی کی کامل فضا پیدا ہونی چاہیئے۔ اور افہام و تفہیم کے رنگ میں تدریس (جو اصل میں تخلیق کا دوسرا نام ہے) کا عمل جاری رکھنا چاہیئے۔ اس طرزِ فکر کی ہر تعلیمی ادارے میں ضرورت ہے۔ خصوصاً اقامتی اداروں میں کیونکہ یہاں تو بچوں کی روحانی، اخلاقی اور جسمانی ساخت پرداخت کی پوری ذمہ داری اساتذہ پر عائد ہوتی ہے "یک لحظ

غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد" کے مصداق ان کی ہلکی سی لغزش نوجوان نسل کے لئے زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔

باب — ۱۸

ملٹری کالج کے بارے میں مزید تفصیلات

میں سنہ ۱۹۶۰ء میں جب ملٹری کالج جہلم پہنچا تو اُس وقت میرے پاس صرف ایم اے انگریزی کی ڈگری تھی۔ گزارہ اچھا چل رہا تھا۔ مگر میری خطر پسند طبیعت چند کلیوں پر قناعت کرنے کی خوگر نہیں۔ میں نے سوچا اردو اور فارسی ادبیات کا ذوق تو میں نے اپنے ابو سے ورثے میں پایا ہے، پھر کیوں نہ ایم اے اردو میں طبع آزمائی کروں جوئندہ یابندہ۔ مجھے راشد صاحب کی ذات میں رہبر مل گیا۔ یادش بخیر! قبلہ راشد صاحب، ملٹری کالج کے حوالے سے خاصی معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے عمرِ عزیز کے کوئی بیس، بائیس سال کالج کی نذر کیے ہیں۔ ان کے شاگرد انہیں بڑے ادب اور احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ راشد صاحب کے انداز میں حد درجہ اپنائیت

ہے۔ وہ صرف شاگرد سے تعلق خاطر استوار نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے والدین سے بھی براہ راست رابطہ قائم کرتے ہیں۔ ان کے احباب کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ اور اس حلقے میں زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے حضرات شامل ہیں۔ راشد صاحب ہر ایک کے بارے میں تازہ ترین معلومات رکھتے ہیں۔ ان کا گھر مرجع خلائق بنا رہتا ہے۔ ویسے آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ موصوف' جہاں اپنے شاگردوں اور لواحقین کے بارے میں اتنی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں، اسی نسبت سے وہ اپنے ساتھیوں سے گریزاں رہتے ہیں۔ ہم لوگ فارغ اوقات میں ملٹری کالج کے اسٹاف روم میں بیٹھ کر جی بھر کر گپ لگایا کرتے تھے۔ قہقہے بھی بلند ہوا کرتے، مسکراہٹیں بھی بکھرتیں دھوئیں کے مرغولے بھی اڑتے کہ غم دوراں کو ہم نے ان مرغولوں کی نذر کرنا سیکھ لیا تھا، مگر راشد صاحب ہمیں کبھی اسٹاف روم میں دکھائی نہ دیتے۔ جونہی خالی پریڈ ملتا، وہ جھٹ لائبریری میں جا براجمان ہوتے یا ہاؤس میں۔ قبلہ بلگرامی صاحب بے حد ظرافت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے وہ راشد صاحب کے بارے میں اکثر کہا کرتے۔ اس شخص کا منٹ سے منٹ جڑا ہوا ہے۔ کہتے، راشد صاحب نے تو اپنے سانسوں کی تعداد بھی گن رکھی ہے۔ اس پابندی وقت کے سلسلے میں بلگرامی صاحب کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے جن

کا تذکرہ یہاں مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں آپ کے مرغِ تخیّل کو پرواز کی زحمت دیتا ہوں۔

تو میں یہ بات کر رہا تھا اپنے اردو ادب میں ایم اے کرنے کے حوالے سے۔ حسنِ اتفاق سے مجھے ایک دن راشد صاحب سے کالج لائبریری میں کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا۔ راشد صاحب گفتگو کے فن میں لاجواب ہیں۔ شروع شروع میں سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر جب ذرا کھل جائیں تو پھر اسے تنہا بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ باتوں باتوں میں مجھے پتہ چلا کہ راشد صاحب، جو اس وقت صرف ایم اے اردو تھے، انگریزی ادبیات پر "نظرِ کرم" ارزانی فرمانا چاہتے ہیں۔ ادھر میں اردو ادب کی غواصی کے لئے بے تاب تھا۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا پیمان باندھا۔ طے پایا کہ ہم دونوں، دوسرے تیسرے دن مل بیٹھا کریں گے اور اس طرح بیک وقت اردو ادب اور انگریزی ادب پر گفتگو کیا کریں گے۔ ہمارا یہ تجربہ خاصہ کامیاب رہا۔ راشد صاحب کو اس عمل میں شاید زیادہ فائدہ نہ پہنچا ہو کہ میرا انگریزی ادب کا علم بس گزارا کرنے کا ہی تھا۔ البتہ میں نے راشد صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔

پروگرام کے مطابق، میں سرِ شام راشد صاحب کے گھر پہنچ جایا کرتا۔ ایک دن میں مقررہ وقت سے کوئی آدھ گھنٹے پہلے وہاں جا پہنچا۔

اس وقت تک مجھے راشد صاحب کی نازک مزاجی کا زیادہ علم نہ تھا۔ میں نے سوچا، آج ذرا زیادہ دیر بیٹھیں گے۔ خوب گپ ہو گی۔ میں نے دستک دی تو بھابی صاحبہ نے میرا استقبال کرتے ہوئے بتایا کہ راشد صاحب سردست نہیں مل سکیں گے وہ "قیلولہ" فرما رہے ہیں۔ "قیلولہ" کا لفظ مجھے عجیب سا لگا۔ مجھے اس کا مطلب نہیں آتا تھا۔ میں دبے پاؤں لوٹ آیا۔ ڈکشنری میں اس کا مطلب دیکھا تو میری ہنسی رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ میں نے سوچا۔ یہ "قیلولہ" تو ہمارا پکا دوست ہے۔ یہ تو ہمارے سنگ سنگ چلتا ہے۔

راشد صاحب کا ڈرائنگ روم، ان کے جمالیاتی رچاؤ اور حسن انتخاب کا عمدہ نمونہ ہے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی آپ کو ایک طرح کی آسودگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ کتابیں انتہائی قرینے اور سلیقے سے سجائی گئی ہیں۔ دیواروں پر عمدہ تصاویر آویزاں ہیں۔ دبیز پردے بیک وقت سادگی اور پرکاری کے مظہر ہیں۔ اس پرفریب و دلاویز ماحول میں بیٹھ کر طبیعت کو بڑا سکون ملتا ہے۔ پھر راشد صاحب کی پہلو دار شخصیت اور ان کی رنگین، شوخ باتیں۔ جی چاہتا ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ ہماری بھابی بھی ماشا اللہ بہت مہمان نواز اور سلیقہ شعار خاتون ہیں۔ میں جب بھی ان کے ہاں جاتا، چائے کی گرم گرم پیالی سے میری تواضع فرماتیں۔ گاہے گاہے الائچی، پان بھی پیش کرتیں جسے میں دانتوں کے نیچے داب کر آن

کی آن میں بگڑ دیتا۔ البتہ راشد صاحب دیر تک "جگالی" کا عمل جاری رکھتے۔

"جگالی" کی بات سے مجھے قبلہ مظہر صاحب یاد آ گئے۔ مظہر صاحب سائنس کے استاد تھے اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ بولتے تو یوں محسوس ہوتا، جیسے زیرِ لب سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ چلتے تو چیونٹی کی چال، ہمہ وقت کسی گہری سوچ میں غلطاں رہتے۔ یوں پتہ چلتا کہ کوئی بھرپور قسم کا غم سینے میں چھپائے بیٹھے ہوں۔ قبلہ بلگرامی صاحب کی ظرافت کی ایک جھلک تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ مظہر صاحب کے ساتھ ان کی خصوصی یاد اللہ تھی۔ جونہی ان کی نگاہ مظہر صاحب پر پڑتی، ان کا مرغِ تخیل پھڑ پھڑاتا ہوا مظہر صاحب کے سر پر منڈلانے لگتا۔

مظہر صاحب مجرّد زندگی گزار رہے تھے اور بقول بلگرامی صاحب صرف دو روپے ماہوار میں گزارہ چلاتے تھے۔ باقی رقم ظالم بینکوں اور ڈاک خانے والے ان سے ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو چھین کر لے جایا کرتے۔ بلگرامی صاحب نے حضرت مظہر کی ذات سے بہت سی کرامات بھی وابستہ کر رکھی تھیں۔ مثلاً موسموں کے تغیّر و تبدّل کی پوری ذمہ داری مظہر صاحب کے سپرد تھی۔ بلگرامی صاحب نے انہیں باور کرا رکھا تھا کہ جونہی ان کی دائیں ہتھیلی میں کھجلی کے آثار پیدا ہوں، بارش چھما چھم برسنا شروع ہو جائے گی۔ دوسری نشانی اسی "جگالی" سے متعلق تھی جس کے حوالے سے ہم نے مظہر صاحب کے ہاں حاضری دی ہے۔ بلگرامی صاحب

کہا کرتے۔ بارش برسنے یا تھمنے کا اندازہ مظہر صاحب کی جگالی کی رفتار سے لگانا چاہیئے۔ اگر وہ پان کی گلوری تیزی سے اوپر، نیچے، دائیں بائیں الٹنا، پلٹنا شروع کر دیں تو سمجھ لیجئے، آئی شامت بیچاری مخلوق خدا کی۔ مظہر صاحب اتنا مینہ برسائیں گے کہ دھرتی جل تھل ہو جائے گی۔ ہاں جگالی کی رفتار نارمل ہو تو سمجھ لیجئے موسم خوشگوار اور معتدل رہے گا۔

قارئین! بات راشد صاحب کے ڈرائینگ روم کے حوالے سے الائچی، سپاری کی ہو رہی تھی۔ ادھر مظہر صاحب نے اڑنگا لگا کر ہمیں روک لیا۔ چلیئے دوبارہ راشد صاحب کے ہاں چلتے ہیں۔ آپ بھی میرا ساتھ دیں گے نا؟ میں وعدہ کرتا ہوں آج راشد صاحب کے ہاں سے آپ کو الائچی کے ساتھ ساتھ ٹافی بھی دلاؤں گا کہ راشد صاحب ترنگ میں آ کر ٹافیاں بھی "حاضرین مجلس" کی خدمت میں پیش کیا کرتے ہیں۔ آپ سمجھتے کیا ہیں!

تو میں عرض کر رہا تھا کہ راشد اور میں دونوں اپنے اپنے "علم و فن" کا بھرپور مظاہرہ کرتے۔ اس عمل سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ مجھے راشد صاحب کی ذاتی لائبریری سے نادر کتابیں پڑھنے کا موقع مل گیا۔ میرے ساتھیوں کو جب پتہ چلا کہ راشد صاحب اپنی ذاتی لائبریری سے مجھے کتابیں مستعار بھی دے دیتے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ ایک ان ہونی سی بات تھی۔ مشہور تھا کہ راشد صاحب کی کتابیں صرف

دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، جنہیں بار بار دیکھا تو جا سکتا تھا مگر چھونے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ہم نے یہ کرامت بھی کر دکھائی۔ ہم جو کتاب چاہتے، اٹھا لاتے راشد صاحب قطعاً مزاحم نہ ہوتے۔

راشد صاحب کی وساطت سے جہاں مجھے اردو ادب کے مختلف دبستانوں سے شناسائی نصیب ہوئی، وہاں میں نے نصابی موضوعات سے ہٹ کر بھی ان سے بہت کچھ سیکھا۔ مہدی افادی، فلک پیما، کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، آل احمد سرور اور رشید احمد صدیقی اور اس طرح کتنے اور مشاہیر کی تازہ ترین تخلیقات مجھے دستیاب ہوئیں۔ یہ کتب بازار میں نایاب تھیں میں نے مہدی افادی کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے راشد صاحب کی رنگین مزاجی میں ان "محترم" کا بڑا دخل عمل ہو۔ فلک پیما کے مضامین نے میری سوچ میں نکھار پیدا کیا۔ کلیم الدین احمد کو میں نے شمشیر برہنہ پایا۔ اس بپھرے ہوئے شیر کی کاٹ سے بچنا مشکل!

ہاں.. میں عرض کر رہا تھا کہ میرے پاس انگریزی ادب کی جتنی کتابیں اور جتنے نوٹس تھے، وہ میں نے سب راشد صاحب کی نذر کیے۔ ان میں برادر عزیز میجر ضیا کے نوٹس بھی شامل تھے جو اُس نے اپنے اساتذہ پروفیسر حمید احمد خان (مرحوم) اور پروفیسر اریک سیپرئین کی رہنمائی میں تیار کیے تھے۔ راشد صاحب اصولوں کے سخت پابند ہیں۔ انہوں نے تمام کتب اور نوٹس استفادہ کے بعد لوٹا دیے...... یہ ایک خوشگوار حیرت کی بات ہے کتاب مستعار لینے کے بعد اسے لوٹانے کا رواج ہمارے

ہاں ہنوز عام نہیں ہوا۔ ویسے میرا بڑا جی چاہتا تھا کہ راشد صاحب کی چند کتب خصوصاً افادات مہدی اور مضامین فلک پیما ہتھیالوں۔ پھر سوچا بات اچھی نہیں۔ ہماری ایمانداری کا بھانڈا خواہ مخواہ پھوٹ جائے گا۔

ہاں تو جب میں اور حضرت راشد اکٹھے مل کر امتحان کی تیاری کر رہے تھے تو کالج میں بڑی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ راشد صاحب کی ذات سے یار لوگوں نے عجیب و غریب باتیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ چند احباب یہ کہتے ہوئے سنے گئے۔ سرور، اب صحیح شخص کے ہتھے چڑھا ہے۔ پھینٹی ملے گی تو سیدھا ہو جائے گا۔ دوسرے حضرات کا کہنا تھا۔ راشد کو ہمیشہ ایک طفیلی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ ہر نئے آنے والے کو پھانسنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان میں سے اکثر اس کی ملائم باتوں میں آ بھی جاتے ہیں۔ مگر جونہی ان پر اصل بات کھلتی ہے، وہ اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ کچھ دوستوں نے مجھے از راہ ہمدردی سمجھایا کہ اس پر حاضری دینے والوں کے نشان مٹ گئے ہیں۔ تم کیوں اپنی ہلاکت کو دعوت دے رہے ہو۔ مگر میں نے کسی کی ایک نہ سنی۔ خدا کا شکر ہے، مجھے راشد صاحب کی رفاقت سے کچھ فائدہ ہی ہوا ہے نقصان ہرگز نہیں ہوا۔ یار لوگ مجھے خواہ مخواہ ڈرا دھمکا رہے تھے۔

ہاں! اس رفاقت کی راہ میں دو چار سخت مقام ضرور پیش آئے ہمارے کمانڈنٹ صاحب کو جب ہمارے "خطرناک" ارادوں کا علم ہوا تو بہت برہم ہوئے۔ فرمانے لگے۔ یہ ایک اقامتی ادارہ ہے،

کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ تم لوگوں نے اپنے مضامین میں ماسٹرز ڈگری لے رکھی ہے۔ یہی کافی ہے۔ زیادہ پاؤں پھیلانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو اس ڈانٹ ڈپٹ کا زیادہ اثر نہ لیا۔ مگر راشد صاحب انگاروں پر لوٹنے لگے۔ میرے سمجھانے بجھانے پر ان کے خون کا دباؤ معمول پر آنا شروع ہوگیا۔ پھر حالات نے ایک خوشگوار کروٹ لی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب کمانڈنٹ صاحب نے ازخود ہمیں امتحان میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔ بادشاہوں کے بھی کیا کہنے۔ گاہے بسلامے برنجند، وگاہے بہ دشنامے خلعت بدہند!

ایم اے کی تیاری کے سلسلے میں میرا اور راشد صاحب کا میل جول بڑھتا گیا۔ ملٹری کالج کی مصروفیات کے باوجود ہم دونوں دوست کچھ نہ کچھ وقت پڑھائی کے لئے نکال ہی لیا کرتے۔ ویسے رات ۱۱ بجے کے لگ بھگ جب میں "ہاؤس" کی سرگرمیوں سے فارغ ہوکر گھر بستر پر آکر گرتا تو میرے بدن کے ہر جوڑ سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوتیں۔ آپ یہ سن کر حیران ہو رہے ہوں گے کہ یہ رات گیارہ بجے لوٹنے کا چکر کیا ہے۔ تو محترم قارئین! بات یہ ہے کہ اقامتی اداروں میں اصل کام اسکول کالج کے باضابطہ اوقات کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ کیڈٹس (CADETS) کلاس روموں سے فارغ ہوکر اپنے ہاسٹل کا رخ کرتے ہیں جسے سرکاری اصطلاح میں "ہاؤس" کہا جاتا ہے۔ ان اداروں کی روایت یہ ہے کہ جس مقام پر لڑکے ہوں۔

وہاں ان کی نگہداشت، دیکھ بھال اور رہنمائی کے لیے سٹاف کا موجود ہونا لازم. کسی موقع پر انہیں تنہا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ اس عمل میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ ان پر مختصر سی بحث ہم تھوڑی دیر بعد کریں گے سردست یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ بچے اگر میس میں کھانا کھانے جاتے ہوں تو کسی انسٹرکٹر کا وہاں موجود ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ انسٹرکٹر کا فرض ہے کہ وہ کچن کا پوری طرح جائزہ لے، کھانے کے معیار کو دیکھے، برتنوں کی صفائی کا خیال رکھے اور اس امر کا اطمینان کرے کہ کھانا ہر لحاظ سے معیاری ہے۔ ہاؤس ماسٹر یا اس کے رفیق کار پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ بچوں کے ساتھ مل کر کھانا بھی کھائے، تاکہ کھانے کے صحیح معیار کا اندازہ ہو سکے۔ دوسری بات بچوں کو کھانے کے آداب سے روشناس کرانا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ دیہات سے آئے ہوئے سخی محمد کو ایس ایم بھٹی اور روشن دین کو آر۔ ڈی ملک بنانے میں بہت تردّد کرنا پڑتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ کام ذاتی توجہ کے بغیر سرانجام نہیں دیا جاسکتا۔

پھر ڈائننگ ہال سے کیڈٹس (CADETS) فارغ ہو کر اپنی اپنی ڈارمیٹریوں کا رُخ کرتے ہیں تاکہ بقول راشد وہ "قیلولہ" کرسکیں۔ ہاؤس اسٹاف یہاں بھی فارغ نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے ہر لحاظ سے یہ تشویش دامنگیر رہتی ہے کہ بچے سونے کی بجائے کہیں غل غپاڑہ نہ شروع کردیں۔ اسے اس بات کا اطمینان کرنا ہوتا ہے کہ ہر بچہ آرام کے اوقات میں بستر پر دراز رہے۔ "سرکاری" نیند اور آرام کا جب وقت ختم ہوتا ہے

تو پھر چائے کا دور چلتا ہے۔ یہاں بھی ماسٹر صاحب کی حاضری لازمی۔ کھیل کے میدان میں موجود رہنا (بلکہ کھیل میں براہ راست شریک ہونا) برحق۔ شام کے وقت اگر مسجد میں اجتماعی نماز کا بندوبست ہو (یہ انتظام اکثر اقامتی اداروں میں ہوتا ہے) تو ماسٹر صاحب وہاں بھی موجود۔ ڈنر میں شمولیت بھی لازم۔ آخری ITEM پریپس (PREPS) کا بپا ہونا ہوتا ہے۔ آپ پریپ (PREP) کے لفظ سے حیران ہو گئے۔ صاحب یہ مخفف ہے PREPARATION کا اور پبلک اسکولوں کی لغت میں یہ اس عمل کا نام ہے جب لڑکے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھ کر اپنا ہوم ورک مکمل کرتے ہیں۔ یہ عمل کوئی دو گھنٹے جاری رہتا ہے۔ کسی کا جی چاہے نہ چاہے، اسے یہ دو گھنٹے اپنی میز کرسی پر بیٹھ کر کتاب کو اپنے سامنے رکھنا پڑتا ہے کہ یہی "موتیوں والی سرکار" کا حکم ہوتا ہے۔ یہ طریق کار بچوں کے اندر نظم و ضبط پیدا کرتے میں بڑا کارگر ثابت ہوتا ہے۔ مگر کئی منچلے، جو پڑھائی لکھائی سے پرہیز کے عادی ہوتے ہیں، بالآخر فرار کی راہیں تلاش کر ہی لیتے ہیں (اجازت ہو تو دو ایک ناگفتنی باتوں کا ذکر کروں)۔

میں ٹیپو ہاؤس میں معمول کے مطابق "گشت" پر ہوں کہ معاً مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ قلم لینے میں نوید کے قریب پہنچتا ہوں جو اپنے مطالعے میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے شوق کا یہ عالم ہے کہ اسے میری موجودگی کا علم تک نہیں ہو پاتا۔ میں

ذرا اونچی آواز میں بولتا ہوں۔ مگر زمین جنبد نہ جنبد . . . . . . میرے اوپر گھبراہٹ طاری ہونے لگتی ہے۔ خدا خیر کرے۔ بات کیا ہے۔ بچہ صحیح سالم آنکھیں کھولے بیٹھا ہے اور کچھ بول نہیں رہا۔ کیا دیکھتا ہوں۔ کچھ لڑکے زیر لب مسکرا رہے ہیں۔ استفسار پر راز کھلتا ہے۔ نوید میاں گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ میں اس سارے عمل پر حیرت کا اظہار کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے ان حضرت نے یہ مشق کی ہوتی ہے کہ سوتے میں آنکھیں کھلی رکھیں۔ تاکہ دیکھنے والے ان کی "نیت" پر کسی قسم کا شک نہ کر سکیں۔ میں یہ سن کر حیران رہ جاتا ہوں۔ بعد میں راز کھلتا ہے صرف نوید میاں ہی اس فن میں مہارت نہیں رکھتے، ہمہ خانہ آفتاب است !!

ایک اور واقعہ !! لڑکے PREPS میں مصروف ہیں۔ میں ایک ڈارمیٹری میں جا کھڑا ہوتا ہوں۔ تمام طالب علموں کو اپنے اپنے کام میں مصروف پاکر میں بہت خوش ہوتا ہوں۔ نذیر میری کلاس کا بہت اچھا لڑکا ہے۔ میں اس کے قریب جا کر رکتا ہوں۔ وہ کتاب کھولے اپنے مطالعہ میں مشغول ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک اٹھتا ہے اور کتاب اس کے ہاتھ سے سرک جاتی ہے۔ اور اس عمل کے دوران کتاب کے اندر سے ایک ہلکی سی چیز نیچے گرتی ہے۔ میں اسے جھک کر اٹھا لیتا ہوں۔ ادھر نذیر کی حالت دیدنی ہے۔ وہ سخت سراسیمگی اور گھبراہٹ کا شکار دکھائی دے رہا ہے۔ میں "کتاب"

کھول کر دیکھتا ہوں تو یہ سعادت حسن منٹو کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں "کالی شلوار" "کھول دو" اور "ٹھنڈا گوشت" جیسے شاہکار افسانے شامل ہیں۔ یہ کتاب تعویذ نما شکل میں پیش کی گئی ہے۔ اور اس کی پیشانی پر جلی حروف میں یہ عبارت درج ہے "چھوٹی کتاب بڑا ادب"۔ اس کتاب کے بیک ٹائیٹل پر اسی "بڑے ادب" کی تفصیلات درج ہیں۔ ان میں ان تمام "عظیم" تصنیفات کا ذکر ہے جنہیں دیکھتے ہی زاہدوں اور پارساؤں کو اپنے ایمان کی خیر منانے کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ میں نے معاملے کی پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ تعویذ نما کتابیں آٹھ آنے میں دستیاب ہو جاتی ہیں۔ اور ان میں عمداً "توبہ شکن" ادب پیش کیا جاتا ہے۔

بڑے ادب کی بات چل نکلی ہے تو ایک اور واقعہ اسی سے ملتا جلتا سن لیجئے۔

موسم گرما کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ کچھ لڑکے اپنا فالتو سامان میرے گھر جمع کر رہے ہیں تاکہ وہ چوری سے محفوظ رہے۔ ماجد علی اپنا بستر، بکس میرے اسٹور میں رکھوا دیتا ہے۔ ماجد بڑا ہونہار اور سمجھدار بچہ ہے۔ غریب خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ گھر والوں کو صاحبزادے سے بڑی امیدیں ہیں۔

ایک دن موسلا دھار بارش کی وجہ سے اسٹور کی چھت ٹپکنے لگتی ہے۔ اس کا ٹپکنا تو برحق ہے۔ یہ نہ ٹپکے تو پھر "گلشن کا کاروبار"

کیسے پچلے۔ جی ہاں۔ اسٹور کی چھت اس بے ساختگی سے ٹپکتی ہے کہ ماجد کا بستر، بکس وکس بھی شرابور ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے ہاؤس بوائے "یعقوب (عمر ۶۰ سال) کو ہدایت کرتا ہوں (سر ا ہے: ہاؤسوں میں کام کرنے والے چوکیداروں، چپڑاسیوں کو "ہاؤس بوائے" ہی کہا جاتا ہے خواہ وہ بیچارے قبر میں ہی پاؤں کیوں نہ لٹکائے بیٹھے ہوں) کہ وہ ماجد کی کتابیں بکس سے نکال کر انہیں باہر دھوپ میں پھیلا دے "تاکہ وہ خشک ہو جائیں۔ میرے "ارشاد" کی جھٹ تعمیل ہو جاتی ہے۔ اور پھر میری نگاہیں ان بکھری ہوئی کتابوں پر جا پڑتی ہیں۔ ارے۔ ان کتابوں میں تو بڑے۔ بڑے "نادر" قسم کے نسخے موجود ہیں۔ دہی وہانوی کے افسانوں کا مجموعہ مجھے پہلی بار دیکھنے کو ملتا ہے۔ نام تو ان "محترم" کا کئی سالوں سے سن رکھا تھا۔ نیاز آج حاصل ہو رہے تھے۔ ادھر پچر رنگین صاحب بھی اپنی پوری غلاظتیں بکھیرتے اور تعفن پھیلاتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں ان کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے دنیا بھر کی کثافتیں اس چھوٹے سے بکس میں بند کر دی گئی ہوں۔

صاحبو! ہم بھٹک کر بہت دور نکل آئے۔ بات ایم اے اردو کی تیاری، راشد صاحب کی رفاقت اور میرے رات گیارہ بجے گھر لوٹنے کی ہو رہی تھی اور تان وہی وہانوی پر جا ٹوٹی۔ دلی معذرت۔ میں عرض کر رہا تھا کہ میں ساڑھے گیارہ بجے رات کے لگ بھگ

کتاب، پنسل لے کر اپنے اسٹڈی روم میں جا بیٹھتا۔ اور پھر میرؔ کے سرہانے بیٹھ کر ہولے ہولے ان سے سرگوشیاں کرنے لگتا۔ اونچی آواز میں عمداً نہ بولتا، مبادا ان کی نیند میں خلل پڑ جائے۔ میری پڑھائی کا یہ عمل رات گئے تک جاری رہتا۔ میرے پڑھنے کا طریقہ یہ رہا ہے۔ کہ کتاب پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے اہم نکات کے نوٹس بھی تیار کرتا جاتا ہوں۔ یہ عمل ہے تو تکلیف دہ، مگر امتحانی نقطہ نظر سے حد درجہ مفید ہے۔ آپ نے اگر کتاب کا عرق کشید کر رکھا ہے تو دہرائی کے وقت اصل کتاب دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان اشارات سے کام چل جاتا ہے۔

ایم اے اردو کی تیاری کے سلسلے میں مجھے رفیق محترم سید عین الدین علوی کی بھرپور رہنمائی بھی میسر آئی۔ علوی صاحب ماشا اللہ ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ اردو اور عربی ادبیات میں ایم اے کر رکھا ہے۔ مگر ان کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا یہ عالم ہے کہ آپ کسی مسئلے پر گفتگو کریں، وہ اپنے تبحرِ علمی سے آپ کو ضرور متاثر کریں گے۔ فلسفہ، عمرانیات، نفسیات، معاشیات، فنونِ لطیفہ پر ان کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔

انہوں نے قدیم اور جدید نظریات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور پھر اپنے فکری اجتہاد سے آزادانہ نتائج مرتب کیے ہیں۔ ان کی سوچ مقلدانہ نہیں، مجتہدانہ ہے۔ وہ ہر مسئلے پر سوچی سمجھی ہوئی رائے رکھتے ہیں اور اپنے مضبوط دلائل کی بنا پر دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا طرزِ استدلال

حد درجہ وزنی ہوتا ہے اور اسے جھٹلانا چنداں آسان نہیں ہوتا۔

آپ کو یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوگی کہ علوی صاحب کے مزاج میں حد درجہ انکساری پائی جاتی ہے۔ دوستوں کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے بے لوث خدمت ان کا شعار ہے۔ ستائش کی پروا اور صلے کی تمنا ہرگز نہیں کرتے مجھے ان کے بہت سے خیالات اور نظریات سے شدید اختلافات رہے ہیں، اور اب بھی ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے، ہمارے تعلقات میں کبھی تلخی کا بھولے سے بھی گزر نہیں ہوا۔

رواداری اور برداشت کی یہ صفت جو علوی صاحب میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے، مجھے بہت کم لوگوں میں دکھائی دیتی ہے، ہم لوگ تو اختلاف کرنے والوں کی زبانیں گُدی سے کھینچ نکالنے کی دھمکیاں دینے پر جھٹ اتر آتے ہیں، مگر علوی صاحب کا معاملہ مختلف ہے۔ ان کے ہاں تنگ نظری نام کے روگ کا گزر ہی نہیں ہوا۔ ویسے ایک بات چپکے سے آپ کے کان میں ڈال دوں۔ علوی صاحب کی سوچ میں زیادہ لچک نہیں وہ اپنے نظریات میں قدرے انتہا پسند واقع ہوتے ہیں اور اپنی رائے سے رجوع ذرا کم ہی فرماتے ہیں، اور ان کی سوچ میں مجھے کلبیت (CYNICISM) کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی معاشی اور معاشرتی ناہمواریوں پر بڑے دلفگار دکھائی دیتے ہیں۔

میں نے اردو ادب کو اس کے سماجی پس منظر میں جاننے کی جو کوششیں

کی ہیں۔ پروفیسر علوی صاحب نے اس ضمن میں ہمیشہ میری رہنمائی فرمائی ہے۔ میں نے انہی کی وساطت سے اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے خد و خال پہچانے۔ علوی صاحب سے میری ملاقات نہ ہوتی تو میں شاید اردو ادب کے بیش بہا تنقیدی سرمائے سے محروم ہی رہتا گو کہ ہماری سوچ کی راہیں یہاں ادبی میدان میں ایک دوسرے سے خاصی مختلف ہیں۔ میں نے علوی صاحب کے ہمہ گیر مطالعہ سے بہت استفادہ کیا۔ میں نے موصوف سے جب بھی کسی نقاد یا شاعر کے حوالے سے بات کرنے کی کوشش کی، انہوں نے ہمیشہ عالمی ادب کے تناظر میں مسئلے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچایا۔ میں نے فلسفہ، عمرانیات اور عالمی ادب پر جتنی مضبوط گرفت علوی صاحب کی دیکھی ہے، اتنی مجھے کسی اور پروفیسر کے ہاں نظر نہیں آئی۔ میں نے بارہا سوچا ہے کہ علوی صاحب جیسے فلسفی اور دانشور کا اصل مقام تو عثمانیہ یونیورسٹی یا جامعہ ازہر ہے۔ ملٹری کالج کے مختصر حدود اربعہ میں تو ان کے جوہر کھل کر سامنے آ ہی نہیں سکتے.

آپ نے ہماری ایم اے اردو کی تیاری کا حال سن لیا۔ دو سال کے بعد ۱۹۶۳ء میں میں اور راشد صاحب دونوں اپنے اپنے مضامین میں شریک امتحان ہوئے۔ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ ہم دونوں کامیاب قرار دیئے گئے۔ بڑی خوشی کا مقام تھا۔ مگر میں یہاں ایک دلچسپ حادثے کا شکار ہو گیا۔ ہوا یوں کہ میں نے صرف ایک نمبر کی کمی سے فسٹ ڈویژن کھو دیا۔ میں

نے ۱۴۴ نمبر حاصل کیے۔ اگر ۱۴۵ نمبر آجاتے تو پھر پانچ رعائتی نمبر حاصل کرنے کا سزاوار ٹھہر سکتا تھا، مگر فسٹ ڈویژن شاید میرے نصیب میں نہ تھا۔ میں بال بال بچا۔

ایم اے اردو کا مجھے مالی فائدہ تو کچھ پہنچا نہیں البتہ میرے کام میں ضرور اضافہ ہوگیا۔ اب مجھے انٹرمیڈیٹ کی انگریزی کلاسوں کے ساتھ ساتھ اردو اختیاری کی انٹرمیڈیٹ کلاس بطور بونس مل گئی۔ یہ کلاس ایسے طالب علموں پر مشتمل تھی جو کانونٹ سکولوں میں پرورش پانے کی وجہ سے اردو زبان سے بے بہرہ تھے۔ گیارھویں جماعت کے طالب علم اردو زبان میں دوسری تیسری جماعت کے بچوں سے زیادہ اہل تر تھے۔ وہ لکھتے کیا تھے، پرائمری کے بچوں کی طرح آڑی ترچھی لکیریں بناتے۔ کتاب پڑھتے تو رک رک کر توتلی زبان میں "تلفظ" ادا کرتے۔ ان کے لہجے سے ان کی "فرنگیت" ہویدا تھی۔ ان کی "معصومیت" دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا۔ نوجوان نسل اپنی قومی زبان سے اتنی بے بہرہ دکھائی دے۔ تو رونا برحق۔ ویسے ان صاحبزادوں کے اعصاب کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہیں بھولے سے بھی اپنی قومی زبان سے محرومی کا احساس نہ ہوا۔ بلکہ انہیں شکوہ تھا کہ یہ اردو پڑھنے کی "مصیبت" خواہ مخواہ ان کے سر تھوپ دی گئی ہے۔

اس نیم انگریز مخلوق کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کا ہمیشہ یہی جی چاہتا کہ کلاس روم میں بس گپ ہوا کرے اور نصابی

اسباق کے سوا تمام موضوعات پر بات چیت ہو۔ میں اس سے پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں کہ میں نے خاصہ جمہوری مزاج پایا ہے۔ میں کلاس کے جذبات کا پورا پورا احترام کرتا ہوں۔ کلاس اگر پڑھائی میں دلچسپی لیتی دکھائی دے تو اسے میں اپنی خوش قسمتی گردانتا ہوں۔ اگر کلاس پڑھائی سے بے نیاز ہو تو ترغیب کے ہتھکنڈے اختیار کرتا ہوں۔ اسباق کو دلچسپ بنانے کی غرض سے کوئی کہانی یا واقعہ سنا دیتا ہوں تاکہ بچوں کے اندر جستجو کا جذبہ ابھرے۔ پھر کہانی جب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہونے لگتی ہے تو میں عمداً رک جاتا ہوں۔ بچوں کا اصرار بڑھنے لگتا ہے، تو پھر اسی مقام سے کہانی شروع کرتا ہوں۔ جہاں سے اس کا سرا ٹوٹا تھا کہانی سنانے کے دوران ہی میں اپنا وار بھی کر جاتا ہوں۔ یعنی باتوں باتوں میں سبق کے نمایاں پہلوؤں پر تبصرہ کرتا جاتا ہوں ... مگر، کچھ غیر محسوس انداز میں لڑکوں کو جب پتہ چلتا ہے کہ انہیں کہانی محض برائے تفنن نہیں سنائی گئی بلکہ اس کی قیمت بھی وصول کر لی گئی ہے تو وہ خاصے حیران ہوتے ہیں۔ چند سخت جان نوجوانوں کو چھوڑ کر جنہوں نے پڑھنے لکھنے سے پرہیز کی قسم کھا رکھی ہوتی ہے، باقی لڑکے اپنے سبق میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔ اور اس طرح افہام وتفہیم کے انداز میں تدریس کا تخلیقی عمل جاری رکھا جا سکتا ہے۔

اب طریق تدریس کی بات چل نکلی ہے تو اجازت دیں کہ میں صیغہ واحد متکلم کے حوالے سے اپنے مخصوص مشاہدات وتجربات،

آپ کی نذر کروں۔

دوران تدریس میں جس بات کا اہتمام کے ساتھ خیال رکھتا ہوں وہ بچوں پر انفرادی توجہ ہے۔ میں اس چیز کا قائل ہوں کہ استاد کو ہر بچے کی ذہنی افتاد، اس کے میلان طبع اور اس کے مخصوص رجحانات سے واقف ہونا ازبس لازم ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ ایک ہی لاٹھی سے سب کو ہانکنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ میرا طریق کار یہ ہے کہ میں سبق کے مطالب بیان کرتے وقت زیادہ تفصیل میں نکل جاتا ہوں۔ سیاق و سباق کے حوالے سے ایسی باتیں بھی زیر بحث لے آتا ہوں جو سبق سے براہ راست متعلق نہیں ہوتیں۔ لیکن بچوں کی ذہنی نشو و نما میں کارگر ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر جب مجھے اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ سبق اوسط درجے یا اونچے درجے کے بچوں کے ذہن نشین ہو چکا ہے تو پھر اسی سبق کا مطلب انتہائی سلیس، عام فہم اور دلنشیں انداز میں بھی بیان کر دیتا ہوں تاکہ "اللہ لوگ" بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔

قارئین! آپ حیران ہوں گے کہ میں ایسی دور از کار بحثوں میں الجھنے کے باوجود کورس کیسے ختم کر لیتا ہوں۔ تو اس کا جواب بھی سن لیجیے۔ میں کتاب کو صفحوں کی تعداد کے حوالے سے پڑھانے کا قائل نہیں ہیں زیادہ خیال اس بات کا رکھتا ہوں کہ اصل توجہ نفس مضمون پر دی

جائے۔ لفظ "معنی" کے گورکھ دھندوں میں الجھنے سے میں ذرا کم ہی سروکار رکھتا ہوں۔ ہمارے "ماہرینِ تعلیم" کی زیادہ تعداد مشکل الفاظ کے معانی واضح کرنے پر اکتفا کرتی ہے۔ انہیں اس سے سروکار نہیں کہ بچوں کی سوچ میں پختگی اور فکر میں راست روی کیونکر اجاگر کی جائے۔

ہمارے اساتذہ اور طلبا کی غالب اکثریت چند کلیوں پر قناعت کرنے کی خوگر ہے۔ اسے "تنگیٔ داماں" کے علاج کی فکر نہیں۔ اور یہ ہمارے مروّج نظامِ تعلیم کا بہت بڑا المیہ ہے۔

میں اپنے طویل تدریسی تجربے کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ استاد کو بھولے سے بھی کلبیت کا کبھی شکار نہیں ہونا چاہیئے ورنہ اس کے مہلک اثرات پوری کلاس تک منتقل ہو جائیں گے۔ استاد کے لبوں پر اگر مسکراہٹ ابھرے گی تو بچوں پر اس کے حد درجہ خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔ باہمی اعتماد اور ہم آہنگی کی فضا ابھرے گی۔ شاگرد اپنے استاد سے پیار کرنا سیکھیں گے، اور خوف کے اثرات سے انہیں نجات مل سکے گی۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ کلاس روم میں پیدا کئے ہوئے خوشگوار ماحول کے اثرات دیرپا ثابت ہوتے ہیں اور طالب علم عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد بھی استاد کے "فرمائے ہوئے" کو "مستند" سمجھتے ہیں۔ پچھلے دنوں مجھ سے سلطان حیدر بجنوری ملنے آئے۔ میرے پرانے شاگرد ہیں اور ماشا اللہ لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز

ہیں ۔ کہنے لگے سر! آپ کی باتیں ہنوز ہمیں یاد ہیں اور ہم پرانے دوست جب مل بیٹھتے ہیں تو آپ کا ذکرِ خیر چھیڑ کر ہم بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر لیتے ہیں ۔ آپ کہیں تو آپ کی کہی ہوئی باتیں آج سناؤں ۔ میرے اشارے پر وہ یوں گویا ہوئے :

سر! آپ کا یہ واقعہ ہمیں کبھی بھول نہیں سکتا ۔ جب ایک دن آپ نے سینما بینی کے "تذکرے میں فلمی گانوں کی "شانِ نزول" یوں بیان کی تھی ۔ بچو! جب تم دیکھو کہ کوئی حسینہ دیوانہ وار، درختوں کی ٹہنیوں سے لپٹ رہی ہو، پھولوں کی ڈالیوں کو ہاتھوں میں بھینچ کر غنچے کلیاں توڑنے میں مصروف ہو، برف پر مستانہ اداؤں کے ساتھ پھسلے چلی جا رہی ہو اور کمر کو بڑے رومانی انداز سے خم دے کر شرما بھی رہی ہو تو فوراً سمجھ لو اسے "گانا آیا ہوا ہے" سر! یہ "گانا آنے" والی "تاریخی بات ہم عمر بھر نہیں بھلا سکتے ۔ ہم نے بارہا سینما ہال میں بیٹھ کر آپ کے مشاہدے کی داد دی ہے ۔

سلطان حیدر نے دوسرا واقعہ کالرج (COLERIDGE) اور چارلس لیمب (CHARLES LAMB) کے حوالے سے سنایا جس کا میں نے کسی موقع پر کلاس میں تذکرہ کیا تھا ۔ بات یہ تھی کہ کالرج بات کرتے وقت اپنی آنکھیں موند لیا کرتا ہے ۔ اور کوٹ کے بٹنوں کو ہاتھوں سے سہلانا شروع کر دیا کرتا تھا ۔ ایک دن چارلس لیمب اس کے ہتھے چڑھ گیا ۔ کالرج نے موقع غنیمت جانا ۔ سو یا آج

تو ایک سمجھدار مچھلی ہاتھ لگی ہے۔ خوب گزرے گی۔ اس نے قبلہ خان (KUBLA KHAN) کے حوالے سے بات شروع کی۔

ANCIENT MARINER کا ذکر بھی چل نکلا اور CHRISTABEL کی تفصیلات بھی بیان ہوئیں۔

کالرج آنکھیں بند کئے ہوتے نان اسٹاپ بولے چلا جا رہا تھا۔ لیمب نے موقع غنیمت جانا۔ دبے پاؤں وہاں سے کھسک کر چل دیا دو ڈھائی گھنٹے گزرنے کے بعد وہ لوٹ کر آیا تو کیا دیکھتا ہے جناب کالرج اپنے "مواعظِ حسنہ" جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیمب پھر دو زانو ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کالرج جب آنکھیں کھولتا ہے تو لیمب کو سراپا نیاز بنے بیٹھا دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ اسے کیا خبر، حضرت لیمب کس خوبصورتی سے اسے جل دے گئے تھے۔

سلطان حیدر نے اور بھی بہت سی باتیں سنائیں۔ مگر ان کا تذکرہ یہاں مناسب نہیں سمجھتا کہ لاف زنی کا ملزم نہ سمجھا جاؤں۔

میں نے استاد محترم پروفیسر اختر صاحب سے یہ سبق سیکھا تھا کہ ذہین و فطین بچوں کو خصوصی توجہ کا مرکز بنانا چاہیئے تاکہ ان کی تخلیقی قوتیں بروئے کار لائی جا سکیں۔ میں نے ان کی تقلید میں ہمیشہ ایسے بچوں کی حوصلہ افزائی کی جن کے اندر مجھے جوہر قابل دکھائی دیا۔ اس ضمن میں مجھے اپنے "مہربانوں" کی بہت سی ناگفتنی باتیں بھی سننا پڑتی تھیں۔ کچھ احباب فرماتے، یہ حضرت

سستی شہرت حاصل کرنے کے درپے ہیں۔ دوسری جانب سے آواز ابھرتی: ہنہیں صاحب یہ ساری تگ و دو اپنی قابلیت کا سکہ منوانے کی غرض سے ہو رہی ہے۔ کرم فرماؤں کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو ہر وقت اسی ٹوہ میں لگا رہتا کہ کہیں نہ کہیں سے ان کے کانوں میں کوئی ایسی بھنک پڑ جائے جسے طول دے کر وہ کوئی اسکینڈل کھڑا کر سکیں۔ ایک آدھ بار تو اس سلسلے میں کوششیں بھی کی گئیں۔ ایک صاحب نے گم نام خطوط لکھوانے اور میرے خلاف گواہی دینے کے لئے مخصوص طلبا کا انتخاب بھی کر لیا۔ مگر خدا کے فضل سے مجھے ان زیرِ زمین سرگرمیوں کا پہلے سے علم ہو گیا۔ میں نے ان صاحب کو بلا کر انہیں دعوت دی کہ وہ خنجر ضرور آزمائیں۔ ہمارا سینہ حاضر ہے۔ مگر ہوا یوں کہ وہ اپنے کئے پر بے حد نادم ہوئے۔ اور غالب کے پرزے اڑنے سے محفوظ رہے۔

ذہین بچوں کی تربیت کا میرا طریق یوں تھا کہ میں انہیں ایک گروپ کی شکل میں ہاؤس کے کامن روم میں اکٹھا کر لیتا اور پھر کسی علمی، ادبی اور تعلیمی موضوع پر بات شروع کر دیتا۔ انہیں مطالعہ کے لئے اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں بھی مہیا کرتا اور پھر جب وہ کتابیں لوٹاتے تو ان کے حسن و قبح پر ہم سب مل کر بات چیت کرتے۔ بچوں کے اندر تحریر اور تقریر کی صلاحیت ابھارنے میں میں نے مقدور بھر حصہ لیا ہے۔ اللہ کا احسان ہے کہ میری کوششیں ناکام نہیں رہیں۔

ویسے میں نے ذہین اور فطین بچوں کی مخصوص افتاد اور ان کے میلان کا جو مطالعہ کیا ہے، اس سے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مخلوق حد درجہ حساس اور جذباتی واقع ہوئی ہے۔ عام بچوں کو آپ ڈانٹ، ڈپٹ لیں۔ وہ برا نہیں منائیں گے۔ مگر انٹی لیکچول (INTELLECTUAL) مخلوق کو آپ کا مزاج ذرا برہم دکھائی دے تو یہ فوراً آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور روٹھ جاتی ہے۔ پھر اسے منانے کے لئے آپ کو کئی حربے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ تب جا کر کہیں اسے "زیر دام" لایا جا سکتا ہے۔ ان کی پسند، ناپسند کے پیمانے بلاشبہ بڑے سخت ہوتے ہیں۔

مجھے یاد پڑتا ہے۔ عزیزان محمود اختر شاہین، ساجد قریشی، جاوید اختر عرف جیدی، ایم زیڈ ارشد عرف زلفی، ہارون رشید عرف فلسفی، یعقوب محمود، خالد اسماعیل قاضی، سہیل رضا، رفیق کیانی اور اس قسم کے چند اور طالب علموں سے میری یاد اللہ تھی۔ ان دوستوں کے ساتھ میری بڑی طویل نشستیں بپا ہوا کرتی تھیں۔ اور بہت سے "مسائلِ تصوف" زیر بحث آیا کرتے۔ گفتگو بڑے خوشگوار ماحول میں ہوا کرتی۔ گاہے اس میں تلخی بھی پیدا ہو جایا کرتی۔ میں نے ان بچوں کے اندر اپنی بات کھل کر بیان کرنے کا حوصلہ پیدا کر دیا تھا۔ وہ جو محسوس کرتے اس کا برملا اظہار کر دیتے۔ میں نے ان کی

سوچ پر پہرہ بٹھانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ مریضانہ عمل ہے۔ ان بچوں کو مجھ سے اکثر یہ شکایت ہوتی کہ میں ان کی بجائے دوسرے بچوں پر زیادہ پیار نچھاور کرتا ہوں۔ جیدی ہمیشہ کہا کرتا۔ سر۔ ہم کس کھیت کی مولی ہیں۔ آپ کو تو زلفی اور فلسفی زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ ادھر زلفی اپنی زلفوں کو اکثر پریشان کیئے رکھتا اور فلسفی کا گہری سوچ میں مُستغرق دکھائی دینا بھی برحق ہر بچے کی یہ خواہش ہوتی کہ اسے مکمل اپنایت کا احساس دلایا جائے۔ انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ سر، اس کی بجائے کسی دوسرے بچے پر بھی اپنی "نگاہِ التفات" مبذول "فرمائیں"۔ اس طرح کی معصومانہ خفگی کا مجھے آئے دن شکار ہونا پڑتا۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ میں ان باتوں کا عادی ہوگیا تھا۔

آپ نے میری زندگی کے ابتدائی واقعات سے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں نے غربت اور افلاس کا کتنا بھیانک دور دیکھا تھا۔ اب جب اللہ پاک نے مجھے خوشحالی سے نواز دیا تھا، میں نے اپنے دل سے عہد کیا کہ میں ہر سال کم از کم ایک نادار بچے کی مالی امداد کروں گا "تاکہ اسے منزل" تک پہنچنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔ میں نے اس کام کی ابتدا ایک ایسے ذہین طالب علم کی امداد سے کی۔ جو آج ماشاء اللہ اونچے درجے کے انجنیئر ہیں۔ اور جن کی قابلیت کی دھوم دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ

حضرت بہت ذہین واقع ہوئے ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے اپنے شاگردوں کے جو نام گنوائے ہیں ان میں ان حضرات کا نام نامی بھی جلوہ فگن ہے۔ بہت ہی غریب اور نادار گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد فوج سے بحیثیت نائیک ریٹائر ہوتے تھے اور ان کے بڑے بھائی راولپنڈی کے ایک دفتر میں لوئر ڈویژن کلرک تھے۔ ان کا گھرانہ سات آٹھ افراد پر مشتمل تھا یہ لوگ تیس روپے ماہانہ کرایہ کے مکان میں مقیم تھے۔ نوبت گاہے فاقوں تک بھی جا پہنچتی تھی۔ میں ان کے خاندانی حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے جب کبھی پنڈی جانے کا اتفاق ہوتا، ان کے ہاں ضرور حاضری دینے چلا جاتا۔

ایف ایس سی کے امتحان میں یہ صاحب اعلےٰ نمبر سے فسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اب انہیں انجنیئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ دلوانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ میں نے صاحبزادے کو اپنے پاس بلا کر تسلی دی۔ بیٹا فکر مت کرو میں تمہارے تعلیمی اخراجات ممکن حد تک برداشت کروں گا۔ میں یہ عہد تین سال تک نبھاتا رہا۔ پھر جب ان صاحب کو فوج میں کمیشن ملا تو مجھے ان کے تیوروں میں نمایاں تبدیلی دکھائی دینے لگی۔ لفٹین، کپتان بننے کے بعد تو انہوں نے ہمیں لفٹ دینا ہی چھوڑ دی اور لگے آنکھ چرانے۔ میں بھی بہت حساس چیز واقع ہوا ہوں۔ میں نے

اپنے خلوص کو یوں برباد ہوتے دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے ان کی ایسی دُرگت بنائی کہ وہ اسے عمر بھر یاد رکھیں گے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ حضرت تو بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کی رنگین داستانوں کا چرچا سنا، تو یقین فرمایئے، میرا جگر خون ہوکر، میری آنکھوں کی راہ ٹپک پڑا۔

اس کے برعکس، آپ اسی فہرست میں سے ایک اور صاحب کو لیں۔ "قبلہ" پڑھائی میں تو زیادہ اچھے نہ تھے۔ مگر ان کے ہاں معصومیت سادگی اور خلوص کی فراوانی تھی۔ میں نے بڑے پیار سے اس بچے کی نشوونما میں حصہ لیا۔ اور اس پر اتنی توجہ دی کہ اس کے گھر والے (جو زیادہ تر ملٹری کالج کے ہی پرانے طالب علم رہ چکے تھے) میرے ممنون احسان ہو گئے۔ قربت بڑھی تو میں نے ان سب نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات پر مستند کتابیں پڑھانا شروع کیں۔ خدا کا شکر ہے میری کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ ماشا اللہ اس خاندان کے سب نوجوان اب پاکیزہ ماحول میں اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔ میں انہیں دین حق کی پیروی کرتے دیکھتا ہوں تو انسانیت پر ڈانواں ڈول ہونے والا میرا ایمان پھر سے لوٹ آتا ہے اور مجھے اپنی ٹھنڈی چھاؤں تلے پناہ دینے لگتا ہے بلاشبہ، زندگی اسی دھوپ چھاؤں کا نام ہے۔

کالج کے طلباء مجھے فارغ اوقات میں اکثر گھیر لیا کرتے۔ میں

بڑی خوشی سے ان کے مسائل سنتا اور حتی المقدور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتا۔ کئی بار مجھے ایسے فلسفیانہ موضوعات میں الجھا دیا جاتا کہ مجھ سے فوری کوئی جواب بن نہ پڑتا۔ میں نے اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ برملا، اپنی جہالت کا اعتراف کر لیتا ہوں۔ بچوں کے اٹھائے ہوئے نکات پر غور کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے سلسلے میں قرآن حکیم سے میں رہنمائی حاصل کرتا۔ علامہ اسد کی کتاب ISLAM AT THE CROSS ROAD شاہ ولی اللہ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" علامہ شبلی سلیمان کی تصنیف "سیرۃ النبی" اور مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے میں استفادہ کرتا۔ اگر کسی سوال کا فوری جواب مجھے درکار ہوتا تو میں علوی صاحب اور "رشیدِ سفید" کے علم سے استفادہ کرتا آپ حیران ہوں گے۔ یہ "رشید سفید" کی شانِ نزول کیا ہے۔ لیجئے سنیئے۔

قبلہ بلگرامی صاحب کی باغ و بہار شخصیت کی جھلک تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ یہ بزرگ پھلجھڑیاں چھوڑنے میں کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں، ان دنوں ملٹری کالج کے اسٹاف پر دو عبدالرشید تعینات تھے۔ دونوں کپتان تھے۔ ایک حاضر نوکر۔ دوسرے ریٹائرڈ۔ حاضر نوکری والے کا کپتان کہلانا برحق۔ مگر دوسرے حضرت بھی چھاتی پر ہاتھ

مار کر کہا کرتے "ہم بھی کپتان ہیں۔ کر لو جو کرنا ہے......" اب مسئلہ یہ تھا کہ دونوں کے مابین کون سا امتیازی نشان مقرر کیا جائے۔ اتفاق سے کپتان رشید کا رنگ سیاہی مائل تھا اور ریٹائرڈ کپتان رشید سرخ و سفید واقع ہوئے تھے۔ ایک دن دونوں کی پہچان کے سلسلے میں کچھ الجھنیں پیدا ہو گئیں۔ جسے بلگرامی صاحب نے یوں حل کر دیا۔ دوستو! پریشان کیوں ہوتے ہو۔ کالے رشید کو رشید اسود اور "چٹے" رشید کو رشید ابیض کہنا شروع کر دو۔ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اسود اور ابیض کے معانی سے واقف حضرات تو اس چٹکی پر بہت محظوظ ہوئے۔ مگر مجھ جیسے ان پڑھ کے پلے کچھ نہ پڑا۔ پھر بلگرامی صاحب نے اس کا آسان ترجمہ یوں پیش کیا۔ بھئی ایک کو "رشید سیاہ" کہو۔ دوسرے کو "رشید سفید"۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ان کی اس نئی "ایجاد" کو قبول عام ملا۔ اب تک لوگ رشید سفید اور رشید سیاہ کی تراکیب استعمال کرتے ہیں اور "ثواب دارین" حاصل کرتے ہیں۔

میں رشید سفید کا ذکر کر رہا تھا کہ بیچ میں یہ سیاہ حضرت بھی آن ٹپکے۔ بارے، ان کا تھوڑا سا ذکر ہو جائے۔ یہ صاحب، بلگرامی صاحب کے خاص معتقدوں میں شمار ہوتے تھے اور مظہر صاحب سے چھیڑ چھاڑ کے عمل میں بڑھ چڑھ کر ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ مگر بظاہر مظہر صاحب کے حضور یوں عقیدت اور نیازمندی کا دم

بھرتے کہ مظہر صاحب انہیں اپنا سب سے "قابل اعتماد" "مرید" سمجھنے لگتے تھے۔ ویسے، مظہر صاحب محفل سے غائب ہوں تو بلگرامی صاحب کو یہ ایسی "پٹی" پڑھاتے کہ اس سے مظہر صاحب کے پرزے اڑانے میں بلگرامی صاحب کو بے حد آسانی ہو جاتی۔

رشید سیاہ، شکار کے بہت زیادہ رسیا تھے۔ ہڑیال، تیتر، مرغابی، "تلہیر"، غرض جو چیز بھی ہاتھ لگتی اسے گرا لیتے۔ ان کا نشانہ بلا کا تھا۔ کوئی چیز بچ کر نہ جا سکتی۔ شکار مار کر لاتے تو شام کے وقت، وہ دوستوں کو اپنے ہاں مدعو کرتے۔

اپنے ہاتھوں سے اپنے شکار کو بھونتے اور اس کے لذیذ قتلے حاضرین کی نذر کرتے۔ میں طبعاً کچھ تن آسان واقع ہوا ہوں۔ شکار کھیلنے میں تو ان کا ساتھ نہ دے سکتا، البتہ شکار، جب پلیٹ میں سجا ہوتا تو میں اپنی رفاقت کا بھرپور ثبوت مہیا کرتا۔ بھونا ہوا "تیتر یا "تلہیر میز پر سجا ہوا ہو تو کون بدبخت ہوگا جو ایسے موقع پر کسی تکلف کا مظاہرہ کرے۔ میں تو ویسے بھی "تکلف برطرف" کے فلسفے کا قائل ہوں۔

تو جناب، رشید صاحب، مظہر صاحب کے ہاں گاہے گاہے "تلہیر، بیٹر کا ایک آدھ "دانہ" بھجوا دیتے۔ مظہر صاحب کسی دوسرے کے ہاتھ کا بھونا ہوا شکار پسند نہ کرتے۔ خود ترکیب خاص سے سالن "تیار کرتے اور مزے لے لے کر اسے استعمال میں لاتے۔

پھر دوسرے دن اپنے مخصوص انداز میں وہ اسٹاف روم میں اس کا تذکرہ چھیڑتے۔ رشید صاحب نے پائے (کھراوڑے) پکانے کے تمام حقوق مظہر صاحب کے نام منتقل کر دیئے تھے۔ ہر روز اصرار ہوتا، مظہر صاحب کبھی کھراوڑے تو کھلائیں۔ مظہر صاحب معنی خیز مسکراہٹ سے سنی، ان سنی کر دیتے۔

پھر ایک دن رشید سیاہ نے یہ خبر کمال سنجیدگی کے ساتھ اسٹاف روم میں اڑا دی کہ مظہر صاحب نے آج تلہیر کے کھرواڑے ایک خاص ترکیب سے پکائے ہیں۔ سب لوگ مسکرائے، تو رشید سیاہ نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ جانتے نہیں ہو۔ مظہر صاحب کے پاس ایسی ترکیب خاص ہے کہ وہ ہنڈیا میں ڈالتے تو تلہیر کے کھراوڑے ہیں مگر جب وہ تین دن تک ہلکی آنچ پر پکتے رہتے ہیں تو وہ اتنا پھول جاتے ہیں کہ دیکھنے میں "سنڈھے" (بھینسے) کے کھراوڑے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مظہر صاحب نے اپنی شان میں یہ قصیدہ سنا تو انہوں نے "جگالی" کی رفتار تیز کر دی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ کن حالات میں اس عمل میں تیزی پیدا کرتے ہیں

رشید سیاہ نے ہمیں مظہر صاحب کے شکار کے کئی واقعات سنا رکھے تھے۔ ایک واقعہ تو انہوں نے مظہر صاحب کی موجودگی میں سنایا جسے موصوف نے ہلکی سی مسکراہٹ اور نیم خاموشی کے عالم میں سنا۔ رشید صاحب نے بتایا کہ ایک دن عالم جوانی میں مظہر صاحب

شکار پر نکلے۔ دیکھا ایک شیر، ایک گھنے درخت کے نیچے آرام کر رہا ہے۔ مظہر صاحب کمال آسانی کے ساتھ اسے اپنی گولی کا نشانہ بنا سکتے تھے۔ مگر وہ دشمن کو یوں للکارے بغیر اڑا دینے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے اپنے لہو کو گرم رکھنے کی خاطر بس یونہی ایک بھاگتے ہوئے ہرن پر گولی چلا دی۔ ان کا وار بھلا کہاں خطا جانے والا تھا۔ گولی ہرن کے سینے کو چاک کرتی ہوئی سوئے ہوئے شیر کے پیٹ میں جا کر پیوست ہو گئی جس نے ذرا سا تڑپنے کے بعد اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مظہر صاحب نے بڑے انہماک کے ساتھ اپنا یہ کارنامہ سنا اور انہوں نے اس کی کوئی تردید نہ کی اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں، خاموشی، نیم رضا!!

آیئے۔ مظہر صاحب اور رشید سیاہ" کو دو دو ہاتھ کرتے چھوڑ کر "رشید سفید" کے ہاں چل کر حاضری دیتے ہیں۔ کہیں یہ حضرت بگڑ ہی نہ جائیں۔ انہیں بگڑتے میں کون سی دیر لگتی ہے۔

میں بچوں کی ذہنی اور اخلاقی نشوونما کے سلسلے میں "رشید سفید" کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ صاحب، ماشاءاللہ قرآن فہمی میں بڑا اونچا مقام رکھتے ہیں۔ عربی زبان پر انہیں خاصا عبور حاصل ہے۔ اور انہوں نے بڑے گہرے غور و فکر کے بعد قرآن کے پیغام کو سمجھا ہے۔ ان کا دوسری دینی کتب کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ آپ

کسی موضوع پر بات چھیڑیں، جھٹ شافی جواب ملے گا۔ ہاں! ان کا طرزِ استدلال علوی صاحب کے انداز سے یکسر مختلف ہے۔ علوی صاحب کا طریق کار بڑا منطقی اور مدلّل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخاطب کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں، جبکہ رشید صاحب اس کے جذبات میں تلاطم بپا کرنے کے قائل ہیں۔ رشید صاحب حق بات ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں۔ جو مانے اس کا بھلا، جو نہ مانے اس کا بھی بھلا۔ دین کے معاملے میں خاصے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی ایسی بات ان کے سامنے کہہ دی جائے جو ان کے اعتقاد سے متصادم ہو تو وہ فوراً سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ اور نتائج کی پروا کئے بغیر فریق ثانی سے ٹکرا جاتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار میں نے کیا دیکھا، رشید صاحب کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے اور مارے غصے کے تلملا رہے ہیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تم سب لوگوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ تم لوگوں کو اپنی افسری کی فکر ہے۔ تمہاری بلا سے، اس ادارے کا سربراہ اس وقت کیا حرکت کر رہا ہے۔

میں یہ سن کر گھبرا گیا۔ پوچھا۔ قبلہ کچھ تو کہئے۔ اس طرح اشاروں کنایوں سے کام نہیں چلے گا۔ آخر ہوا کیا ہے؟ دیکھو۔ کالج کا پرنسپل اس وقت سرِعام لڑکوں کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا ہے اور چلغوزوں اور اخروٹوں سے اپنے چہیتوں کا دل بہلا رہا ہے۔ یاد رہے ادارے

کے سربراہ نے یہ حرکت رمضان شریف کے دوران سرِعام کی تھی۔ یہ رشید صاحب برداشت نہیں کر سکے تھے اور وہ دو ہاتھ کرنے پر تل گئے تھے۔ بالآخر بڑی مشکل سے میں نے اور کیپٹن (حال بریگیڈیئر) اعجاز اکبر نے انہیں اپنے ارادے سے باز رکھا۔ اگر ہم لوگ بروقت مداخلت نہ کرتے تو جانے اس دن کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔

رشید صاحب کے میرے اور اعجاز صاحب سے خصوصی مراسم تھے۔ ہم دونوں انہیں اعتدال کی راہ پر لانے کی پوری پوری کوشش کرتے۔ جس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوتے۔ رشید صاحب نے ہمیں صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ ہماری ہر بات ماننے پر تیار ہیں، مگر دین کے معاملے میں اگر کوئی بدتمیزی کا مرتکب ہوگا تو وہ اس کا سر پھوڑ دیں گے ۔ ۔ ۔ ہر چہ بادا باد!

تو میں عرض کر رہا تھا کہ جب کبھی اسلامی احکامات کے بارے میں مجھے رہنمائی حاصل کرنا ہوتی، میں فوراً رشید صاحب سے رابطہ قائم کرتا۔ وہ ہمیشہ نظرِ کرم مبذول فرماتے۔ ویسے آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں مجھے "رشید سفید" کو چھیڑنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ میں ان کی کمزور رگ کو بس یونہی چھیڑ دیتا، اور پھر بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کا خمیازہ بھی بھگتتا۔ ان کے "ملفوظات" سننے کے بعد بھی "بے مزہ" نہ ہوتا۔

بات بچوں کی ذہنی تربیت کی ہو رہی تھی کہ میں بھٹک کر ذرا دور نکل گیا۔ میں بھی مقدور بھر بچوں کی ذہنی اخلاقی اور جسمانی تربیت

پر توجہ دیتا۔ مگر اس میدان میں اعجاز صاحب کا جواب نہ تھا۔ بلگرامی صاحب اکثر کہا کرتے کہ اعجاز صاحب کا تعلق قومِ جنات سے ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ اعجاز صاحب کالج کی ہر سرگرمی میں حاضر۔ ماشاءاللہ سیمابی طبیعت پائی ہے جو انہیں کسی طور نچلا بیٹھنے نہیں دیتی۔ ابھی ٹیپو ہاؤس کی پہلی ڈارمیٹری میں موجود ہیں۔ آپ آنکھ جھپک کر دیکھیں تو وہ پھلانگ کر چوتھی ڈارمیٹری تک پہنچ چکے ہوں گے۔ وہ ہرن کی مانند "قلانچیں" بھرتے 'یہ جا، وہ جا'، "چھائیں مائیں" ہو جاتے ہیں۔ مجھے ان کی نیاز مندی کا دیرینہ شرف حاصل ہے   ہمارا ایک ساتھ کا سفر ۱۹۵۰۔۵۱ء سے جاری ہے۔ جب ہم دونوں بی ٹی کلاس میں زیرِ تعلیم تھے۔ مگر ان کے ہم رکاب ہونے سے میں ہمیشہ خوفزدہ رہتا ہوں۔ وہ رواں، دواں متحرک شخصیت ہیں۔ ادھر ہم ٹھہرے روایتی سست کوش اور تن آسان۔ ویسے خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں کے مزاج میں اتنے بنیادی فرق کے باوجود ہمارے مابین گزشتہ ۲۸۔۳۰ سال سے برادرانہ مراسم چلے آ رہے ہیں۔ اور حوادثِ زمانہ ان کا بال بیکا نہیں کر سکے ہیں۔

اعجاز صاحب ایک ان تھک کارکن ہیں اور اعلیٰ پائے کے منتظم ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل کام اپنے ہاتھوں سے مکمل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک سال 'جلسہ تقسیمِ اسناد' کے موقع پر وہ مطبخ کے نگران تھے۔ ہوائیوں کر دہی کی مقدار

متدارک بھم پڑ گئی۔ آس پاس کوئی ملازم موجود نہ تھا۔ اعجاز صاحب نے جھٹ دیگچہ اٹھایا اور چل دیئے سوئے سرائے عالمگیر۔ دوستوں نے بہتیرا سمجھایا۔ حضور تھوڑی دیر انتظار کر لیجیے۔ چپڑاسی آجائے گا تو وہ دہی لے آئے گا۔ مگر اعجاز صاحب کے دل کی بے قراریاں انہیں کہاں چین سے بیٹھنے دیتیں۔ وہ ایک نہ مانے اور چل سو چل۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ دہی سے بھرا ہوا دیگچہ اپنے ہاتھوں میں تھامے آدھمکے بلگرامی صاحب نے انہیں مبارک باد دی کہ ان کا دینہ تک جانے کا پھیرا بچ گیا ہے۔ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ بلگرامی صاحب نے اس کی یوں توضیح کی۔ "یہ حضرت دہی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اچھا ہوا، سرائے عالمگیر نے ہی ان کی مشکل آسان کر دی ورنہ انہیں خالی ہاتھ لوٹ کر تھوڑا ہی آنا تھا۔ یہ سرائے عالمگیر سے جہلم تک جاتے اور خدانخواستہ وہاں سے بھی کامیابی نہ ہوتی تو دینہ جا کر دم لیتے۔" یاد رہے سرائے عالمگیر اور دینہ کے مابین کوئی بیس کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔

اعجاز صاحب بظاہر بڑے سخت گیر حاکم دکھائی دیتے ہیں مگر اندر سے ان کا دل ریشم کی مانند نرم ہے۔ مجھے ان کی رفاقت میں کام کرنے کا ٹیپو ہاؤس میں کافی عرصہ موقع ملا۔ میں نے انہیں بارہا دیکھا کہ اگر کوئی بچہ ہاؤس میں بیمار پڑا ہے تو یہ حضرت پوری رات اس کے سرہانے بیٹھ کر گزار دیں گے۔ میں ان سے کئی بار

کہتا۔ "سر آپ اٹھیں اور آرام کریں۔ اللہ نے چاہا تو بچہ ٹھیک ہو جائے گا" مگر وہ میری ایک نہ سنتے کہتے بچہ یہاں والدین سے جدا اکیلا پڑا ہے۔ ہم لوگوں کو ماں اور باپ دونوں کا رول ادا کرنا ہے۔ ذرا سوچو، اگر یہ بچہ اپنے گھر اتنا شدید علیل ہوتا تو اس کے لواحقین کو چین نصیب ہو سکتا؟

جس زمانے میں، میں اور اعجاز صاحب ٹیپو ہاؤس کے نگران تھے، ہمیں نووارد طلبا سے اکثر پالا پڑتا تھا۔ یہ بچے آٹھویں جماعت میں داخلہ لیتے اور ان کے ابتدائی چند ہفتے بڑی بے قراری کی نذر ہو جاتے۔ چھوٹے بچے جب اپنے بہن، بھائیوں سے جدا ہوتے تو ان پر فراق کی یہ ساعتیں بہت بھاری گزرتیں۔ کچھ بچے تو صبر و تحمل کا مظاہرہ کرتے مگر اکثر ایسے دکھائی دیتے۔ جو بڑے دلگداز پیرائے میں آہ و زاریاں کرتے۔ اس طرح کا ایک بچہ مجھے آج تک یاد ہے۔ نام صاحبزادے کا خالد اسماعیل قاضی ہے۔ اور اب ماشاء اللہ میجر کے عہدے پر فائز ہے اپنی "شان" میں یہ "قصیدہ" پڑھ کر شاید وہ خفا بھی ہو جائے، مگر میں تو آج اس کا راز "طشت از بام" کر کے ہی دم لوں گا۔ جو ہو، سو ہو۔

یہ بچہ ٹیپو ہاؤس میں جونہی قدم رکھتا ہے، آنسوؤں کی جھڑی اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتی ہے۔ اور پھر تھمنے کا نام نہیں لیتی۔ یہ عمل وہ رات دن جاری رکھتا ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائیوں

کو فرداً فرداً درد بھرے خط لکھتا ہے۔ انہیں دہائی دیتا ہے کہ وہ آئیں اور اسے اس کنج قفس سے نجات دلائیں۔ اس کے خطوط میں مجھے معصومیت کے ساتھ ساتھ ادبی چاشنی بھی دکھائی دیتی ہے۔ بچہ، غم کے ہاتھوں نڈھال ہو کر بیمار پڑ جاتا ہے اور اسے سی ایم ایچ جہلم منتقل کر دیا جاتا ہے۔ پریشان حال والدین، بچے کی بے قراریاں دیکھ کر تشریف لاتے ہیں۔ وہ بچے کو کالج سے ڈسچارج کرا کر اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہیں۔ مگر میرے اور اعجاز صاحب کے اصرار پر وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتے ہیں۔

خالد کے والد قاضی اسماعیل صاحب سے ہماری یہ رسمی ملاقات دائمی رفاقت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ قاضی صاحب سے استوار کردہ تعلقات آج تک بدستور قائم ہیں۔ موصوف، ماشا اللہ بہت عمدہ رفیق ہیں۔ دوستوں کی خاطر قربانی دینے کا فن کوئی ان سے سیکھے۔ اسم بامسمےٰ ہیں۔ اسماعیلؑ کی سنت، تازہ کرنے میں عجیب حظ محسوس کرتے ہیں۔ صاحب کردار بزرگ ہیں۔ مصلحتوں کے قائل نہیں۔ مزاج میں درویشانہ رنگ جھلکتا ہے۔ جھوٹے خداؤں سے نہ ڈرتے ہیں نہ ان کی خوشامد کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کی نیازمندی کا شرف مجھے ہنوز حاصل ہے۔ جب بھی لاہور جانا ہوتا ہے، ان کے نیاز ضرور حاصل کرتا ہوں ہم مل بیٹھتے ہیں تو جملہ باتوں کے علاوہ خالد کے ابتدائی دور

کی یاد بھی تازہ کرتے ہیں۔ بہت مزا آتا ہے۔ خالد نے تو گریہ وزاری اور نالہ و شیون کے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ آج کل کا تو پتہ نہیں۔ مگر خیال یہ ہے کہ مشکل سے ہی کوئی ماں کا لال ایسا پیدا ہوگا جو رونے دھونے کا اتنا اونچا معیار قائم رکھ سکے۔ اعجاز صاحب رات گئے تک بچے کے سرہانے بیٹھے رہتے۔ کبھی ٹافیاں پیش کرتے، کبھی چیونگ گم۔ خالد کو "گم" چبانے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو کالج کے ہر اس فرد کو چبا ڈالنا چاہتا تھا جس نے بقول اس کے اسے "حبس بے جا" میں ڈال رکھا تھا۔

میرا ایمان ہے کہ اعجاز صاحب کی جگہ اور کوئی ہاؤس ماسٹر ہوتا تو بچہ یقیناً بھاگ جاتا۔ مگر اعجاز صاحب اس طرح سپر انداز ہونے والے کہاں تھے۔ انہوں نے تو اپنے دل سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ صرف اسی وقت چین سے سوئیں گے جب خالد کے دلِ مضطر کو قرار نصیب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نیک عزائم کو ہمیشہ کامیابی سے نوازتا ہے۔ یہی ہوا۔ خالد کے دل کو چند ماہ کی بے قراری کے بعد قرار آ ہی گیا۔ اور پھر اس بچے نے بہت عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اور کالج میں ترقی کرتے کرتے "ہاؤس پریفیکٹ" کے عہدے تک جا پہنچا جو یقیناً ایک بڑا اعزاز ہے۔ آج کل برخوردار جی ایچ کیو میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہا ہے۔ پورا پتہ نہیں بتاؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ اسے تنگ کرنا شروع کر دیں گے۔

بات اعجاز صاحب کی ہمدردی اور انسان دوستی کی ہو رہی تھی۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو دکھ اور تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس ضمن میں میں درجنوں واقعات پیش کر سکتا ہوں مگر اختصار کے پیش نظر صرف اپنے حوالے سے ایک واقعہ سناؤں گا۔

۱۹۶۴ء کے وسط کی بات ہے قبلہ والد صاحب مرحوم و مغفور میرے ہاں بغرض علاج تشریف لائے۔ وہ ان دنوں سخت علیل تھے یوں کہیئے، موت و حیات کی جان گسل کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ جہلم کے مشہور معالج ڈاکٹر صدیق مرزا (مرحوم) کے زیر علاج تھے۔ انہیں ہر شام ڈاکٹر کے ہاں لے جانے کی ذمہ داری اعجاز صاحب نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ اپنی بے پایاں مصروفیات کے باوجود وہ ہر شام والد صاحب کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر جہلم لے جاتے۔ اور رات گئے تک ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کی تیمارداری کرتے۔

پھر جب والد صاحب ۱۶ ستمبر ۱۹۶۴ء کی صبح کو ہسپتال میں ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے تو میں نے اعجاز صاحب کو بچوں کی طرح بلبلاتے دیکھا۔ اس دن انہوں نے اتنے آنسو بہائے کہ اگر انہیں جمع کیا جا سکتا تو یقیناً اس سے ایک خشک تالاب سیراب ہو جاتا۔ میں اس صدمے کے ہاتھوں اتنا نڈھال ہو چکا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ مگر اعجاز صاحب نے ان کی میت گاؤں تک پہنچانے کے انتظامات اس خوش اسلوبی سے طے کئے کہ میں حیران رہ

گیا۔ وہ لاش کے ہمراہ گاؤں تک تشریف لائے اور پھر تجہیز و تکفین کے تقاضے پورے ہونے تک وہیں قیام کیا۔ والد صاحب کا آج بھی ذکر ان کے سامنے چھڑ جائے تو ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔ وہ آپو کی پارسائی کے حد درجہ مداح اور معترف تھے۔ اور انہیں بمنزلہ روحانی باپ سمجھتے تھے۔ آپو بھی یہی کہا کرتے میرے تین بیٹے ہیں۔ سرور، برکت اور اعجاز۔

اباجی کی وفات کی خبر سن کر ملٹری کالج میں سوگ کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اسٹاف کے بیشتر اساتذہ جنازے میں شریک ہوئے۔ قُل، کے موقع پر بھی کافی اسٹاف ممبرز بشمول پرنسپل کالج موجود تھے۔ درود، فاتحہ کے بعد مہمانوں کی خدمت میں جب کھانا پیش کیا گیا تو احباب کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ مرغ مسلم، قورمہ، زردہ وغیرہ سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ احباب پوچھنے لگے سرور، یہ ماجرا کیا ہے؟ اس پر تکلف دعوت کو دیکھ کر تو لگتا ہے جیسے یہاں شادی بیاہ کا اہتمام کیا گیا ہو۔ ماتم کے گھر میں تو اتنی عیاشی ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ ان دوستوں کو یوں ورطۂ حیرت میں ڈوبے دیکھ کر میں نے انہیں بتایا کہ حضور! اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ شادی ہو یا مرگ۔ یہاں مہمانوں کی اگر جی بھر کر تواضع نہ کی جائے تو وہ باہر نکل کر آپ کی تنگ دلی اور پھوہڑپن کا ڈھنڈورا پیٹنے لگتے ہیں۔ اپنی "ناک" بچانے کے لئے کچھ تکلف کرنا ہی پڑتا ہے۔ باتوں باتوں میں جب میں نے

انہیں "ڈکے کی روٹی" کی تفصیل سنائی تو وہ تڑپ اُٹھے آپ بھی چاہیں تو اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل سنا دوں۔

ہوتا یوں ہے کہ دیہات میں اگر کسی کھاتے پیتے گھرانے میں کسی فرد کا انتقال ہو جائے تو پھر ماتمی گھر میں جمع ہونے والی تمام خواتین اور جنازہ میں شریک تمام افراد کو "ڈک کر" (روک کر) کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جنازہ اُٹھتا ہے تو باآوازِ بلند اعلان کیا جاتا ہے کہ تمام حاضرینِ مجلس کھانا کھائے بغیر نہیں جائیں گے۔ تعمیلِ ارشاد میں سب لوگ رُک جاتے ہیں۔ اور پھر غم کھانے کے ساتھ ساتھ حلوہ، پلاؤ بھی کھایا جاتا ہے۔ مضافات سے آئی ہوئی بیبیاں اپنے ہمراہ چاولوں کی سوغات بھی لے جاتی ہیں۔ ان کے بچوں کو انتظار ہوتا ہے۔ پھر یہ سلسلہ مہمانوں کی خاطر مدارات تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ پورے گاؤں کے ہر گھر میں حسبِ توفیق ایک یا ایک سے زیادہ افراد کا کھانا بھجوایا جاتا ہے اسے دیسی زبان میں "سنبھال لینا" کہتے ہیں۔ یہ عمل ہر جمعرات کے روز اور پھر چالیسویں کے موقع پر وسیع پیمانے پر دہرایا جاتا ہے۔ آدمی کتنا ہی پڑھا لکھا اور اعلیٰ عہدے پر فائز کیوں نہ ہو، ان رسومات سے بچ نہیں سکتا۔ اسے ان کے سامنے سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔

پرنسپل صاحب اور دوسرے دوست میری یہ باتیں سن کر مسلسل اپنا سر پیٹتے رہے۔ مجھے ڈانٹ بھی پڑی: تیرے اندر اخلاقی جرأت کی کمی ہے۔ ان خرافات کے آگے یوں سپر انداز ہو جانا کہاں کی دانشمندی

بے جان فضول رسموں کو خیرباد کہو۔ یوں روپے کا ضیاع کیوں کرتے ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنے کرم فرماؤں کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ رہی ان پر عمل پیرا ہونے کی بات۔ تو صاحبو! یہ ذرا مشکل کام ہے۔ میں اگر اس قسم کی کوئی "دہابیانہ" حرکت کر بیٹھوں تو پورے علاقے میں میرا حقہ پانی بند کر دیا جائے۔ ظاہر ہے چند ہزار روپوں کی خاطر میں اتنے بڑے سماجی بائیکاٹ کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔

میں نے ابھی ابھی کالج کے کمانڈنٹ کرنل سردار خان کے حوالے سے کچھ باتیں کی ہیں۔ یہ صاحب اپنے مخصوص مزاج کی بدولت ساری فوج میں مشہور تھے۔ رنگت اتنی سفید تھی کہ لوگ انہیں بجا طور پر انگریز سمجھتے تھے۔ اجنبی انسان انہیں دیکھ کر ہرگز نہ پہچان سکتا کہ یہ دیسی انگریز ہیں یا ولائتی۔ بولتے تو سننے والوں کو ان کے پاکستانی ہونے کا یقین ہو جاتا۔ اردو فر فر بولتے اور پنجابی بھی۔ انگریزی بھی روانی سے بول لیتے۔ گو اس میں پنجابی لہجے کی جھلک ہوتی۔

میں ۱۹۶۰-۶۱ء کی بات کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں آرمی ایجوکیشن کور میں کرنیلوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ اب تو اللہ کا فضل ہے۔ کرنیل چھوڑ، بریگیڈیئرز کی بھی کمی نہیں۔ کرنل سردار خان اپنی مخصوص شکل صورت، وضع قطع اور افتادِ طبع کی بنا پر بڑی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ بنیادی طور پر وہ سخت گیر تھے اور ان میں مخصوص قسم کی انتظامی صلاحیتیں بھی تھیں۔ ایجوکیشن کور کے

حلقوں میں یہ بات عام تھی کہ کرنل صاحب بگڑنے پر آئیں تو پھر وہ "ادب عالیہ" کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ مئی ۱۹۶۵ء میں، جب میرے آرمی اپرنٹس اسکول سے ملٹری کالج جہلم تبادلے کے احکامات موصول ہوئے، تو یار لوگوں نے بڑا ڈرایا۔ استاد، تم بچ کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کہیں ایسا نہ ہو تم پر بھی "ادب لطیف کی پھلجھڑیاں" برسنے لگیں۔ میں تو یہ باتیں سن کر سخت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا۔ مجھے گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے کا چنداں شوق نہیں۔ رقیب لبوں کے شیریں یا تلخ "جوہر" دکھائے، ناچار مجھے بھی اپنے گستاخ لبوں کو جنبش میں لانا پڑے گا۔ پھر معاملہ چوپٹ ہو جائے گا۔ میں ایک دن اپرنٹس اسکول کے اسٹاف روم میں بیٹھا اسی ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ اوپر سے میجر (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) ستار بخش ملک تشریف لے آئے۔ مجھے یوں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھنے لگے، سرور، کچھ پریشان سے لگتے ہو۔ کہو۔ خیریت تو ہے؟ میں نے پھر انہیں اپنے دل مضطر کی ساری کیفیت سنا ڈالی۔ میری باتیں سن کر وہ بہت ہنسے۔ کہنے لگے۔ گھبراؤ نہیں۔ کرنل سردار معقول آدمی ہیں۔ وہ تمہاری "شان" میں کوئی "غزل" یا "قصیدہ" نہیں پڑھیں گے۔ میں انہیں سمجھا دوں گا۔

خدا کا شکر ہے کہ ملٹری کالج میں اپنے طویل قیام کے دوران مجھے کرنل سردار خان کی خشمگین نگاہوں کا ایک بار بھی سامنا نہیں کرنا

پڑا۔ جب بھی ڈانٹ پڑتی، باجماعت، اکیلے میں بچا رہا۔ کرنل صاحب کا زمانہ بڑا پُرآشوب تھا۔ کالج میں آئے دن کوئی نہ کوئی انتظامی مسئلہ سر اٹھا لیتا۔ تسلیم کہ وہ بڑی حکمت اور معاملہ فہمی سے معاملات کو نمٹا لیتے۔ تاہم، جب کبھی کوئی مسئلہ سنگین شکل اختیار کر لیتا تو وہ تمام اسٹاف کو جمع کرتے اور اسے اپنی طویل تقریر سے "نوازتے"! اسٹاف میٹنگ کا جب بھی سرکلر جاری ہوتا، ہمارے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ جانے یہ تقریرِ دلپذیر" کتنے گھنٹے جاری رہے گی۔ منٹوں میں تو اس کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ اسٹاف میٹنگز صرف دفتری اوقات تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اکثر و بیشتر شام کے وقت آفیسرز میس میں بھی بپا ہوتیں۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ ہمارے صبر کو آزمائش کی سخت تپتی کٹھالی سے گزرنا پڑتا۔ تقریر کے دوران کرنل صاحب پر مختلف کیفیات طاری ہوتیں سخت تند و تلخ لہجے میں وہ گفتگو کا آغاز کرتے۔ پھر تھوڑی دیر گرجنے، برسنے کے بعد وہ یکلخت خاموشی اختیار کر لیتے۔ سسپنس (SUSPENSE) پیدا کرنا ان کی مخصوص ادا تھی۔ تقریر کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوتا تو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں ٹھوس شہادتوں کا سہارا لیتے۔ پھر گفتگو ان کے گھر کے افراد کے آس پاس بھی گھومنے لگتی۔ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کا بار بار تذکرہ کرتے اور کالج کی سرگرمیوں پہ ان کے تاثرات سے ہمیں آگاہ کرتے۔ شروع شروع میں تو

ہمیں یہ خالص نجی اور ذاتی گفتگو عجیب سی لگتی تھی۔ پھر ہم لوگ ان کی اس مخصوص ادا کے عادی ہو گئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب کسی میٹنگ میں زلفی، بختی، اِفیتی (یہ ان کے بچوں کے نام تھے) کا ذکر نہ آتا تو ہم لوگ پریشان ہو جاتے۔ خدا خیر کرے۔ جانے آج یہ صاحبزادے کہاں کھو گئے ہیں۔

مجھے درجنوں بلکہ سینکڑوں بار ان کی بپا کی ہوئی کانفرسوں میں شامل ہونے کا "شرف" حاصل ہوا۔ ہر محفل کا رنگ نرالا ہوتا۔ جی چاہتا ہے ان محفلوں پر ذرا کھل کر بات کروں۔ مگر موجودہ کتاب اتنی تفصیلات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ پھر کبھی۔ چلتے چلتے دو محفلوں کا اختصار سے ذکر کروں گا۔ پھر دوسرے کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل مرتضےٰ حسین سے کچھ باتیں کریں گے۔

ایک دن کرنل سردار خان کے حکم کے مطابق ہم لوگ اسٹاف روم میں جمع ہوئے۔ اس دن "سرکار" کے تیور کچھ زیادہ ہی بگڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے لڑکوں کو رنگے ہاتھوں کلاس روم میں باجا (ماؤتھ آرگن) بجاتے پکڑ لیا تھا۔ پھر ہم لوگ دیر تک اس سارے آپریشن کی تفصیلات سنتے رہے۔ پھر انہوں نے یک لخت اس باجے کو اپنے ہونٹوں سے لگا کر سخت برہمی کے عالم میں اسے بجانا شروع کر دیا۔ ہم لوگ حیرت کی تصویر بنے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جب یہ عمل مکمل ہو گیا تو انہوں نے اس باجے

کو اٹھا کر مسٹر حمید کی جانب دے مارا۔ حمید صاحب خوش قسمت تھے۔ بال بال بچ گئے۔ ورنہ وار بڑا کاری تھا۔

دوسرا واقعہ بھی اسی سے ملتا جلتا ہے۔ کرنل صاحب نے ہاؤس کے چند طلباء کی جیبوں سے نوٹ برآمد کئے۔ (اس زمانے میں بچوں کو کیش رکھنے کی اجازت نہ تھی)۔ پھر ہم سب انسٹرکٹروں کی جان پر بنی۔ ایک طویل تقریر سننے کے صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑا۔ تقریر کے اختتام پر انہوں نے تمام غصب شدہ نوٹوں کو اپنی جیب سے نکالا اور بجلی کی تیزی کے ساتھ انہیں چاک کر دیا۔ اور ان کے ٹکڑوں کو فضا میں اڑا دیا۔ یہ ٹکڑے تمام اسٹاف روم میں بکھر گئے۔ کوئی یہاں گرا۔ کوئی وہاں گرا۔

ویسے کرنل صاحب نے اپنے عہد اقتدار میں کالج کی بہبود کے لئے مقدور بھر کوششیں کیں۔ وہ کام نکلوانے کے گُر سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور اسی بنا پر ان کے ہاتھوں کالج کی مادی ضروریات کے بہت سے کام سرانجام پا سکے۔ کرنل صاحب ریٹائر ہوئے تو میں ان سے ملنے، ان کے بنگلے پر حاضر ہوا اور قرآن پاک کا ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ کرنل صاحب نے میرا یہ تحفہ لینے سے انکار کر دیا۔ اور مجھے اس بات کا اتنا قلق ہوا کہ اس واقعہ کو دس بارہ برس گزر جانے کے بعد بھی میں بھلا نہیں سکا ہوں۔ جانے، اس انکار میں انہیں کیا مصلحت دکھائی دی۔ ورنہ

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس کے تو وہ خود بڑے شیدائی تھے۔ ماشاء اللہ بڑا مذہبی ذہن پایا تھا۔ اور شعائرِ اسلامی کے وہ مقدور بھر پابند بھی تھے۔

صاحبو! کالج کے نئے کمانڈنٹ کرنل مرتضٰے بڑے بے تاب دکھائی دے رہے ہیں۔ آیئے۔ ان سے ملتے ہیں۔ یہ صاحب "غُرّانے" میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ہر وقت اپنی ہیبت و جبروت کا سکہ منوانے کی فکر میں لگے رہتے۔ مگر ان کے جاننے والوں کو پوری طرح علم تھا کہ یہ سب کچھ تھوتھا چنا، باجے گھنا والا معاملہ ہے۔ وہ اندر سے اتنے کھوکھلے ہو چکے تھے کہ فضا میں ہلکا سا ارتعاش بھی انہیں بھونچال کی کیفیت سے دوچار کر دیتا۔ ان میں کسی بحرانی کیفیت کا مقابلہ کرنے کی سکت ہی نہ تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کے دبدبے کا بہروپ کچھ دیر تو کارگر ثابت ہوا۔ مگر جب اس کاغذی شیر کی اصل طاقت طلبا پر واضح ہو گئی۔ اور ان کے "کمالات" کھل کر سامنے آنے لگے تو ایک دن انہوں نے کرنل صاحب کے دفتر پر دھاوا بول دیا۔ موصوف "گلابی" کے زیادہ استعمال کی بدولت رعشے کے مرض میں مبتلا تھے۔ اپنے پاؤں تلے سے زمین کو سرکتے دیکھ کر وہ کانپنے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی رواں ہو گئی۔ حالت اتنی بگڑی کہ انہیں ہسپتال پہنچانا پڑا۔ پھر کئی دن بعد ان کی حالت سنبھلی۔ اس جھٹکے نے ان کے حوصلوں

کو اتنا پست کر دیا کہ پھر انہوں نے بھولے سے اپنا ہیبت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بعد میں جتنا عرصہ وہ کالج میں موجود رہے "منقار زیر پر" ہی رہے۔

کرنل سردار خان جب ریٹائر ہوئے تو کالج کی سربراہی کا قرعہ لیفٹیننٹ کرنل مرتضےٰ کے نام نکلا۔ ان کے جاننے والوں کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکے گی۔ کرنل مرتضےٰ تنہا چھوڑنے کے عادی تھے۔ وہ کرانک بیچلر (CHRONIC BACHELOR) تھے، اور تنہائی کے لمحوں میں بوتل ان کا ساتھ دیا کرتی تھی۔ اس "حسینہ" کی رفاقت انہیں اس درجہ عزیز تھی کہ رمضان شریف کے بابرکت مہینے میں بھی اسے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ شروع شروع میں تو لڑکے ان کے مزاج اور ان کے حدود اربعہ کو نہ پہچان سکے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد ان کا اصل رنگ نکھر کر سامنے آنے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ لڑکوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینا شروع کر دیا۔ اس طرح ایک تعلیمی ادارے کا تقدس متاثر ہونے لگا۔

قارئین! کرنل مرتضےٰ نے حافظہ بڑا بلا کا پایا تھا۔ انہیں گزرے ہوئے ایام کی جزئیات تک یاد رہتیں۔ آپ کو یاد ہوگا۔ جس میجر مرتضےٰ سے اپرنٹس اسکول کے آفیسرز میس میں میری مڈبھیڑ ہوئی

تھی وہ آج کرنل مرتضےٰ کی شکل میں میرے سامنے موجود تھے۔ ملٹری کالج میں ہمارا دوبارہ ملاپ ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا باقی نہ رہی جب انہوں نے مجھے اس "حادثے" کی ساری تفصیلات کہہ سنائیں اور مجھے محتاط رہنے کی تلقین کی۔ میں نے اسی وقت بھانپ لیا تھا، عشق کے اس کوچے میں دو چار سخت مقام آنے والے ہیں۔

میں نے ان کی سربراہی کے دوران بہت احتیاط سے کام لینا شروع کر دیا۔ میں کوشش کرتا کہ انہیں کہیں، کسی موقع پر شکایت کا موقع نہ دوں۔ تاہم دو ایک موقعوں پر یہ الجھاؤ ناگزیر ہو گیا۔ تفصیلات آپ کی نذر ہیں۔

میں ملٹری کالج کے سالنامہ "تربیت" کے انگریزی حصے کا نائب مدیر تھا مدیر اعلیٰ پروفیسر حیدری تھے جو ماشا اللہ انگریزی کے بہت فاضل استاد اور منجھے ہوئے انشا پرداز تھے۔ پرچہ مرتب ہوا تو حیدری صاحب نے اداریہ مجھ سے لکھوایا۔ میں نے اپنی سوچ کے مطابق مروّجہ امتحانی نظام کی خامیاں گنوائیں اور اصلاح احوال کی تجاویز بھی پیش کیں۔ حیدری صاحب نے میری تحریر کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا اور اسے حتمی منظوری کے لئے کمانڈنٹ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ یہ اداریہ میرا تحریر کردہ ہے تو انہوں نے مجھے اپنے دفتر بلوا بھیجا۔ حیدری صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ ان کی موجودگی میں وہ میرے

لکھے ہوئے اداریئے کے نقائص بیان کرنے لگے۔ ان کے خیال میں، زبان، بیان، نفسِ مضمون، غرض ہر اعتبار سے میری تحریر غیر معیاری تھی۔ انہوں نے اداریے کے کاغذات میری جانب غصے سے پھینکتے ہوئے فرمایا۔ میں اس پر نظرِ ثانی کروں۔ میں "تڑپا" تو بہت، مگر صبر و سکون سے کام لیا۔ البتہ میں نے خاموش احتجاج کا اظہار یوں کیا۔ کہ ان کاغذات کو ان کے سامنے چاک کرتے ہوئے آتش دان میں ڈال دیئے۔ میری اس حرکت پر وہ "سیخ پا" تو بہت ہوئے، مگر حیدری صاحب کی معاملہ فہمی آڑے آئی۔ اس طرح رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت !!

مرتضےٰ صاحب سے یہ توقع رکھنا کہ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہوں گے، ایک ان ہونی سی بات تھی۔ سب لوگ ان کے مزاج کی رنگینی سے واقف تھے۔ یہاں تک تو معاملہ "قابلِ فہم" تھا کہ یہ ان کے اور ان کے خالق کے مابین معاملہ تھا۔ مگر جب انہوں نے سرِ عام رمضان شریف کی بے حرمتی شروع کر دی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ ان دنوں کالج ہال میں ہر صبح اسٹاف ممبرز باری باری طلبا سے خطاب کیا کرتے تھے۔ میں نے اپنی باری پر بڑے واشگاف لفظوں میں شراب نوشی کے نقصانات گنوائے اور رمضان شریف کے تقدس پر سیر حاصل تقریر کی۔ مرتضےٰ صاحب سمجھ گئے، میرا روئے سخن ان کی جانب تھا۔

اُنہوں نے برملا اپنے غصے کا اظہار تو نہ کیا۔ مگر اُس دن کے بعد مجھے تقریر کرنے سے روک دیا گیا۔ چلیئے۔ وہ روٹھے ہم چھوٹے۔

قارئین! ملٹری کالج کے درودیوار کو آج اپنے تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو بے شمار یادیں میرے سامنے گردش کرنے لگتی ہیں۔ کئی ہستیاں ایسی ہیں جو مجھے پکار پکار کر اپنی جانب بلا رہی ہیں۔ لیجئے چند ایک سے آپ کا تعارف کراتا چلوں

آیئے، نور حسین سے ملیئے۔ یہ مردِ درویش کالج میں چپڑاسی کے فرائض سرانجام دے رہا ہے۔ اس نے عمرِ عزیز کے پچیس سال اسی ادارے کی نذر کیے ہیں اور بڑی محنت اور دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے ہیں۔ اللہ نے ان کی محنت قبول کر لی ہے اور اسے ایک ایسے بیٹے سے نوازا ہے جو حد درجہ ذہین اور قابل ہے۔ یہ لڑکا ہر کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کرتا ہے۔ ایم ایس سی فسٹ کلاس میں پاس کرنے کے بعد وہ ایک خود مختار ادارے میں بطور ریسرچ آفیسر ملازم ہو جاتا ہے۔ آج کل وہ ماشاءاللہ ایک سینئر آفیسر ہے۔ ایک غریب چپڑاسی کے بیٹے کو اتنے اونچے عہدے پر فائز دیکھتا ہوں تو یقین مانیئے میری خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔

اور اب ملیئے چچا غلام محمد سے۔ ہمارا چچا کالج لائبریری میں بطور دفتری ملازم ہے۔ اور اُس کے چہرے پرعزیمت

اور افلاس کے آثار ہویدا ہیں۔ یہ چچا غلام محمد کا بچہ، نور حسین کے لڑکے کی ہمسری تو نہیں کر سکتا۔ تاہم وہ کلاس کے عام لڑکوں سے بہت آگے ہے۔ انٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد وہ کمیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ۲½ سال کی تربیت کے بعد یہ نوجوان، لفٹین کی وردی پہن کر مجھے ملنے آتا ہے اور دورانِ گفتگو بڑی عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ میرے احسانات گنوانے لگتا ہے تو میں اسے تلقین کرتا ہوں کہ مجھے جھک کر سلام کرنے کی بجائے وہ اپنے عظیم باپ کے قدموں پر جا گرے جس نے اسے پستیوں سے نکال کر بلندیوں پر فائز کیا ہے۔

میرا تیسرا دوست معراج دین ہے جو سالہا سال سے کالج میں مالی کے فرائض سر انجام دے رہا ہے۔ کلیوں، غنچوں، پھولوں کی آبیاری کرنے کے صلے میں قدرت نے اسے ایک ایسے سعادت مند بیٹے سے نوازا ہے جو آگے چل کر عملی زندگی میں جوہرِ قابل ثابت ہوتا ہے۔ بچہ چندے آفتاب، چندے ماہتاب۔ تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے اور اپنے والد کی قربانی اور اپنی قابلیت کے بل بوتے پر اکنامکس میں ایم۔ اے کر لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر مقابلے کے امتحان میں نمایاں کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ آج کل برخوردار، ماشاءاللہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہے۔ اس کی سعادت مندی ہے کہ جب کبھی ملتا ہے، بڑے

ادب اور احترام سے ملتا ہے ۔

رزقِ حلال کے چند کرشمے تو آپ نے دیکھے ۔ افلاس کی چکی میں بسنے والے ان بزرگوں کو دیکھ کر مجھے ابّا مرحوم اکثر یاد آجاتے ہیں ۔ انہوں نے بھی اسی طرح کی تکلیفیں جھیل کر مجھے اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور کیا تھا ۔ یہ ان کی بے پایاں قربانیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ میں خدا کے فضل سے آج باعزت مقام تک پہنچ سکا ۔ اباجی کے حضور میرا سلام !!

اور محترم قارئین ! مجھے دسمبر ۱۹۶۸ء کی ایک صبح اپنی اپر ٹوپہ پوسٹنگ کی اطلاع ملتی ہے ۔ آٹھ سال کے طویل قیام کے بعد ملٹری کالج چھوڑتے وقت مجھ پر بڑی "جذباتی" کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ کالج کے طلباء دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں اور یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہتا ہے ۔ آفیسرز میس میں بھی میرے لئے الوداعی عشائیے کا اہتمام کیا جاتا ہے ۔ میرے کرم فرما اپنی اپنی رہائش گاہوں پر بھی دعوتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ۔ جس صبح مجھے کالج سے رخصت ہونا تھا ، تمام طلباء کو موسلے ہال میں جمع کیا جاتا ہے ۔ الوداعی تقریریں ہوتی ہیں ۔ میری "خدمات" گنوائی جاتی ہیں ۔ اور مبالغے کی زبان میں مجھے "خراجِ عقیدت" پیش کیا جاتا ہے ۔ میں دل ہی دل میں سوچنے لگتا ہوں ۔ اگر ان خوبیوں کا (جو میری ذات سے منسوب کی جا رہی ہیں)،

عشرِ عشیر بھی مجھے میسر آجائے تو میرا شمار "پہنچے ہوئے بزرگوں" میں ہوسکتا ہے۔ افسوس میں بہت تہی دامن ہوں۔

میں نے الوداعی تقریر برخلاف معمول انگریزی زبان میں کی۔ اسمبلی میں عموماً میری تقریریں اردو زبان میں ہوا کرتی تھیں۔ الوداعی تقریر کے دوران میرے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی باتیں میرے سامعین کے دلوں پر جاکر گر رہی تھیں۔ میں اس وقت شدید جذباتی کیفیت سے دوچار تھا جس ادارے کو میں نے مسلسل آٹھ سال اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا، آج اسے الوداع کہنے کی گھڑی سر پہ آن کھڑی تھی۔ میں نے اپنی تقریر میں جن نکات پر زور دیا۔ ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

آپ لوگ تحقیق و جستجو کی لگن اپنے اندر پیدا کریں۔ اندھا دھند تقلید سے پرہیز برتیں۔ یہ تقلید جمود کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

اصل الفاظ کچھ یوں تھے۔

"EDUCATION IS NOT TO MAKE ANYTHING OF ANYBODY, BUT SIMPLY TO OPEN THE MINDS OF EVERYONE—TO GO FROM COCKSURE CERTAINTY TO THOUGHTFUL UNCERTAINTY".

محنت سے کبھی جی نہ چرائیں محنت کا اس دنیا میں کوئی بدل نہیں:

NO SUBSTITUTE FOR HARDWORKS

آپ محنت اور لگن سے کام کریں گے تو پاکستان لازمی طور پر ترقی کی رفعتوں کو چھوتے لگے گا۔ —— اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہ کریں۔ اس سے آپ کی اخلاقی موت واقع ہو جائیگی

NO COMPROMISE ON PRINCIPLES

میں اسٹیج سے نیچے اترا تو لڑکوں کی آہوں اور سسکیوں کی دھیمی آوازیں میرے کانوں میں پڑنے لگیں۔ میرے اوپر بھی گداز کی کیفیت طاری تھی۔ آنسو میری آنکھوں میں چھلک رہے تھے اور میں نے انہیں بڑی مشکل سے تھام کر رکھا تھا موسیٰ ہال سے کالج گیٹ (تقریباً ۲ فرلانگ) تک اسٹاف ممبرز اور کالج کے طلبا قطار کی شکل میں کھڑے تھے۔ مجھے پھولوں سے لاد دیا گیا۔ اس طرح میں ملٹری کالج کے باسیوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے عازم مری ہو گیا۔ بچے میرے ہمراہ تھے۔ ان کے بارے میں ابھی تک آپ سے کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ اجازت ہو تو ان کا تھوڑا سا تعارف ہو جائے۔ ۱۹۶۰ء میں، جب میں پنڈی سے پوسٹ ہو کر سرائے عالمگیر پہنچا۔ تو اس وقت ہماری دو صاحبزادیاں... شفقت خالدہ اور نصرت شاہدہ ہمارے ہمراہ تھیں۔ اس سے پہلے کہیں بتا چکا ہوں کہ شفقت سے چھوٹا بچہ خالد محمود ساڑھے چار سال کی عمر کو پہنچ کر اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ بچے کی جدائی کا غم مجھے بھی نڈھال کئے ہوئے تھا۔ مگر اس کی ماں کی حالت بڑی

قابلِ رحم تھی۔ ہر وقت بچے کے فراق میں آنسو بہاتی رہتی۔ میں اسے ہزار سمجھانے کی کوشش کرتا کہ زندگی، موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ہم مجبور انسان، صبر، شکر کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ مگر اس پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ بچے کی جدائی نے زندگی کی تمام خوشیاں اس سے چھین لی تھیں۔ وہ اچھے کپڑے پہننے، اچھا کھانا کھانے اور احباب سے میل جول سے پرہیز برتنے لگی۔ کوئی ملنے آ جائے تو بسم اللہ ورنہ وہ خود کبھی گھر سے باہر نہ نکلتی۔ ہر وقت گہری سوچ میں غلطاں رہتی۔ میرے لئے یہ صورتِ حال خاصی تکلیف دہ تھی۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ہم دکھی لوگوں پر اپنا خصوصی فضل و کرم ارزانی فرمایا۔ ۱۹۶۱ء کے شروع میں اس نے، ہمیں بیٹے ندیم سرور کی دولت سے نوازا۔ ولادت کے موقع پر گاؤں سے میرے ابا جی اور ماسی جی (جو میری خوش دامن بھی تھیں) تشریف لائے ہوئے تھے۔ بچے کی ولادت کی خبر سن کر دونوں بزرگ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے تھے۔ اللہ نے ان کی دعاؤں کو قبول کر لیا تھا۔ نومولود نے ہمارے گھر کی مغموم فضا کو دور کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اب بیگم کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ ابا جی کی بینائی جو خالد محمود کی جدائی کے بعد کافی حد تک زائل ہو گئی تھی، مزید خرابی سے بچ گئی۔ میں نے ان کے لئے بینائی

کے جشمے کا انتظام کر دیا تو وہ بہت خوش ہوتے۔ اور اب قرآن پاک کی تلاوت کے اوقات انہوں نے پہلے سے دگنے تگنے کر دیئے۔

۱۹۶۳ء میں اللہ پاک نے ہمیں ایک اور بیٹا سہیل سرور عطا فرمایا۔ یہ دونوں بیٹے آج کل ماشاء اللہ پڑھائی کے معرکے سر کر رہے ہیں۔ ندیم سرور نے حال ہی میں ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا ہے اسے ڈاکٹر بننے کی دیرینہ خواہش ہے۔ دعا کریں کہ اس کی یہ خواہش بر آئے۔ ندیم پڑھائی میں گہری دلچسپی لیتا ہے۔ درسی کتب کے ساتھ ساتھ اسے کھیلوں سے بھی دلچسپی ہے۔ انگریزی اخبارات بالخصوص کھیلوں کے صفحے کا توجہ سے مطالعہ کرتا ہے۔ اور اہم خبروں کے تراشے اکٹھے کرتا رہتا ہے۔ اس کا البم خاصا دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اخبارات میں مدیر صاحبان کے نام خطوط بھی لکھتا رہتا ہے۔ انہی خطوط کی بدولت اس کی ایک انگریز کرکٹر سے قلمی دوستی بھی ہو گئی ہے۔ دونوں میں خطوط کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ ندیم ماشاء اللہ بہت عمدہ انگریزی لکھتا ہے اور اس کے طرزِ نگارش کو اس کا انگریز دوست بھی پسند کرتا ہے۔

دوسرا صاحبزادہ سہیل سرور ماشاء اللہ دسویں جماعت کا طالب علم

ہے۔ باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ادب و فن میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ سائنس اور ریاضی کے مضامین سے البتہ "پرہیز" کرتا ہے۔ سائنس اور ریاضی میں اس کی حالت خاصی پتلی ہے۔ اردو، فارسی، اسلامیات، معاشرتی علوم وغیرہ میں اس کا مطالعہ اپنے ہم عمروں سے بہتر ہے۔ بچوں کے صفحے "پھول اور کلیاں" میں اس کے مضامین اکثر چھپتے رہتے ہیں۔ اس کی طبیعت میں سادگی پائی جاتی ہے۔ مگر گاہے گاہے مزاج میں "تناؤ" پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ کیفیت عارضی ہوتی ہے۔ دل کا بہت اچھا ہے

سب سے بڑی لڑکی شفقت خالدہ کا تفصیلی تذکرہ آپ میرے مضمون "جگرِ لخت لخت" (سیارہ ڈائجسٹ اگست ۱۹۷۷ء) میں دیکھ سکتے ہیں۔ ماشاءاللہ بیٹی اعلیٰ تعلیم سے متصف ہے۔ اس نے بی اے اور ایم اے (اردو) دونوں امتحان امتیازی شان سے پاس کئے ہیں۔ اور ہر دو میں اسے طلائی تمغے کا مستحق سمجھا گیا ہے۔ اب ماشاءاللہ وہ مقامی کالج میں اردو کی پروفیسر ہے۔ تین سال قبل اس نے کتاب زندگی کا نیا ورق الٹا ہے۔ خدا کے فضل سے اب دو بچوں کی ماں ہے۔ بڑا لڑکا کاشف اقبال عرف مٹھو میرا خاص دوست ہے۔ وہ اپنی معصومانہ اداؤں

سے مجھے بہلائے رکھتا ہے ۔ اس کی ولادت سے قبل میں بہت اداس رہا کرتا تھا ۔ مگر اس نیک بخت بچے کی آمد نے میرے بجھتے ہوئے چراغ میں روغن فراہم کر دیا ۔ اس چیز کے پیش نظر یہ کتاب اس معصوم بچے کے نام منسوب کر رہا ہوں ۔

میں اپنی دوسری لڑکی نصرت شاہدہ کا ذکر چھیڑنے کا ارادہ کرتا ہوں تو قلم ہاتھ سے گرنے لگتا ہے ۔ یہ بدنصیب بچی، اپنے دکھی ماں باپ کے لئے مسلسل سوہان روح ہے ۔ ہماری شامت اعمال، بچی پیدائشی طور پر ذہنی پسماندگی (MENTAL RETARDATION) کا شکار ہے ۔ اور اس کی ذہنی عمر اور جسمانی نشو و نما میں کوئی مطابقت نہیں ۔ جسمانی لحاظ سے وہ بلوغت کے عالم میں ہے ۔ مگر ذہنی اعتبار سے ایک شیر خوار بچے سے زیادہ نہیں ۔ قدرت کا کرشمہ دیکھئے ۔ یہ بچی ہمارے پورے خاندان میں سب سے زیادہ پیاری ہے ۔ ادھر اس کی لاعلاج بیماری ہم پر قیامت ڈھائے چلی جا رہی ہے ۔ بیگم کی طبیعت سہیل اور ندیم کی ولادت کے بعد سنبھلنے لگی تھی ۔ مگر اب پھر ان کی حالت تیزی سے بگڑتی جا رہی ہے ۔ جواں بچی کو اس قابلِ رحم حالت میں دیکھتی ہے تو وہ بے اختیار تڑپنے لگتی ہے ۔ اس مسلسل

کرب، دکھ اور عذاب کے مہلک نتائج اب ابھر کر سامنے آنے لگے ہیں۔ بیگم خون کے دباؤ کی دیرینہ مریض ہیں اب یہ مرض بڑھتے بڑھتے دل کے آس پاس بھی منڈلانے لگا ہے۔ اللہ رحم کرے۔ ہم پہلے ہی دل کے پھیلاؤ کے زخم خوردہ ہیں۔ یہ مرض بھائی صادق اور بہن سکینہ کی شکل میں پہلے ہی ہم سے بھاری خراج وصول کر چکا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے بچوں کی صحت چنداں قابلِ رشک نہیں۔ ندیم، سہیل اور شاہدہ جب چھوٹے تھے تو انہیں کئی بار نمونیہ، تپ محرقہ جیسے موذی امراض کا شکار ہونا پڑا۔ سی ایم ایچ جہلم میں انہیں دو تین بار داخل کرانے کی بھی نوبت آئی۔ وہاں انہیں وقتی طور پر افاقہ ہو جاتا تھا مگر مرض چند ہفتوں بعد پھر عود کر آتا تھا۔ مجھے ان کی صحت کے بارے میں ہر وقت تشویش لاحق رہتی۔ ایک دن میری پریشانی دیکھ کر راشد صاحب کہنے لگے۔ چلیں آپ کو حکیم غلام محی الدین سے ملا لاتا ہوں۔ بہت پائے کے حکیم ہیں۔

چنانچہ میرا تعارف حکیم صاحب سے کرایا گیا۔ مجھے ان سے مل کر ایک خاص خوشی نصیب ہوئی۔ ماشاء اللہ وہ جتنے عمدہ حکیم ہیں، اس سے کہیں بڑھ کر وہ اچھے ساتھی اور دوست ہیں۔ ہمارا تعارف ۱۹۶۶-۶۷ء میں

ہوا۔ بعد میں ان سے راہ و رسم اتنی بڑھی کہ وہ ہمارے فیملی طبیب ہو گئے۔ ذرا تکلیف ہوئی، بلاؤ حکیم صاحب کو۔ ان کا بھلا ہو، وہ اپنا کام کاج چھوڑ فوراً ہمارے گھر تشریف لے آتے اور ہمیں اپنے قیمتی مشوروں اور قیمتی دواؤں سے نوازتے۔ میری خوش قسمتی کہ حکیم صاحب سے میرے مراسم ہنوز قائم ہیں۔ جب بھی ملتے ہیں، بڑی شفقت اور محبت سے پیش آتے ہیں۔ میں نے ان سے صبر و استقلال اور تسلیم و رضا کا گراں قدر سبق سیکھا ہے بات یہ ہے کہ میں کم و بیش ہر ملاقات کے موقع پر اپنی بیٹی شاہدہ کے حوالے سے اپنی محرومی کا ذکر کیا کرتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ مجھے صبر و تحمل کا درس دیا کرتے تھے۔ میں دل ہی دل میں سوچتا۔ اس شخص کو اللہ نے سات، آٹھ بیٹوں کی نعمت سے مالا مال کر رکھا ہے۔ سب بچے ماشاء اللہ تندرست و توانا ہیں۔ اسی لئے انہیں یہ درس دینا بھلا لگتا ہے۔ یہ حضرت کسی آزمائش سے دوچار ہوئے ہوتے تو شاید اس طرح مجھے "مواعظ حسنہ" سے نہ نوازتے۔

مگر ٹھہریئے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر اپنے اس نیک بندے کو گمبھیر آزمائش سے بھی دوچار کیا۔ ہوا یوں، کہ حکیم صاحب کا بڑا لڑکا ڈاکٹر احسان اللہ بی ڈی ایس کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر بیس بائیس سال کی عمر میں موت سے ہمکنار

ہوگیا۔ حکیم صاحب اپنے جواں سال بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ بچے کا اوپر سے بلاوا آگیا۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ آزمائش کی ایسی گھڑیوں میں بڑے بڑے واعظِ اور مبلّغ بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر حکیم صاحب کی استقامت میں ذرہ برابر بھی فرق دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ تسلیم و رضا کا پیکر بنے، اللہ کے فیصلے کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ انہوں نے حرفِ شکایت کو پاس نہیں پھٹکنے دیا۔ اور میں ان کی عظمت کا مزید قائل ہوگیا۔

میرا گاؤں سرگ ڈھن، جہلم شہر سے ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ گاؤں میں ناخواندگی کی شرح خاصی "بلند" ہے۔ لہٰذا جہالت کا وجود برحق۔ لوگ مقدمہ بازی میں اکثر ملوث پائے جاتے ہیں۔ مجھے ان میں سے اکثر کی "میزبانی" کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا ہے۔ طعام قیام کے علاوہ کسی موزوں وکیل سے ان کا تعارف کرانے اور بھاؤ چکانے کا فریضہ بھی مجھے سرانجام دینا پڑتا تھا۔ اس حوالے سے میری راہ و رسم جہلم کے چند وکلا سے پیدا ہوگئی۔ ملک شیر علی خان کا تو خیر تعلق ہی میرے گاؤں سے ہے۔ ان سے پرانی یاد اللہ ہے۔ ان کے علاوہ شیخ فتح محمد، محمد منیر، چوہدری انور اور حافظ کفایت اللہ صاحب سے بھی میں متعارف ہوگیا۔ نیرؔ صاحب سے تو بہت قریبی

مراسم استوار ہو گئے۔ میں نے انہیں بہت مخلص، بہت نیک اور بہت ہمدرد انسان پایا ہے۔ موصوف بھرپور انسانی صفات سے بہرہ ور ہیں۔ اور لاکھوں میں ایک ہیں۔

فوج میں شامل ہونے سے پہلے برادر عزیز برکت ضیا جہلم گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ میرے دیرینہ استاد پروفیسر اختر حسین صاحب بھی صدر شعبہ انگریزی تھے۔ ان احباب کی بدولت پروفیسر صاحبان سے میری راہ و رسم پیدا ہو گئی۔ اور پھر میں نے جہلم شہر کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ جہلم کے مشہور معالج ڈاکٹر حقیق مرزا (مرحوم) ادبی سرگرمیوں کی روح رواں تھے۔ ان سے بھی شناسائی پیدا ہوئی جس نے بعد میں دوستی کی شکل پیدا کر لی۔ مصطفیٰ زیدی اس زمانے میں جہلم میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کا کلام سننے کے بھی کئی مواقع ملے۔ اس طرح ایک محفل میں پروفیسر حمید احمد خان مرحوم کے زرّیں خیالات سننے کا اتفاق ہوا۔ اہنوں نے میونسپل ہال جہلم میں اقبال کے نظریۂ تعلیم پر ایک خیال افروز تقریر کی۔ محفل برخاست ہونے پر برخوردار ضیاء نے پروفیسر صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ خان صاحب بڑی شفقت سے پیش آئے۔ چائے کا دور چلا تو خان صاحب نے منتظمین کو ہدایت کی کہ وہ پہلے ڈرائیور کو چائے پلائیں۔

فوراً حکم کی تعمیل ہوئی۔ خان صاحب اپنے ہونٹوں کے قریب چائے کے پیالے کو اسی وقت لائے جب انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے ڈرائیور نے بھی چائے پی لی ہے۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔ سرور صاحب! ہم لوگ ان غریب لوگوں کے معاملے میں بہت غفلت برتتے ہیں۔ ڈرائیور، چپڑاسی ہماری خدمت بجا لانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ ہم لوگ ان سے جا بجا بہت سے کام لیتے ہیں۔ مگر ایسے موقعوں پر ہم انہیں چائے کی پیالی تک پلانا گوارا نہیں کرتے۔ مجھے خان صاحب کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اور دل سے تہیہ کیا کہ آئندہ میں بھی خان صاحب کے فارمولے پر عمل کروں گا۔ میں ۱۹۶۶-۶۷ء سے اس فارمولے پر کاربند ہوں۔ جہاں جاتا ہوں ڈرائیور کے چائے پانی کا خاص خیال رکھتا ہوں اور ایسا کرتے وقت مجھے خان صاحب بہت یاد آتے ہیں۔

ملٹری کالج کے آٹھ سالہ قیام پر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے یک گونہ اطمینان ہونے لگتا ہے۔ دورِ حاضر میں استاد اور شاگرد کا مقدس رشتہ توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکا ہے۔ تدریس کے پیشے کا تقدس ختم ہو چکا ہے۔ ادھر طالب علم برادری پڑھنے لکھنے کے سوا، دنیا کے ہر دوسرے مشغلے میں دلچسپی

لیتی ہے۔ استادوں کی ذہنیت تاجرانہ ہو گئی ہے۔ شاگرد گستاخ اور بدتمیز ہوتے جا رہے ہیں۔ استادوں کا احترام نہیں کرتے۔ بڑے خود سر اور ناہنجار ہو گئے ہیں۔ اس طرح بہت سی ناگفتنی باتیں آئے دن سننے کو ملتی ہیں۔ ان میں کسی حد تک صداقت بھی ہے۔ مگر میرا تجربہ ذرا مختلف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل ہے کہ میرے شاگرد، دل و جان سے میری عزت کرتے ہیں اور میرے اشارے پر بڑی بڑی صعوبتیں اٹھانے کو بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ پندرہ، پندرہ سال پرانے شاگرد آج بھی مجھے ملنے آتے ہیں، اور ایسی عقیدت و احترام کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی نیازمندی دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔

طالب علموں کی اس اجتماعی بے راہ روی کے تناظر میں اپنے ساتھ شاگردوں کی عقیدت کا موازنہ کرتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بچوں کا اعتماد حاصل کرنا استاد کے اپنے اختیار میں ہے۔ اگر استاد، اپنے شاگردوں کا سچا بھی خواہ ہو، ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک ہو، ان کے جذبات کی قدر کرتا ہو، ان کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا عزم رکھتا ہو، انہیں زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرانے کی تڑپ رکھتا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے آج بھی

اتنا ہی پیار اور احترام نہ ملے جو پرانے دور کے اساتذہ کا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ آگ، آج بھی انداز گلستاں پیدا کر سکتی ہے، ابراہیمؑ کا ایمان پیدا کرنا البتہ شرط ہے۔

معافی چاہتا ہوں۔ میں نے "ترنگ" میں آکر دور کی کوڑی لانا شروع کر دی .... ایک "استاد" کی ازلی کمزوری۔ ہم تو مری جا رہے تھے۔ آیئے اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کرتے ہیں۔

باب — ۱۹

مری کی وادیوں میں

میں مارچ ۱۹۶۸ء کی کسی تاریخ کو اسکول میں وارد ہوا۔ اس زمانے میں اسکول کے کمانڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل (بعد میں بریگیڈیئر) نذیر احمد تھے۔ ملٹری کالج جہلم میں مجھے مختصر عرصے کے لیے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور میں ان کی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کا زبردست مداح تھا۔ موصوف کو اپر ٹوپہ، مری پوسٹنگ کی اطلاع ملی تو انہوں نے مجھے ایک ذاتی خط (ڈی او لیٹر) لکھا جس میں انہوں نے میری پوسٹنگ کو اسکول کے لیے نیک فال قرار دیا۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی کی واضح دلیل تھی۔

میں اپر ٹوپہ پہنچا تو پتہ چلا کہ ان دنوں آرمی ایجوکیشن کور کے سالانہ اجتماع کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مجھے استقبالیہ کمیٹی

کا انچارج بنا دیا گیا۔ اس طرح مجھے ایجوکیشن کور کے تمام افسروں اور مری میں مقیم دیگر فوجی افسروں کو خوش آمدید کہنے کا موقع مل گیا۔

کانفرنس ختم ہوئی تو میں نے دبی زبان میں کرنل صاحب سے ایک دن کی چھٹی کی درخواست کی۔ وہ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ مگر بات سنتے ہی وہ سنجیدہ سے ہو گئے۔ فرمانے لگے۔ ایک دن کی چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں یہ جواب سن کر چپ ہو رہا۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ موصوف ذرا سی خاموشی کے بعد یوں گویا ہوئے:

”سرور صاحب! آپ بھی عجیب انسان ہیں۔ صرف ایک دن کی چھٹی ...... چہ معنی دارد؟ یہاں کوئی لام نہیں لگی ہوئی ہے۔ آپ کو میں ایک دن کی چھٹی نہیں دے سکتا۔ جانا ہے تو تین چار دنوں کے لئے جائیے۔ تکلّف مت برتیئے۔“

میں ان کی عظمت کا پہلے سے ہی بڑا معترف تھا۔ اس واقعہ نے تو ان کی قدر میں مزید اضافہ کر دیا۔

آرمی ایجوکیشن پریس کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ یہ اشاعتی ادارہ گزشتہ دس سال سے گراں قدر علمی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ اس کے زیر اہتمام کثیر تعداد میں علمی، عسکری، مذہبی موضوعات پر بلند پایہ تصنیفات منظر عام پر آچکی

ہیں ۔ آرمی بک کلب اسی کا ذیلی ادارہ ہے۔ جو ساٹھ روپے کے عوض آرمی آفیسرز کو سال میں تین معیاری کتابیں مہیا کرتا ہے۔ اس ادارے کی داغ بیل بھی کرنل نذیر صاحب نے اپنے ہاتھوں سے اپر ٹوپہ میں رکھی تھی۔ ابتدائی نوعیت کا کام ان کے زمانے میں سرانجام پایا۔ پھر موجودہ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن، بریگیڈیئر سید نصیرالدین کے زیرِ نگرانی اس ادارے نے ترقی کی نئی رفعتوں کو چھوا۔

بریگیڈیئر نذیر نے بجا طور پر محسوس کیا تھا کہ فوج میں ایسی درسی کتابوں کا فقدان ہے جو ایک آزاد، نظریاتی مملکت کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ پاکستان بنے کئی سال گزر چکے تھے۔ مگر فوج میں ہنوز وہی کتابیں پڑھائی جا رہی تھیں جو آزادی سے پہلے انگریزوں نے اپنے ذاتی مفادات کے پیشِ نظر تیار کروائی تھیں۔ وہی BASIC ENGLISH وہی راما، کرشن، میری اور ڈیوڈ کے قصے۔ وہی کرسمس اور دیوالی کے تہواروں کی داستانیں۔ وہی سلطنت انگلشیہ کی برکتیں گنواتے کا تکلیف دہ عمل۔ ایک آزاد قوم کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے نئی کتابیں تیار کرانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔

بریگیڈیئر نذیر صاحب نے بڑے مشکل حالات میں اس تحقیقی کام کا ڈول ڈالا تھا۔ فنڈز کی کمی، ادارتی عملے کا فقدان تحقیق

تخلیق کے لئے مناسب مراعات کی نایابی۔ یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ بہت وزنی تھیں۔ مگر بریگیڈیئر نذیر کے جوہر تو بحران کے عالم میں ہی کھل کر سامنے آتے تھے۔ انہوں نے اپنے اردگرد چند جے سی او صاحبان کو جمع کیا۔ اور ان کے تعاون سے ایک آدھ سال کے عرصے میں درجنوں کتابیں تصنیف کرا ڈالیں۔

صوبیدار میجر احمد خان، صوبیدار افضل تحسین، صوبیدار رمضان احسن، صوبیدار عبداللہ آنریری کیپٹن ایس وائی حسن اور اس طرح کے چند اور اہلِ قلم حضرات نے اپنی شب و روز کی محنت سے اس نوخیز پودے کی آبیاری کی۔ بریگیڈیئر نذیر گاہے گاہے مجھے بھی اس کام میں شریک کر لیا کرتے۔ اکثر مسوّدوں کی نظرِ ثانی کا مجھے شرف حاصل رہا ہے۔ موصوف خود ماہرِ تعلیم ہیں۔ مگر ان کے ظرف کا یہ عالم ہے کہ اگر مجھ جیسا ہیچمدان بھی ان کی کسی رائے سے اختلاف کرے تو بلا تامّل اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ علم کے صحیح معنوں میں قدر دان ہیں۔ ان کے نزدیک انسان کا اصل جوہر اس کے علمی سرمائے سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ اکثر فرماتے: ”میں علم کے معاملے میں کندھے پر جھلمل کرتے ہوئے ستاروں سے مرعوب نہیں ہوتا۔ میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ ذہن کے نہاں خانوں میں بھی کوئی ستارہ اپنی کرن بکھیر رہا ہے یا نہیں۔“

میں نے مسودوں پر نظرِ ثانی کے علاوہ چند کتابوں کی تالیف میں بھی حصّہ لیا۔ ان میں آرمی سپیشل کی اردو کتب (حصّہ نثر و نظم) اور (CORRECT YOUR ENGLISH) کی دو سیریز قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب اسلامیات برائے سیکنڈ اسٹینڈرڈ ان کے علاوہ ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بریگیڈیئر صاحب نے جب مجھے "CORRECT YOUR ENGLISH". لکھنے کا کام سونپا تو میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا۔ سر۔ آپ "قوم" کی انگریزی ٹھیک کرانے کا کام اس شخص کو سونپ رہے ہیں! جو خود زندگی بھر صحیح انشا نہیں لکھ سکا ہے۔ بریگیڈیئر صاحب یہ سن کر بہت محظوظ ہوئے کہنے لگے ٹھیک کہتے ہو۔ مگر جو شخص مدیرِ اعلیٰ (ان کا اشارہ اپنی ذات کی طرف تھا) کے ڈرافٹ اتنی عمدگی سے ٹھیک کرتا ہو، اس کی غلط انگریزی بھی ہمیں "منظور" ہے۔ اس طرح بات قہقہوں کی نذر ہو گئی۔

قارئین! کتابوں کی تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ میں نے اپر ٹوپہ کے قیام کے دوران اسکول میں مروّج تمام کورسوں میں بھرپور دلچسپی لی اور شاید یہ کہنا خود ستائی میں شمار نہ کیا جائے کہ تمام کورس افسروں کو متاثر کیا۔ اس مقبولیت کا دائرہ صرف افسروں تک ہی محدود نہ تھا، جے سی او صاحبان اور جوان بھی بہت خوش تھے۔ کورس

اسٹوڈنٹس میرے پیریڈ کا انتظار کرتے۔ ہمہ تن گوش ہو کر میری باتیں سنتے۔ اہم نکات کے نوٹس لیتے۔ مختصراً میرے "فرمائے ہوئے" کو بڑا مستند سمجھتے!

اب "خود نمائی" کی باتیں چل نکلی ہیں تو بارے ذرا یہ ذکر تفصیل سے ہو جائے۔ اگر واحد متکلّم کی تکرار آپ کی طبع نازک پر گراں گزرے تو معاف کر دیجئے۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے لیکچروں کو جو پذیرائی نصیب ہوتی تھی، اس کی بنیادی وجہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے۔ دوسرے عوامل کی کارفرمائی کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

میری کامیابی کا راز یہ تھا کہ میں کلاس روم میں داخل ہونے سے پہلے اپنے سبق کی بھرپور تیاری کرتا۔ بغیر تیاری کے کلاس روم میں داخل ہونا، میں کب کا ترک کر چکا تھا۔ میری تیاری کا رنگ یہ تھا کہ سبق تیار کرتے وقت میں موضوع زیر بحث سے متعلق دوسرے تمام پہلوؤں کو بھی نظر میں رکھتا۔ مثلاً اگر مجھے مغربی ماہرینِ تعلیم ڈیوی، پسٹالوزی، فروبیل، رسل کا ذکر مقصود ہوتا تو لازمی طور پر میرے لیکچر میں غزالی، ابن خلدون ابن تیمیہ، اقبال کی بات بھی چل نکلتی۔ اس تقابلی مطالعے سے لیکچر زیادہ معلوماتی ہو جاتا اور سامعین کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

سبق تیار کرتے وقت میرے پیشِ نظر کلاس کے تمام طالب علم ہوتے۔ میں اپنے اسباق کو یوں ترتیب دیتا کہ اس سے ذہین لوگ بھی استفادہ کر سکیں اوسط قابلیت کے شاگرد بھی مستفید ہوں اور "گھامڑ" قسم کی مخلوق بھی خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ یہ کام صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب مجھے اپنی کلاس کے طالب علم کی استعداد کا صحیح اندازہ ہوتا۔ میں نے ذاتی طور پر ہر طالب علم کو جاننے کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ میں اپنی کلاس کے ہر فرد کو اس کے نام سے پکارتا۔ میں اسے اس کے رول نمبر سے یا انگلیوں کے اشارے سے "آپ" کہہ کر بلانا اس کی توہین سمجھتا۔ میرے نزدیک استاد اور شاگرد کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی کی فضا کا قائم ہونا ازحد لازم تھا۔ اور شاگردوں کو ذاتی طور پر جانے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔

میں اپنے سبق کے دوران صرف اپنی آواز سے مخطوظ ہونے کی کبھی کوشش نہ کرتا۔ میں ہمیشہ پوری کلاس کی شرکت (PARTICIPATION) کا اہتمام کرتا۔ میرا اندازِ تدریس یوں تھا کہ تمہید کے بعد میں قدم بہ قدم کلاس کو ساتھ لے کر چلتا۔ میرے شاگرد میرے جمہوری مزاج سے واقف تھے۔ کھل کر بات کرتے۔ اس طرح اور افہام و تفہیم کے انداز میں موضوعِ زیرِ بحث کے بہت سے پہلو نکھر کر سامنے آ جاتے۔ میں اہتمام کے ساتھ

کلاس روم کے ماحول کو خوشگوار بنانے پر توجہ دیتا۔ میرا ایمان ہے کہ کلاس روم میں اگر تناؤ اور گھٹن کا عالم طاری ہو تو وہاں تخلیقی قوتیں کبھی ابھر نہیں سکتیں۔ استاد کی شخصیت میں اتنی جاذبیت اور کشش ہونی چاہیئے کہ اس کے طالب علم اس سے پیار کرنے لگیں۔ اور اس کے پیریڈ کے وہ ہر لحظہ منتظر رہیں۔ جس انسٹرکٹر کو دیکھتے ہی کلاس "چل تو جلال تو" کا ورد شروع کر دے، اسے تدریس کا پیشہ چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس کے لئے اور میدان بڑا کھلا ہے۔ "ناکام استاد، بہت عمدہ قصاب بن سکتا ہے!" ایک اور بات، جسے اپنانے کی میں نے ہمیشہ شعوری سعی کی یہ ہے کہ استاد کو صرف وہی بات کہنی چاہیئے جس کی صداقت پر اسے پورا یقین ہو۔ اگر استاد کی بات حلق کے اوپر سے نکلنے کی بجائے دل کی گہرائی سے نکلے تو لازمی طور پہ اس کا خوشگوار اثر پوری کلاس پر مرتب ہوگا۔ جذبے کی سچائی اور قول و فعل میں مطابقت بہت بڑی نعمت ہے۔

میری تقریر زیادہ طویل ہوگئی۔ دلی معذرت۔ آئیے، دوبارہ اسکول کا رخ کرتے ہیں۔ جہاں مختلف کورسز چل رہے ہیں اور ہم بڑی خود اعتمادی کے عالم میں اپنا علم بکھیرنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کلاس روم کے ماحول کا تو آپ نے حال سن ہی لیا۔ اس کے علاوہ اسکول میں زیر تربیت افراد کو ہال میں اکٹھا

کر کے انہیں کسی دینی، قومی یا تعلیمی موضوع پر لیکچر دیا جاتا بریگیڈیئر نذیر آفیسرز کلاس کو خود ٹروپ موٹیویشن اور WHY EDUCATION پر بڑے عالمانہ لیکچر دیا کرتے۔ مگر تمام اسکول سے خطاب کرنے کی (ہفتہ میں ایک بار) ذمہ داری میرے اوپر آن پڑی تھی۔ اس لیکچر میں آفیسرز، جے سی اوز، جوانوں سبھی کو شامل ہونا پڑتا۔ گفتگو اردو زبان میں کرنا پڑتی۔ اس خاکسار کی خوش نصیبی کہ اسے اس کام کے لئے موزوں سمجھا گیا۔

میں نے ایرٹوپہ میں اپنے ڈھائی سالہ قیام کے دوران درجنوں تقریریں کیں۔ جنہیں خدا کے فضل سے شرفِ قبولیت حاصل ہوا میرے پسندیدہ موضوعات، نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور مشاہیرِ پاکستان تھے۔ ان کے علاوہ اسلام کی اٹل، سچی اور ابدی قدروں کے مختلف پہلوؤں پر بھی میں نے تفصیلی تقاریر کیں۔ ساتھ ہی ساتھ، اسلام کے اقتصادی، معاشرتی، روحانی، تعلیمی نظریات پر بھی مجھے کھل کر بات کرنے کا موقع ملا۔ میری تقریر گھنٹہ بھر جاری رہتی اور میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ تمام ہال گوش برآواز دکھائی دیتا۔ جب میں بات ختم کرتا تو سامعین کے چہروں پر شادابی اور خود اعتمادی کے آثار دکھائی دیتے۔ میں اپنی کامیابی پر اللہ کا شکر بجا لاتا۔

بریگیڈیئر نذیر کے ساتھ ایرٹوپہ میں کام کرنے کا مجھے تھوڑا

ہی موقع ملا۔ پھر وہ پوسٹ ہو کر پنڈی چلے گئے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ کرنل فضل حق (اللہ بخشے) کمانڈنٹ تعینات ہوئے۔ موصوف بی ٹی کے زمانے میں میرے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ ادھر آرمی اپرنٹس اسکول میں بھی ہم اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ میری حد درجہ عزت کرتے۔ مگر ان تمام دوستانہ مراسم کے باوجود میں نے "ایاز قدر خود بہ شناس" کے مقولے پر ہمیشہ عمل کیا اور پرانے تعلقات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ اور نہ کرنل صاحب نے ہمیں کبھی بے جا "لفٹ" دی۔ ہمارے مراسم مناسب حدود کے پابند ہی رہے۔

ویسے کرنل فضل حق میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ اپنے ذاتی تعلقات کو اپنی سرکاری حیثیت پر کبھی اثرانداز نہ ہونے دیتے۔ دفتر میں وہ پکے کمانڈنٹ تھے۔ وہ ہر اس شخص کو قابلِ مواخذہ سمجھتے جس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ اس معاملے میں وہ کسی رواداری یا مروت کے قائل نہ تھے۔ مگر دفتری اوقات کے بعد وہ بڑے بے تکلف دوست دکھائی دیتے۔ اس وقت کوئی پہچان بھی نہ سکتا کہ یہ وہی کرنل فضل حق ہیں جن کی سخت گیری کے چرچے ہر سو عام ہیں۔

بریگیڈیر نذیر نے اپنے قیام کے دوران اسکول کا تعلیمی، تدریسی تحقیقی معیار بلندیوں تک جا پہنچایا تھا۔ وہ جب رخصت ہوئے

تو عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ معیار کرنل فضل حق قائم نہ رکھ سکیں گے۔ مگر انہوں نے اپنی شب و روز محنت سے لوگوں کے تمام خدشات زائل کر دیئے۔ ان کی کمانڈ میں بھی اسکول ترقی کی منزلیں خوش اسلوبی سے طے کرتا گیا۔ گراف اوپر نہیں گیا، تو نیچے بھی نہیں سرکا۔ ہاں کتابوں کی تصنیف و تالیف کا شعبہ بوجوہ، اپر ٹوپہ سے راولپنڈی منتقل کرنا پڑا۔ کرنل فضل حق مجھ پر بے پناہ اعتماد اور بھروسہ کرتے۔ ہر مشکل مسئلے میں میرا مشورہ طلب کرتے۔ میں پوری دیانت داری کے ساتھ انہیں اپنی رائے سے آگاہ کرتا۔ میں دوسروں کے کھنڈروں پر اپنے محل تعمیر کرنے کے فعل کو بہت کمینہ حرکت گردانتا ہوں۔ میں نے اس سے ہمیشہ اجتناب برتا ہے۔

اسکول کے چیف انسٹرکٹر میجر (بعد میں لیفٹیننٹ کرنل) احسان الحق تھے۔ موصوف اپنی وضع قطع، چال ڈھال اور ظاہری شکل و صورت میں انفنٹری کے افسر دکھائی دیتے تھے۔ حد درجہ چاق و چوبند۔ میرا اندازہ چنداں غلط بھی نہ تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ احسان صاحب کسی زمانے میں پولیس کے محکمہ سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے آرمڈ کور میں بھی سروس کی ہے۔ اسی چیز میں راز تھا ان کے اسمارٹ ہونے کا۔

احسان صاحب بڑے صاف گو (بلکہ منہ پھٹ) افسر تھے

وہ لگی لپٹی رکھے بغیر دل کی بات کہہ ڈالتے۔ بریگیڈیئر نذیر اور کرنل فضل حق سے اسکول کے معاملات نمٹاتے وقت وہ ہمیشہ صاف گوئی سے کام لیتے۔ نتائج کی پروا کئے بغیر۔ بات تلخی تک بھی جا پہنچتی۔ مگر اس کی انہیں زیادہ پروا نہ تھی۔

احسان صاحب کے اندر بہت سی تنظیمی خوبیاں موجود تھیں۔ وہ بہت عمدہ P.M.C (پریذیڈنٹ میس کمیٹی) تھے۔ اس حیثیت سے انہوں نے میس کے معیار کو ہمیشہ بلند رکھا۔ اسکول کے باقی تنظیمی معاملوں میں بھی ان کی کوششیں قابل قدر تھیں۔ جہاں تک تعلیمی امور کا تعلق تھا، وہ زیادہ انحصار مجھ پر ہی کرتے اور میں ان کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہ پہنچاتا۔

کرنل گیلانی اس زمانے میں مری کے اسٹیشن کمانڈر تھے۔ موصوف بہت علم دوست افسر واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے اسٹیشن کے تمام افسروں کے لئے خصوصی (STUDY PERIODS) کا اہتمام کرایا تھا۔ ہوتا یوں کہ مہینے میں ایک آدھ بار اسٹیشن کے تمام افسر ایک مقام پر جمع ہوتے۔ اور پھر پہلے سے متعین کردہ موضوع پر سیر حاصل بحث ہوتی ایک افسر SPONSOR ہوتا دوسرے PARTICIPANTS یہ تجربہ بڑا کامیاب ثابت ہوا۔ میں نے ان سیمیناروں میں دوبار حصہ لیا۔ دونوں بار میرا موضوع تعلیم سے متعلق تھا۔

ایک بار میں نے اسلامی نظام تعلیم کے جملہ پہلوؤں پر گفتگو کی۔ دوسری بار مغربی نظام تعلیم کے ماہرین پر بحث کی۔ اللہ کا شکر ہے۔ دونوں بار میرے لیکچرز کامیاب رہے۔

اسٹیشن کمانڈر صاحب نے اسکول کے ذمے یہ کام بھی لگا رکھا تھا کہ ایک دو اسٹاف ممبرز مہینے میں ایک بار پروگرام کے مطابق مری کے اسکولوں اور کالجوں میں جا کر طلبا اور طالبات سے جہاد کے موضوع پر گفتگو کیا کریں۔ کرنل فضل حق نے اس کام پر مجھے مامور کیا۔ میں ایک صبح تقریر کرنے گورنمنٹ کالج مری پہنچا۔ لڑکے اور اساتذہ ہال میں جمع تھے۔ میری تقریر کا موضوع THE SEPTEMBER WAR تھا۔ میں نے تقریر کے نوٹس انگریزی زبان میں تیار کئے تھے۔ اور مجھے بولنا بھی اسی زبان میں تھا۔ میں اسٹیج پر پہنچا تو شور بلند ہوا۔ سر! تقریر اردو میں ہوگی۔ شور اس قدر زیادہ تھا کہ پرنسپل صاحب حواس باختہ ہو گئے۔ قریب آکر میرے کانوں میں کہنے لگے۔ صاحب! معاملہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ سر پھرے لڑکے تو بگڑ گئے ہیں۔ آپ کو اردو بولنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میرے محترم! آپ گھبرائیے نہیں۔ میں خالص پاکستانی ہوں۔ دیسی انگریز نہیں۔

اردو بھی بول سکتا ہوں۔ اگر میرے اردو بولنے سے طالب علموں کے دلِ مضطر کو قرار مل سکتا ہے تو لیجیئے ہم حاضر ہیں۔

اور پھر میں نے اللہ کا نام لے کر اردو میں تقریر کرنا شروع کر دی۔ مجھے دِقّت کیا پیش آتی۔ یہ تو میرا روزمرّہ کا معمول تھا۔ مگر کالج کے پروفیسروں اور طالب علموں کو میری زبانی صاف ستھری اردو میں گفتگو سن کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ جب میں نے تقریر ختم کی تو ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ بات یہ ہے کہ سویلین حضرات کے ہاں یہ تاثر عام ہے کہ فوجی افسر اردو بولنا، لکھنا نہیں جانتے۔ انہیں کیا خبر اسی فوج نے ایڈمرل شفیق الرحمٰن کرنل محمد خان، میجر ضمیر جعفری، بریگیڈیئر گلزار، بریگیڈیئر ایس کے ملک جیسے معروف مفکّر اور ادیب بھی پیدا کئے ہیں۔

بات دور نکل گئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ میری تقریر سامعین کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اپنے پرنسپل کی وساطت سے مجھے کہلا بھیجا کہ میں ہر جمعہ کو پورے کالج سے خطاب کیا کروں۔ اسٹیشن کمانڈر صاحب سے منظوری بھی مل گئی۔ میں نے بعد میں چار پانچ بار طلباء سے خطاب بھی کیا۔ مگر تھوڑے عرصے بعد جانبین کی جانب سے جوش ماند پڑنے لگا۔ پھر یہ معاملہ ختم ہو گیا۔

ایک بار مجھے اور کرنل احسان کو ایک مشنری ادارے میں تقریر کرنے کے لئے جانا پڑا۔ وہاں کی پرنسپل صاحبہ نے بڑی سرد مہری کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ فرمانے لگیں۔ آپ فوجی حضرات جانے کیوں ہر وقت لڑائی کی باتیں کرتے رہتے ہیں ہمارے بچے معصوم پھول اور کلیاں ہیں۔ انہیں امن کے پیغام کی ضرورت ہے۔ اہنیر، لڑائی کے قصے سنانا چھوڑیئے۔ ہندوستان سے آپ کی لڑائی ہونا تھا سو ہو چکی۔ اب بھولیئے اس قصے کو۔ تلوار کو خیر باد کہیئے۔ اور زیتون کی شاخ لے کر آگے بڑھیئے کہ یہی مسئلے کا عملی حل ہے۔ میں نے محترمہ کی باتیں سنیں تو حیران رہ گیا۔ سوچا یہ خاتون کتنی مہارت کے ساتھ ہمارے بچوں کا ملی تشخص ان سے چھین رہی ہے۔ میں اور کرنل احسان بے نیل مرام لوٹنے لگے تو اس نے آگے بڑھ کر ہمیں روک لیا۔ شاید نتائج سے خائف ہو گئی ہو۔ اور ہمیں تقریر کرنے پر مجبور کیا۔ اب کی بار جو میں اسٹیج پہ پہنچا تو کچھ نہ پوچھئے میری کیا حالت تھی۔ میری آنکھوں سے خون اترا ہوا تھا اور میرے لئے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ تاہم میں نے حوصلے سے کام لیا اور مدلل انداز میں کارلائل، رسکن اور رسل کے حوالوں سے جنگ کے بھیانک عوامل پر بحث کی۔ پھر ہندوؤں کی دیرینہ مسلمان دشمنی کا ذکر چھیڑا۔ اس طرح

ایک گھنٹے کی تقریر میں کئی اور مسائل زیر بحث آئے۔ تقریر ختم ہوئی تو ہم نے پرنسپل صاحبہ کے چہرے پر مسکراہٹ ابھرتے دیکھی۔ جانے اس میں خلوص کتنا تھا۔ اور بناوٹ کتنی۔ ہم بہرحال خوش تھے کہ ہم نے بت کدے میں اذان دینے کا فریضہ ادا کر دیا تھا۔

کرنل فضل حق کا ذکر ایک بار پھر۔ مجھے بڑے دکھ کے ساتھ اس بات کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ موصوف گوناگوں پریشانیوں کا شکار تھے۔ اسی لئے وہ "سکون" کی "تلاش" میں اکثر کلبوں اور ہوٹلوں کا رُخ کرتے اور اپنا غم غلط کرنے کی غرض سے گلابی کا سہارا بھی لیتے۔ اللہ ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔ وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ان کی یہ خاص ادا تھی کہ وہ کبھی اکیلے کسی محفل میں تشریف نہ لے جاتے۔ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔ کلب میں پرتکلف دعوت اڑاتے۔ بل ادا کرنے میں وہ ہرگز بخل سے کام نہ لیتے۔ اس طرح ان کا بجٹ اکثر غیر متوازن رہتا۔ مگر اس کی انہیں قطعاً پروا نہ تھی۔ دوستوں کی مدارات میں انہیں بڑا لطف محسوس ہوتا۔ بڑے اصرار کے ساتھ مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جاتے۔ میں کئی بار معذرت طلب کر لیتا۔ مگر گاہے گاہے پکڑا بھی جاتا۔ بسا اوقات یوں ہوتا کہ ہم لوگ شام مری کی مال روڈ کے آس پاس

بسر کرتے ۔ پھر کرنل صاحب نو، دس بجے کے لگ بھگ ہمیں موٹر میں بٹھا کر ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل راولپنڈی بھی لے آتے ۔ اور رات ایک، دو بجے کے لگ بھگ ہماری واپسی ہوتی ۔ علی الصبح دفتر میں حاضری بڑی دوبھر دکھائی دیتی ۔ مگر ہم لوگ کلاسوں میں لیٹ ہونے کا تصور بھی اپنے قریب نہ لا سکتے ۔ اب کرنل صاحب کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیتے ۔ ایک بار تو یوں ہوا کہ میں، کرنل فتح محمد، کیپٹن رمضان ان کی معیت میں مری سے راولپنڈی پہنچے ۔ اگلے دن اتوار تھا ۔ کرنل صاحب نے فیصلہ کیا، ہمیں لاہور کا چکر لگانا چاہیئے ۔ چنانچہ چار درویشوں کا یہ قافلہ عازم لاہور ہو گیا ۔ رات ۳-۴ بجے کے قریب ہم لوگ لاہور پہنچے ۔ اور پھر لاہور ہوٹل میں رات کا بقیہ حصہ بسر کیا ۔ اگلی صبح دائیں بائیں گھومنے کے بعد شام کے وقت ہم لوگ مری آن پہنچے ۔ زندگی بس یونہی گزر رہی تھی ۔

کرنل صاحب فنون لطیفہ خصوصاً موسیقی کے بڑے رسیا تھے ۔ انہوں نے اپنی کمان کے دوران ملک کی مشہور گانے والیوں کو اپنے اسکول میں مدعو کیا ۔ یہ انہی کے دور کی بات ہے جب فریدہ خانم، نسیم بیگم، بلقیس خانم اور زاہدہ سلطانہ جیسی مشہور شخصیتیں اسکول میں رونق افروز ہوئیں اور اپنی نغمہ سرائی سے حاضرین مجلس کو محظوظ کیا ۔ دو بار، ایران

اور ترکی سے آئے ہوئے طائفوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ پھر ان خاتون فنکاروں کو اپنے ملکی ملبوسات میں ہم نے ناچتے تھرکتے دیکھا۔ کرنل صاحب ایسے موقعوں سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے میں انہیں دبی زبان میں سمجھانے کی کوشش کرتا تو مسکراتے ہوئے فرماتے، مولوی یہ زندگی چند روزہ ہے اسے فنکارانہ انداز میں بسر کرنا سیکھئے۔ کیا پتہ کل کیا ہو جائے۔

اور پھر واقعی، ایسا ہی ہوا۔ کرنل صاحب ایر ٹوپہ سے پوسٹ ہوکر فوجدار ہاٹ (مرحوم مشرقی پاکستان) میں بطور پرنسپل تعینات ہوگئے۔ وہاں جب انسانیت کی قبا مکتی باہنی کے درندوں کے ہاتھوں تار تار ہو رہی تھی تو کرنل فضل حق کو بھی غنڈوں نے اغوا کر لیا۔ پھر اس کے بعد ان کی آج تک کوئی خبر نہیں آئی۔ بات واضح ہے۔ زندگی سے یوں والہانہ پیار کرتے والے انسان کا رشتہ درندوں نے اس عالمِ رنگ و بو سے کاٹ دیا ہوگا۔ جانے کس عالم میں انہوں نے جان دی ہوگی۔ ان کی یاد آج بھی مجھے خون کے آنسو رلاتی ہے۔ بشری کمزوریوں سے قطع نظر، مرنے والے میں بڑی خوبیاں موجود تھیں۔

پھر دسمبر ۱۹۷۵ء میں مجھے پروموشن آرڈرز مل گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایر ٹوپہ سے میرا تبادلہ جی ایچ کیو آرمی ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ میں کر دیا گیا۔

پرموشن اور تبدیلی دونوں میرے لیے خوش آئند تھیں خوشی خوشی میں نے رختِ سفر باندھا اور ۱۰ دسمبر کی صبح یہاں راولپنڈی آن پہنچا۔

باب — ۲۰

جنرل ہیڈکوارٹرز راولپنڈی میں

جنرل ہیڈکوارٹرز پہنچتے ہی میرے کندھوں پر تبدیلی رونما ہو گئی۔ اب کیپٹن سرور، میجر سرور کے روپ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جی ایچ کیو میں کام کرنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ اس سے پہلے سروس کے بارہ سال میں نے تربیتی اداروں — آرمی اپرنٹس اسکول، ملٹری کالج اور اسکول آف آرمی ایجوکیشن — میں ہی گزارے تھے۔ دفتری معاملات سے عدم واقفیت کوئی اچھی بات نہ تھی۔ میں ڈر رہا تھا۔ جانے، نئی ذمہ داریاں سرانجام پا سکیں یا نہیں۔ خیر میں نے اللہ کا نام لے کر اپنا کام شروع کر دیا۔

اُس زمانے میں آرمی ایجوکیشن کور کا سالانہ مجلہ "تعلیم" زیر ترتیب تھا۔ میجر مجیب (حال بریگیڈیئر) مدیر اعلیٰ تھے۔ مجھے بطور معاون

ان کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا۔ میں نے بڑی عرق ریزی سے مضامین کو ایڈٹ کیا۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکا۔ ان کی نوک پلک درست کی۔ انگریزی سیکشن کا اداریہ بریگیڈیئر شفیع نے لکھا اور اردو اداریہ میرے حصے میں آیا۔ میں نے مضامین کا تعارف ہلکے پھلکے انداز میں کرایا۔ خدا کا شکر ہے، میرے اداریے کو پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ بریگیڈیئر نذیر اس زمانے میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کی بیگم ایف جی سرسید کالج راولپنڈی میں ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ تھیں۔ بریگیڈیئر صاحب سے ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے۔ بیگم رسالہ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور اداریے کی خصوصی تعریف کر رہی تھیں۔ باقی مضامین کا معیار بھی خاصا اونچا تھا۔ میں اللہ کا شکر بجا لایا، جس نے بحیثیت مدیر میرے کام کو پذیرائی سے نوازا تھا۔

بریگیڈیئر شفیع صاحب کے ساتھ کام کرنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا۔ موصوف ایک بلند پایہ اسکالر ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا علم کسی ایک یا چند ایک مضامین تک محدود نہیں۔ آپ جس موضوع پر بھی بات کریں "جا ایں جا است" والی صورتِ حال سے آپ کو دوچار ہونا پڑے گا۔ میں نے بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو بیک وقت عربی، فارسی، انگریزی

اور اُردو زبانوں پر اتنا زبردست عبور رکھتے ہوں اور ساتھ ہی ساتھ عمرانیات، فلسفہ، مابعد الطبعیات اور معاشیات پر بھی جن کی اتنی گہری نظر ہو۔ بولتے ہیں تو یوں لگتا ہے، علم ٹھاٹھیں مارتا، اٹڈا چلا آ رہا ہے۔ رکنے کا نام نہیں لیتا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ بریگیڈیئر شفیع کبھی اپنے علم کی تشہیر نہیں کرتے۔ طبیعت میں سادگی اور انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ بڑا درویشانہ مزاج پایا ہے۔ اور انہیں دیکھ کر کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہ صاحب اتنے اونچے عہدے پر فائز رہے ہوں گے یا علم کا سمندر انہوں نے اپنے اندر سمیٹ رکھا ہو گا۔

بریگیڈیئر صاحب کی نگرانی میں مجھے چند ماہ کام کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اس دوران ان سے بہت کچھ سیکھا۔ کام کی سچی لگن، نام و نمود سے پرہیز، سادہ زندگی سے پیار...... یہ اور اس طرح کی کئی اور اچھی باتیں ہیں نے ان کے کردار سے متاثر ہو کر اپنائیں۔

رسالہ ایڈٹ کرنے کا کام ختم ہوا تو مجھے کنٹرولر امتحانات مقرر کر دیا گیا۔ میرا کام یہ تھا کہ ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کی زیرِ نگرانی جو امتحانات منعقد ہوتے ہیں، ان کے لئے مناسب ممتحنوں کی تلاش کروں۔ پرچوں کی بروقت تیاری اور ان کی ترسیل کا

اہتمام کروں اور نتائج کا اعلان بروقت کراؤں۔ میں نے یہ کام سنبھال تو لیا کہ فوج میں چوں وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس کام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ کام مجھے بے کیف لگتا تھا۔ پریس میں بیٹھ کر پرچے چھپوانے کا کام تو بڑا ہی صبر آزما تھا۔ خیر! میں نے مقدور بھر اس کام کو بھی خوش اسلوبی سے نبھایا۔ میرے قیام کے دوران کوئی بڑی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ امتحانوں کا کام ہے تو مشکل مگر اہمیت کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ پرچوں کے افشا، ان کی غلط ترسیل، گنتی میں کمی بیشی کا خطرہ ہر وقت لاحق رہتا ہے اور کنٹرولر صاحب کی جان میں اسی وقت جان آتی ہے جب امتحان کا سارا عمل بخیروخوبی کنارے لگتا ہے۔

پھر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ چھڑی تو مجھے سنسر شپ ڈیوٹی پر متعین کر دیا گیا۔ ٹیلیفون اور ٹیلگراف (T & T) آفس میں میرا ہیڈ کوارٹر تھا۔ میرے ساتھ فوج اور سول کے چند اور افسر بھی تھے۔ اس دوران ہم نے سنسر شپ کے جملہ فرائض مقدور بھر ہمت اور دیانت داری سے سرانجام دیئے۔ کئی بار نو رات گئے تک ہمیں دفتر میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ مجھے اپنے فرائض کے سلسلے میں انٹر سروسز پبلک ریلیشنز، منسٹری آف انفارمیشن، انٹر سروسز انٹیلی جنس، اور فارن آفس

کا چکر کاٹنا پڑتا ۔ گاہے گاہے غیر ملکی خطوط کے ترجمے کی خاطر
NATIONAL INSTITUTE OF MODERN LANGUAES
بھی جانا پڑتا ۔ پہلے بتا چکا ہوں ۔ اُس زمانے میں بریگیڈیئر نذیر اس ادارے کے ڈائریکٹر تھے ۔ ان کا عملہ پورا تعاون کرتا تھا ۔ جونہی میں کوئی چیز ترجمے کے لیئے پیش کرتا، وہ باقی کام کاج چھوڑ کر میری مشکل حل کرتے ۔ ایک دن میرے ہمراہ میجر (حال بریگیڈیئر) اعجاز اکبر تھے ۔ ہمیں فرانسیسی زبان میں لکھے ایک تراشے کا ترجمہ مطلوب تھا ۔ بریگیڈیئر صاحب نے ایک خاتون ماہر لسانیات کے سپرد یہ کام کیا ۔ محترمہ کا "الٹرا" ماڈرن ہونا تو خیر برحق تھا ۔ اس دن انہوں نے ایسا لباس زیب تن کر رکھا تھا کہ ان کے بدن کا ایک ایک انگ دعوتِ نظارہ دے رہا تھا ۔ میں نے اعجاز صاحب کو بتایا یہ محترمہ چھ غیر ملکی زبانوں کی ماہر ہیں ۔ انہوں نے تیزی سے اپنے سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے فرمایا ۔ اوہُوں ۔ میں نہ مانوں ۔ یہ محترمہ، چھ نہیں، سات زبانوں کی ماہر ہیں ۔ اور ان کی ساتویں زبان (ان کا اشارہ ان کی کافر ادا جوانی کی طرف تھا) باقی چھ زبانوں پر حاوی ہے ۔

سقوطِ ڈھاکہ کی خبر میں نے اس وقت سنی جب میں ڈی اینڈ ٹی آفس میں بیٹھا، امید و بیم کی کیفیت سے

دوچار تھا۔ میں کئی دنوں سے یہ منحوس خبر سننے کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود جب سقوطِ ڈھاکہ کی اطلاع ملی تو میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی ظالم نے میری متاعِ عزیز مجھ سے چھین لی ہو۔ میری آنکھوں کے سامنے سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء کا وہ دور تیرنے لگا جب نوجوان گلی، کوچوں، بازاروں میں پاکستان زندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ پھر پاکستان کے حصول کے بعد مختلف ادوار میں پاکستان پر جو صدمے گزرتے رہے، وہ بھی ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے تیرنے لگے۔ میں اس صدمے پر سخت دلفگار تھا اور بار بار اپنی تیرہ بختی پر ماتم کر رہا تھا۔ ملک کے ٹوٹنے کا صدمہ اتنا گھمبیر تھا کہ کئی دنوں تک میری حساس طبیعت سنبھل نہ سکی۔ یہی حال میرے خاندان کے دوسرے افراد کا تھا۔ بیگم، خون کے دباؤ کی دیرینہ مریض ہیں۔ اس صدمے نے ان کے مرض میں مزید اضافہ کر دیا۔ میں نے اپنے بیٹے خالد محمود کی وفات پر اسے اتنے آنسو بہاتے نہیں دیکھا، جتنے سقوطِ ڈھاکہ کے موقع پر اس کی آنکھوں سے رواں ہوئے۔

لڑائی ختم ہوئی تو مجھے ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ میں دوبارہ

تعینات کر دیا گیا۔ بریگیڈیئر شفیع فارن پریس رپورٹ بڑے غور سے پڑھا کرتے اور چائے کے وقفے کے دوران اس پر بحث کرتے۔ ان کی بات سمجھنے کے لیئے ہمیں ہر لحظہ ہمہ تن گوش رہنا پڑتا۔ بولتے وقت وہ کامے، فل سٹاپ کا خیال نہیں رکھتے۔ لکھتے بھی اسی برق رفتاری سے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان کا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ سوچتا ہے اور اس کے اظہار کے لیئے ان کی زبان اور ان کا قلم ٹھیک طرح سے ان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی گفتگو یا ان کی تحریروں سے بہت کم لوگ استفادہ کر سکتے ہیں۔ خیر، یہ غیر متعلق باتیں ہیں۔ جی ہاں جملہ دفتری فرائض کے ساتھ ساتھ مجھے مینوئل آف آرمی ایجوکیشن MANUAL OF ARMY EDUCATION کی تیاری کے سلسلے میں بریگیڈیئر شفیع کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ موصوف اُس زمانے میں اس کتابچے کی ڈرافٹنگ پر مامور تھے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں بریگیڈیئر صاحب بہت عمدہ انگریزی لکھتے ہیں۔ مگر ان کے حسنِ ظن کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنا ڈرافٹ میرے ساتھ ضرور DISCUSS کرتے۔ جہاں جہاں میں کوئی تبدیلی تجویز کرتا، بلا تامل اسے قبول کر لیتے۔ یہ ان کے عالی ظرف ہونے کی دلیل ہے۔ کتابچہ جب تیار ہو گیا

تو اس کی PRESENTATION کا مرحلہ درپیش تھا۔ اس کتابچے کی اہم باتوں سے چیف آف آرمی سٹاف کو آگاہ کرنا اور ان کی منظوری لینا مطلوب تھا۔ چارٹس وغیرہ کی تیاری میں، میں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ اس لیئے بریگیڈیئر شفیع نے یہ کام میرے ذمہ سونپ دیا کہ PRESENTATION سے ایک دن قبل ہی کانفرنس ہال میں چارٹس آویزاں کر آؤں تاکہ دوسری صبح وقت ضائع نہ ہو۔ اگلی صبح محفل بپا ہوئی۔ تمام متعلقہ سنیئر آفیسرز موجود تھے۔ بریگیڈیئر صاحب کے ذمہ تقریر کرنا اور میرے ذمے متعلقہ چارٹوں کی نشاندہی کرنا تھی۔ اللہ نے کرم کیا۔ یہ کام بھگت گیا۔ ویسے بریگیڈیئر موصوف مجھے اُس دن فارم میں دکھائی نہ دیئے۔ کانفرنس ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔ سر! خیریت تو ہے۔ آج آپ کی آواز میں غیر معمولی طور پر دھیما پن تھا۔ بولے "بھائی میرے! کچھ نہ پوچھو درد کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔ مجھے ہسپتال پہنچانے کی فکر کرو۔" پھر ہمیں پتہ چلا کہ وہ تو شدید (APPENDICITUS) کے درد میں مبتلا تھے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کا آپریشن ہو گیا اور سرجن نے ہمیں بتایا۔ یہ معاملہ اگر چند گھنٹے اور لیٹ ہو جاتا تو زیادہ سنگین صورت بھی اختیار کر سکتا تھا۔ بریگیڈیئر

شفیع ریٹائر ہوئے تو ان کی جگہ بریگیڈیئر نذیر تشریف لائے ۔ ان سے تو آپ واقف ہی ہیں ۔ پچھلے صفحوں میں ان کا ذکرِ خیر کئی بار آچکا ہے ۔

بریگیڈیئر نذیر اور بریگیڈیئر شفیع کے مزاج میں زمین ، آسمان کا فرق ہے ۔ دونوں کے مابین قدرِ مشترک ہر دو کا بے پایاں علم ہے ۔ بریگیڈیئر نذیر کا شمار ملک کے ممتاز ماہرینِ تعلیم میں ہوتا ہے ۔ ان کی شخصیت میں بلا کی جاذبیت ہے ۔ اپنے ملنے والوں کو اپنی بے پناہ قابلیت اور اپنی پُروقار شخصیت سے ضرور متاثر کرتے ہیں ۔ قوتِ فیصلہ سے پوری طرح بہرہ ور ہیں ۔ مشکل سے مشکل مسئلہ آن پڑے ، وہ گھبراہٹ اور پریشانی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے ۔ ذرا سی دیر کے لئے اپنی آنکھیں موند لیتے ہیں ، اور اپنے سر پر اوپر تلے تیزی سے ہاتھ پھیرنے اور اپنی گھنی بھوؤں کو تاؤ دینے کے بعد آنکھیں کھول کر اپنے فیصلے کا اعلان کر دیتے ہیں ۔ بڑے سے بڑے مسئلے کا حل تلاش کرنے میں انہیں یہی چند ساعتیں درکار ہوتی ہیں ۔ DICTATION دینے میں ان کا کوئی ثانی نہیں ۔ وہ اپنے پرسنل اسسٹنٹ (P. A.) کو سامنے بٹھا کر بولنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر رکنے کا نام نہیں لیتے ۔

خوبصورت انگریزی لکھتے اور بولتے ہیں۔ الفاظ کا دروبست، محاوروں کا چناؤ اور زورِ استدلال ایک سے ایک بڑھ کر۔ کس کس کی تعریف کروں۔

بریگیڈیر نذیر عمل کے غازی ہیں۔ بہت متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا ذہن نت نئے منصوبے سوچتا ہے، اور ان کی عملی تکمیل وہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ دیکھنے والے حیران، ششدر رہ جاتے ہیں۔ جب وہ نئے منصوبے کی تفصیلات سنا رہے ہوتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں یہ حضرت خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔ مگر جب چند ہی ہفتوں اور مہینوں میں ان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے لگتا ہے تو لوگوں کی خوشگوار حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ وہ کام ہمیشہ (SCRATCH) سے شروع کرتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ آرمی ایجوکیشن پریس کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ یہی حال انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز کا بھی تھا۔ اس ادارے کے قیام میں انہوں نے گراں قدر کام سرانجام دے کر سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ان کے عہد اقتدار میں آرمی ایجوکیشن کور نے جتنی ترقی کی، اس کی مثال اس سے پہلے سے نہیں ملتی۔ بریگیڈیر نذیر صاحب کی یہ بڑی

خوش قسمتی ہے کہ انہیں بریگیڈیئر سید نصیر الدین صاحب جیسا قابل جانشین نصیب ہوا۔ بریگیڈیئر نصیر صاحب کے عہد اقتدار میں ایجوکیشن کور نے اب اتنی ترقی کی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ بریگیڈیئر نصیر نے چارج سنبھالا تو پوری ایجوکیشن کور میں وہ تنہا بریگیڈیئر تھے۔ اب خدا کے فضل سے کور میں سات اور بریگیڈیئر موجود ہیں۔ یہی حال کرنیلوں، میجروں کا ہے۔ جدھر دیکھئے ماشاءاللہ افسروں کی فصل اُگی ہوئی ہے۔ دیگر تعلیمی معاملات میں بھی بریگیڈیئر نصیر الدین صاحب کی کامیابیاں قابلِ ذکر ہیں ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

بریگیڈیئر نذیر کا تذکرہ ایک بار پھر۔ موصوف بہت انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔ پسند کریں تو اپنے ممدوح کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ کسی کے کام سے متاثر نہ ہوں تو اسے ٹھوکروں میں اڑا دیتے ہیں۔ ان کی پسند کا پیمانہ کام اور محض کام ہوتا ہے۔ کام کرنے والے ماتحت پر چشمِ التفات ارزاں فرماتے ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب کی رہنمائی میں مجھے ایک سال کے لگ بھگ جی ایچ کیو میں کام کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اُسی دوران جنرل فضل مقیم اپنی کتاب "قیادت کا بحران" (CRISIS IN LEADER SHIP)

لکھنے میں مصروف تھے۔ اور انہوں نے اپنا دفتر ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ میں قائم کر رکھا تھا۔ جنرل صاحب کو ایک موقع پر ڈھیر سارے پرانے حوالوں (REFERENCE) کی ضرورت پڑ گئی۔ مواد کئی ہزار صفحوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اور متعلقہ حوالہ جات ان کی چھان پھٹک کے بعد ہی تلاش کئے جا سکتے تھے۔ بریگیڈیئر نذیر نے میرے اور کرنل ظہور کے ذمے یہ کام لگایا اور فرمایا: دوستو! وقت کم ہے اور مقابلہ سخت، کوشش کیجئے۔ دو ایک دنوں میں جنرل صاحب کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ سکے۔ ہم نے انہیں یقین دلایا کہ انشاء اللہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ پھر میں نے اور کرنل ظہور صاحب نے اپنے اسٹاف کے ہمراہ مل کر دو دن اور دو راتیں اس کام کی نذر کیں۔ ہمارا کام جب جنرل صاحب کی خدمت میں پیش ہوا تو انہوں نے ہماری کوششوں کو بہت سراہا۔ بریگیڈیئر صاحب خود اتنے متاثر ہوئے کہ وہ آج تک اپنے احباب کے ساتھ میری ان ناچیز کوششوں کا ذکر فرماتے ہیں۔

آرمی ایجوکیشن ڈائریکٹریٹ میں اپنے قیام کی داستان میجر (حال بریگیڈیئر) اکرام امین اور میجر (حال بریگیڈیئر) محمد اعجاز اکبر کے بیان کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان دونوں حضرات کا ذکر آپ پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اب تھوڑا سا تذکرہ اور

سہی۔ جناب اکرام ایمن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آج کل ماشا اللہ سیکریٹری ایجوکیشن کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان دنوں وہ ڈائریکٹریٹ میں میرے رفیق کار تھے۔ مری سے پوسٹ ہوکر جب میں پنڈی پہنچا تو رہائش کا مرحلہ درپیش تھا۔ بچے ہنوز مری میں مقیم تھے اور مجھے اکیلے ہی نیچے آنا پڑا تھا۔ اکرام ایمن ان دنوں مال ہوسٹل میں مقیم تھے۔ انہوں نے خوشی خوشی مجھے اپنے ہاں مہمان ٹھہرایا اور مجھے آرام فراہم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اکرام ایمن نے بڑا رچا بسا ادبی ذوق پایا ہے۔ ہم دونوں فارغ اوقات میں مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے اور اپنے اپنے حاصلِ مطالعہ سے ایک دوسرے کو "محظوظ" کرتے۔

اکرام ایمن صاحب کو میں نے ایک نہایت عمدہ ساتھی اور رفیق کار پایا ہے۔ ان کی صحبت میں آپ جتنی دیر بیٹھیں گے، بوریت آپ کے پاس نہیں پھٹکے گی۔ بات سے بات پیدا کرنا اور گلوں میں رنگ بھرنا کوئی ان سے سیکھے۔ تعلقات عامہ کے وہ خصوصی ماہر ہیں۔ سرکاری سطح پر کم اور ذاتی تعلقات کے بل بوتے پر کام بہت جلد نکلوا لیتے ہیں۔ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ ان کا انداز یہ ہے کہ حل طلب مسائل لے کر وہ افسر متعلقہ کے دفتر میں جا پہنچتے ہیں۔ اس سے

گپ لگاتے ہیں کہ اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ چائے، سموسوں کا دور بھی چلتا ہے اور آن کی آن میں کام بھی پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔

اکرام امین صاحب سے میں نے مسائل سے نمٹنے کا عملی تجربہ سیکھا۔ یہ تجربہ میرے لئے آنے والے سالوں میں بہت سودمند ثابت ہوا۔ افسوس، موصوف اسوقت دنیا میں موجود نہیں۔

بریگیڈیئر اعجاز صاحب سے ۵۱-۱۹۵۰ء سے میری یاد اللہ چلی آرہی ہے جس کا ذکر آپ سن ہی چکے ہیں۔ اعجاز میرا رفیق کم اور بھائی زیادہ ہے۔ اسی بنا پر ان کے ساتھ مل کر کام کرنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ مزاج میں بنیادی فرق کے باوجود ہم دونوں سالہا سال سے خلوص اور محبت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کا حق ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔

اعجاز صاحب کام پیٹنے کے فن میں ماہر ہیں۔ اپنے لئے مصروفیت خود پیدا کرتے ہیں۔ کام کا براہ راست ان سے تعلق ہو، نہ ہو۔ وہ "جھپا" مار کر اسے دبوچ لیں گے۔ ان تھک محنت کے عادی ہیں۔ سرکاری کام کی تکمیل جب تک ان کی منشا کے مطابق نہ ہو جائے، وہ چین سے نہیں بیٹھتے ان کی یہی روشنئ طبع کبھی کبھی ان کے لئے بلا بھی بن جاتی ہے۔

ان کے رفیق (خصوصاً وہ، جو ان کے مزاج کے پیچ وخم سے

ٹھیک طرح واقف نہیں ہوتے، سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ شخص، انہیں پچھاڑ کر خود اپنی نوکری سیدھی کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر وہ لوگ (ان میں میرا نام بھی شامل کر لیجئے) جو انہیں زیادہ قریب سے جانتے ہیں، اس قسم کی بدگمانی کا قطعاً شکار نہیں ہوتے۔

اعجاز صاحب کے مزاج میں بڑی بے قراری پائی جاتی ہے۔ جو کام سکون اور حوصلے سے کیا جا سکتا ہو اس میں بھی یہ اضطراری اور ہنگامی صورت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بڑے صاحب کی طرف سے بلاوا آجائے تو یہ ان کی خدمت میں چل کر حاضری دینے کے قائل نہیں۔ بھاگ کر آداب بجا لانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ صاحب کی کسی بات سے اتفاق کرنا مقصود ہو (اور وہ سو فیصد معاملوں میں ہوتا ہے) تو ان کے بدن کا ہر عضو سراپا داد بن کر ابھرتا ہے۔ ان کے "مہربانوں" کو ان اداؤں میں خوشامد کی بو آتی ہے۔ ویسے حق یہ ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس طرح کی دلچسپ ادائیں، تو ان کی شخصیت کا لازمہ ہیں۔

اعجاز صاحب کے مزاج کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ وہ کام کرنے کے بعد اس کی تشہیر کا پورا پورا انتظام بھی کرتے ہیں۔ اس طرزِ عمل میں ذاتی نام و نمود کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔

ان کی اصل خواہش یہ ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی ان کارکردگی اور ان کی محنت اور ان کے جذبے کی لگن کے قائل ہو سکیں۔ افسوس، ان کی یہ ادا بھی ہمارے کئی ساتھیو کو نہیں بھاتی۔

میرے کئی کرم فرما مجھے اکثر مشورہ دیتے ہیں کہ تمہارے اور اعجاز صاحب کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ پھر یہ دوستی کیسی؟ میں اپنے مہربانوں کی باتیں سنی ان سنی کر دیتا ہوں۔ انہیں کیا معلوم۔ اعجاز خلوص کے کس بے مثال پیکر کا نام ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اعجاز بغیر کسی تامل کے میری خاطر اپنی جان بھی چھڑک سکتا ہے۔ ویسے میں نے کبھی اسے ایسی آزمائش میں نہیں ڈالا کہ اس پر ہنوز بہت سی گھریلو ذمہ داریاں

قارئین! چلئے۔ اعجاز اکبر اور اکرم ایمن سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ یہ بات بریگیڈیئر نذیر صاحب کے حوالے سے ہو رہی تھی۔ بریگیڈیئر صاحب نے آرمی ایجوکیشن کور کا امیج (IMAGE) بلند کرنے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ یہ ان کی ذاتی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ آج ہمیں ایجوکیشن کور کا ہر افسر ایم اے/ایم ایس سی، دکھائی دے رہا ہے۔ ورنہ ان سے پہلے تو اکثر افسر بی۔اے۔بی۔ایڈ ہی ہوا کرتے۔ علم کی وہ بے حد قدر کیا کرتے۔ میرے ساتھ ان کے امتیازی سلوک کی بنیادی

وجہ یہی تھی کہ میں تحصیل علم میں قدرے سنجیدہ تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ تلقین کرتے۔ سرور! آپ جیسے آدمی کو صرف ایم اے انگریزی اور ایم اے (اردو) پر اکتفا کرنا زیب نہیں دیتا۔ آپ کو ڈاکٹریٹ کے لیئے کمربستہ ہونا چاہیئے۔ میں نے ایک دن موقع غنیمت جان کر ان کی خدمت میں عرض کیا۔ سر! پی ایچ ڈی تو غالبًا میرے نصیب میں نہیں۔ البتہ اگر آپ میری لاہور پوسٹنگ کرا دیں تو ایک آدھ ایم اے ضرور کر لوں گا۔ وہ ہنسے اور فرمانے لگے۔ شرط منظور۔ میں آپ کی پوسٹنگ لاہور کرائے دیتا ہوں۔ مگر خیال رہے وعدہ خلافی نہ ہونے پائے۔ اور حضرات! یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔ بریگیڈیئر نذیر جو کہتے ہیں وہ کر بھی دکھاتے ہیں۔ ہفتہ عشرہ کے اندر اندر میرے لاہور پوسٹنگ کے احکامات موصول ہو گئے۔ یہ اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ کی بات ہے۔

لاہور روانہ ہونے سے قبل آیئے، پنڈی میں اپنے دو سالہ قیام کا سرسری جائزہ لیتے چلیں۔

مجھے رہائش کے لیئے سرور روڈ پر ایک وسیع و عریض گھر الاٹ ہوا۔ یہ گھر رقبے، مکانیت اور محل وقوع کے اعتبار سے مثالی تھا۔ مگر خستگی اور درماندگی میں بھی اپنا کوئی ثانی نہ رکھتا تھا۔ دیواروں میں گہرے شگاف پڑے ہوئے تھے اور

چھتوں کو دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ ان کا گرنا ٹھہر گیا ہے۔ صبح گریں یا شام۔ ہم لوگ اسی امید و بیم میں شب و روز بسر کر رہے تھے۔ متبادل رہائش کی کوشش جاری تھی جسے بڑی دیر بعد کامیابی نصیب ہوئی۔

ویسے ذاتی طور پر مجھے اس بوسیدہ گھر میں ٹھہرنے سے بڑا فائدہ پہنچا۔ ہمارے پڑوس میں نشنل بک فاونڈیشن کی بک شاپ اور لائبریری واقع تھی۔ میں اپنی شامیں اسی بک شاپ میں بسر کرتا تھا۔ اس زمانے میں انچارج مسٹر عزیز تھے۔ ان کی وساطت سے نئی کتابوں تک میری رسائی ہو جاتی۔ میرے لئے یہ بات بڑی اطمینان بخش تھی۔

اُن دنوں عزیزم ضیا انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجیز (INSTITUTE OF MODERN LANGUAGE) کا کورس کرتا تھا۔ اس کی وساطت سے ہمیں چینی زبان کی "مشکل پسندی" کا علم ہوا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ضیا انسٹی ٹیوٹ سے گھر لوٹتا تو وہ اپنے آپ کو ایک تنہا کمرے میں بند کر لیا کرتا اور پھر پہروں اونچی آواز میں "چوں، چاں" کی ڈراؤنی بولیاں نکالتا۔ یہ عمل پہروں جاری رہتا۔ ہم لوگ شروع شروع میں بہت حیران ہوئے کہ یہ کس قسم کی زبان ہے۔ مگر دھیرے دھیرے ہمارے کان اس 'چین چین' اور 'کڑاں کڑاں' سے

مانوس ہونے لگے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ اگر پیکنگ ریڈیو سے چینی زبان میں موسیقی کا پروگرام چل رہا ہو تو میں اہتمام کے ساتھ اسے ضرور سنتا ہوں۔ اس زبان کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود مجھے اس سے بڑا پیار ہے۔ ایک تو برادرِ خورد کے حوالے سے۔ اور دوسرے عظیم چین کی نسبت سے۔

۱۷۸ سرور روڈ سے نقل مکانی کر کے ہم لوگ ۱۳۶ سبزہ زار میں جا مقیم ہوئے۔ یہ ایک ڈربہ نما چھوٹا سا گھر تھا جو چاروں جانب سے بند تھا۔ پردے کا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی اس میں اہتمام موجود تھا۔ جنگ کے دنوں میں ہم اسی گھر میں مقیم تھے۔ برادرم ضیا کی پوسٹنگ ملتان ہو گئی تھی۔ بیٹی شفقت خالدہ لاہور میں ایم اے اردو کے آخری سال کی طالبہ تھی۔ ندیم چوتھی جماعت کا طالب علم تھا۔ اور سہیل اسکول جانے کے آداب سیکھ رہا تھا۔ اس گھر میں، قیام کے دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ صرف چند ایام ایسے تھے جن کی تلخ یاد ہنوز تازہ ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ دشمن کے جہاز دن اور رات میں کئی کئی بار ہماری فضاؤں میں گشت کرتے اور مجھے سرکاری فرائض کے سلسلے میں عین خطرے کی حالت میں پنڈی، اسلام آباد کے چکر کاٹنے پڑتے

تھے۔ اُدھر برادرم کیپٹن ضیا کی پوسٹنگ کے احکامات موصول ہو چکے تھے۔ انہیں ملتان رپورٹ کرنا تھا۔ عین اسی صبح میری ہمشیرہ سکینہ (اللہ بخشے) کے گلے کا آپریشن طے پایا تھا۔ اس کے لئے مجھے دو بوتلیں خون مہیا کرنے کو کہا گیا تھا۔ بھائی کو محاذِ جنگ پر بھجوانا اور موت اور حیات میں مبتلا بہن کے آپریشن کا صدمہ اور پھر لڑائی کے دنوں میں خون کی فراہمی ..... میرے لئے یہ سب مراحل بڑے صبر آزما تھے۔ مگر میں نے آزمائش کی اس گھڑی میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اللہ نے خون کا انتظام بھی کر دیا۔ آپریشن بھی کامیاب رہا اور اگلے دن بھائی کے بخیریت تمام ملتان پہنچنے کی اطلاع بھی مل گئی۔

میں نے اس زمانے میں ہفت روزہ "ہلال" کے لیئے بہت کچھ لکھا۔ "قائدِ اعظم اور افواجِ پاکستان پر میرے مضامین کے سلسلے کو بہت سراہا گیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے جذبۂ ایمانی پر میں نے ایک تفصیلی مضمون رقم کیا جسے بعد میں چند دوسرے رسالوں نے بھی نقل کیا۔ اسی طرح ٹروپ موٹیویشن کے سلسلے میں میرے دو تین مضامین شائع ہوئے اور قارئین نے انہیں بھی پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔

مضامین چھپوانے کا ذکر چل نکلا ہے تو میں اپنی دو حماقتوں کا برملا ذکر کرتا چلوں۔ اللہ کا فضل ہے۔ مجھ

پھر جب لکھنے کا دورہ پڑ جائے تو وہ مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ "ہلال" میں جس زمانے میں مَیں لکھا کرتا تھا، ان دنوں ہفتے میں دو، تین مضامین تیار ہو جایا کرتے۔ ظاہر ہے کوئی ایڈیٹر کسی مضمون نگار کو اتنا پروجیکٹ نہیں کر سکتا کہ اس سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اُدھر میرا عالم یہ تھا کہ میرا بے تاب قلم رُکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ میری حماقت، مجھے یہ خیال ہی نہ آیا کہ اظہار کی نئی راہیں، ہلال کے علاوہ بھی، تلاش کی جا سکتی تھیں۔ میرے اعصاب پر "ہلال" کا راج تھا۔ ایک موقع پر میرے پاس دو مضامین تیار تھے۔ میں نے سوچا۔ ایک اپنے نام سے چھپوا دیتا ہوں اور دوسرا معراج صاحب کے نام سے۔ میرے اور موصوف کے مابین فرق ہی کیا ہے۔ میں نے ان صاحب کے نام سے جو مضمون لکھا اس کا عنوان تھا ——

"دامِ ہر رنگِ زمین" ذرا فارسی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔

مضمون چھپ گیا تو "صاحبِ مضمون" کا مجھے فون موصول ہوا۔ کرم فرمائی کا شکریہ۔ مگر ذرا اس عنوان کا مطلب تو سمجھا دو۔ لوگ پوچھیں تو انہیں کیا بتاؤں۔ پھر جب میں نے ان کی مشکل آسان کر دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ مضمون کا معاوضہ (غالباً ۲۵ یا ۳۰ روپے) جب انہیں ملا، تو انہوں

نے اسے میرے حوالے کرنے کی کوشش کی۔ مگر میں نے انہیں یہ رقم یہ کہہ کر لوٹا دی۔ قبلہ! آپ کو یہ رقم مبارک۔ اگر آپ کو بذاتِ خود جھجک محسوس ہو رہی ہو تو اس رقم سے ٹافیاں خرید کر بچوں کا منہ میٹھا کرا دیجیے۔ وہ خوش ہو جائیں گے۔

اور اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ۔ جس زمانے میں میں ایجوکیشن کور کے جریدے کا مدیر تھا، ایجوکیشن کور کے ایک اعلیٰ افسر (اللہ بخشے۔ اس وقت وہ اس دنیا میں موجود نہیں) میرے دفتر میں تشریف لائے اور بڑے رازدارانہ لہجے میں فرمانے لگے۔ سرور! مضمون لکھنا تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک مضمون مجھے بھی لکھ دو۔ میری "ٹوہر" بن جائے گی۔ میں ان کی باتوں میں آ گیا اور اس طرح ایک عدد مضمون بزبانِ انگریزی ان کے نام سے چھپوا دیا۔ ان دنوں مضمون نگار کو پچاس روپے معاوضہ بھی ملتا تھا۔ مجھے یاد ہے جس دن پرچہ پریس سے برآمد ہوا اور تقسیم ہوا اسی دن وہ میرے دفتر میں تشریف لائے اور مجھ سے چیک کا تقاضہ کیا۔ میں ان کی بات سمجھ نہ سکا۔ پوچھا۔ سر! کون سا چیک؟ میرے اس استفسار پر وہ کچھ خفا سے ہو گئے۔ فرمانے لگے۔ بھئی، تمہارے بھی کیا کہنے۔ مجھ سے پوچھ رہے ہو کونسا چیک؟

رسالہ میری جانب آگے بڑھاتے ہوئے فرمانے لگے: دیکھتے نہیں ہو۔ یہ میرا مضمون چھپا ہے ۔ اس کا معاوضہ نہیں دو گے کیا ؟

اور یہ بات سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ "چہ دلاور از دُزدے"، کا صحیح مفہوم اُسی دن مجھ پر آشکار ہوا۔

باب — ۲۱

لاہور کے شب و روز

لاہور پوسٹنگ کے احکامات اگست ۱۹۷۲ء میں موصول ہو گئے تھے۔ مگر میری "رخصتی" اکتوبر ۱۹۷۲ء میں عمل میں آئی۔ لڑائی ختم ہو چکی تھی مگر فوجیں ہنوز سرحدوں پہ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ ہمارا ڈویژن قصور سے اٹھارہ بیس میل دور ایک مقام پہ لنگر انداز تھا۔ ریئر ہیڈکوارٹر (REAR HEADQUARTER) البتہ لاہور میں کام کر رہا تھا۔

میں ریلوے سٹیشن پر پہنچا تو صوبیدار میجر ڈیوڈ میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے اپنا سامان جیپ میں رکھوایا اور انہیں کہا کہ وہ جیپ کا رُخ حضرت داتا گنج بخش ؒ کے مزار کی جانب موڑ دیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے وہاں پہنچ کر حاضری دی اور اللہ میاں سے گڑگڑا کر التجا کی کہ وہ لاہور کا قیام میرے لئے خوشگوار بنائے۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں آفیسر میس پہنچا جہاں میرے قیام و طعام کا خاطر خواہ انتظام پہلے سے کیا جا چکا تھا۔

اگلی صبح جیپ مجھے فارورڈ ایریا میں لے گئی جہاں ڈویژ ہیڈ کوارٹر (DIV- HQ) قائم تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ سب دفاتر کھلے آسمان تلے مصروف عمل ہیں۔ میرے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ میرا دفتر بھی ایک ٹینٹ کے اندر ہی لگایا گیا تھا۔ میرے ہمراہ دو ایجوکیشن انسٹرکٹرز بھی تھے جو ڈاک کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے۔ کام کاج کچھ زیادہ نہیں تھا تعلیمی سرگرمیاں مفقود تھیں۔ ایک آدھ میپ ریڈنگ کی کلاس تھی جو ریئر ہیڈ کوارٹر لاہور میں چل رہی تھی۔

پہلے دن میری ملاقات جملہ سٹاف کے علاوہ جی ایس او (ون) لیفٹیننٹ کرنل عبد الرشید قریشی (حال بریگیڈیئر) اور کرنل سٹاف کرنل افتخار احمد خان (حال بریگیڈیئر) سے کرائی گئی۔ ان حضرات نے مجھے اپنی فارمیشن کے تعلیمی کوائف سے آگاہ کیا۔ ہماری بات چیت تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے اور ناخواندگی ختم کرنے کے اردگرد گھومتی رہی۔

جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل (حال جنرل) سوار خان سے میری ملاقات اگلی صبح کو کرائی گئی۔ موصوف اپنے سفری ہیڈ کوارٹر میں قیام پذیر تھے۔ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ انٹرویو کے

دوران بڑی تفصیل کے ساتھ میری تعلیمی قابلیت، تجربے اور خصوصی مشاغل کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ انہیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تعلیمی مسائل کے ساتھ ساتھ اسلامی موضوعات سے بھی مجھے دلچسپی ہے۔ جنرل صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ڈویژن میں تعلیمی مسائل کا حل تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے جوانوں کی اخلاقی تربیت اور ان کا مورال بلند کرنے پر بھی خصوصی توجہ دینا پڑیگی۔ جنرل صاحب نے قرآنِ پاک کے حوالے سے جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر بڑی ایمان افروز باتیں کیں اور علامہ عبداللہ یوسف علی کی تفسیر کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا۔ یہ تفسیر اس زمانے میں ان کے زیرِ مطالعہ تھی۔

میں نے جنرل صاحب کی ہدایات کے مطابق اپنی فارمیشن میں تعلیمی پالیسی سے متعلق اپنی سفارشات مرتب کیں۔ میں نے بڑی تفصیل کے ساتھ سارے مسائل کا احاطہ کیا۔ متعلقہ یونٹوں سے ناخواندہ اور نیم خواندہ افراد کی تعداد معلوم کی۔ اور پھر خصوصی کلاسیں (SPECIAL CADRES) چلانے کی تجاویز پیش کیں۔ میں نے سارے پروگرام کو اسطرح ترتیب دیا کہ اس پر عمل پیرا ہوکر ہی ایک سال کے اندر اندر اپنی فارمیشن سے ناخواندگی کا قلع قمع کیا جا سکتا تھا۔

میری سفارشات کو جنرل صاحب کی منظوری حاصل ہوگئی۔ پھر

ماتحت یونٹوں نے اس ڈِیو ایجوکیشن پالیسی پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس پالیسی پر عمل پیرا ہو کر ہمارے ڈویژن نے مطلوبہ تعلیمی مقاصد حاصل کر لیے۔ اُدھر ڈِیو سنٹرل سکول میں ہم نے سنٹرل کلاسوں کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں میپ ریڈنگ، فسٹ کلاس، میٹرک اور ایف اے کے اُمیدواروں کی تیاری کا خصوصی انتظام کیا گیا۔ ڈویژن کی زیرِ کمان یونٹوں سے جے سی او انسٹرکٹرز کو اکٹھا کیا اور ان کی تعلیمی قابلیت کے پیشِ نظر مختلف کلاسوں کی ذمہ داری انہیں سونپی۔

ڈِیو سنٹرل اسکول کی عمارت ایک بیرک میں واقع تھی جسے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اسکول کی عمارت ہے۔ میں نے جنرل صاحب کی توجہ اس کی حالتِ زار کی جانب مبذول کرائی۔ انہوں نے ازراہِ کرم مناسب رقم کا اہتمام فرما دیا۔ کچھ کام ہم نے اپنی مدد آپ کے تحت سرانجام دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جنرل صاحب کی سرپرستی اور اسکول اسٹاف کی ذاتی دلچسپی کے طفیل ایک گھسی پٹی بیرک، اچھے خاصے آباد اور متحرک اسکول کا منظر پیش کرنے لگی۔ ہم نے اس کے ارد گرد چار دیواری کا انتظام کیا۔ اسکول کینٹین کی اصلاح پر توجہ دی اور اسکول کے چاروں طرف سایہ دار درخت لگوائے۔ پھولوں کی کیاریاں بھی بنوائیں۔ دو سال بعد جب میں لاہور سے پوسٹ ہو کر پنڈی آیا تو اس وقت یہ

درخت دھیرے دھیرے ابھر رہے تھے۔ پچھلے سال مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہ ننھے منے پودے اب تناور درختوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ انہیں ہوا میں مستانہ وار جھومتے دیکھ کر بے اختیار میرے دل کی گہرائیوں سے جنرل سوار خان صاحب کے حق میں دعائیں ابھریں جنہوں نے اسکول کی بہبود پر اپنی خصوصی توجہ فرمائی تھی۔

ادھر ٹروپ موٹیویشن پروگراموں کے بارے میں سنیئے۔ جنرل صاحب نے پہلے دن دورانِ گفتگو مجھے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ میں اس پروگرام کے بارے میں اپنی سفارشات مرتّب کر دوں۔ چنانچہ تعلیمی پالیسی کی طرز پر میں نے موٹیویشن ٹریننگ پر بھی ایک تفصیلی پیپر تیار کیا۔ میں نے تجویز کیا کہ اسلام کے دائمی پیغام کو عام کرنے کے لئے، عملی قدم اٹھانا بہت ضروری ہے۔ میں نے اس ضمن میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ ڈپو ہیڈکوارٹر سے میں اور میرا ایجوکیشن اسٹاف مناسب مواد برلئے مطالعہ تیار کر کے پوری فارمیشن کو مہیا کرے گا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ جی ٹو ایجوکیشن (یعنی راقم الحروف) ہر ہفتے باری باری ہر یونٹ میں جا کر کسی ایک موضوع پر تمام نفری سے خطاب کرے گا۔ جنرل صاحب نے میری تجاویز کے آخری حصے کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ فرمانے لگے کہ اس طرح ہم خود عملی مثال قائم کریں گے تو دوسرے لوگ لازمی

طور پر اس کی تقلید میں قدم اٹھائیں گے۔

صوبیدار (بعد میں صوبیدار میجر) سید ملازم حسین شاہ میرے سنٹر جے سی او تھے۔ بڑے محنتی، دیانت دار اور قابل اعتماد ساتھی تھے۔ دین کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے تھے۔ علامہ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے۔ علامہؒ کے کلام کا بیشتر حصہ انہیں حفظ تھا۔ انہیں جب میری افتادِ طبع کا علم ہوا تو انہوں نے میرے ساتھ ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ پھر جتنا عرصہ ہم اکٹھے رہے ہماری رفاقت بطور مثال پیش کی جانے لگی۔ ہوتا یوں کہ میں اور ملازم صاحب طے شدہ پروگرام کے مطابق ہر جمعہ کی صبح کو متعلقہ یونٹ کا رُخ کرتے۔ وہاں یونٹ کے تمام افراد جمع ہوتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا انتظام بھی ہوتا۔ ابتدائیہ کلمے شاہ صاحب کہتے۔ پھر تفصیلی لیکچر کے لیئے مجھے دعوت دی جاتی۔

کہتے ہیں دل کی گہرائیوں سے جو بات نکلے وہ ضرور اثر رکھتی ہے۔ تقریر کے دوران مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میری سیدھی سادی، عام فہم باتیں سامعین کے دلوں پر گھر کر رہی ہیں اور اپنے گہرے اثرات ان کے ذہنوں پر مرتب کر رہی ہیں۔ جہاد کے موضوع پر جب میں اسلامی تاریخ کے حوالوں سے بات آگے بڑھاتا تو مجھے یوں لگتا جیسے میرے سننے والوں کی رگوں میں خون کی حرارت تیز ہو گئی ہے اور وہ اسلام کی سربلندی کی خاطر

کٹ مرنے کے لیئے بے قرار ہو رہے ہوں۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ میری تقریر کے دوران جوانوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ ایک آدھ بار تو یوں بھی ہوا کہ میرے لیکچر سے متاثر ہو کر ایک جذباتی جوان نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو للکارنے لگا کہ وہ اٹھیں، سروں پر کفن باندھیں اور اسلام کی سربلندی کے لیئے کچھ کر دکھائیں۔

میں دو سال سے کچھ عرصہ زائد لاہور میں مقیم رہا۔ اللہ کا احسان ہے۔ اس تمام عرصے کے دوران میرے موٹیویشن کے پروگرام میں کوئی التوا یا خلل واقع نہیں ہوا۔ جمعہ کی صبح میں نے ان لیکچروں کیلیئے وقف کر دی تھی۔ بعد میں ان لیکچروں کو میں نے کتابی شکل میں ترتیب دے ڈالا اور اس کا نام "راہِ عمل" تجویز کیا۔ اللہ نے ہمت دی تو اسے کبھی چھپوانے کی کوشش کروں گا۔ اس کتاب کا پیش لفظ جنرل سوار خان صاحب نے لکھا ہے جنکی ولولہ انگیز مومنانہ قیادت سے متاثر ہو کر میں نے اس کتاب کو مکمل کیا تھا۔

لاہور قیام کے دوران میں اپنے استادِ گرامی قدر چوہدری احمد خان اور محبی قاضی محمد اسماعیل کے ہاں باقاعدگی سے حاضری دینے جاتا۔ ان اصحاب سے آپ پہلے متعارف ہی ہیں۔ ان سے مل کر مجھے روحانی خوشی نصیب ہوتی۔ خلوص دونا کے پیکر قابل صد احترام ہیں۔ حسن اتفاق سے لاہور میں اقبال کے ایک شیدائی سے

بھی میری ملاقات ہو گئی۔ بات یہ تھی کہ میں اپنی فارمیشن میں جملہ فرائض کے ساتھ ساتھ فیلڈ کیشیئر کی اضافی ڈیوٹی بھی سرانجام دے رہا تھا۔ اور اس حیثیت سے مجھے مہینے میں تین چار بار لاہور اسٹیٹ بینک کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ متعلقہ افسر قادر صاحب تھے۔ وہ تبدیل ہوئے تو ان کی جگہ قریشی صاحب پوسٹ ہو گئے۔ ایک دن میں کیش کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ قریشی صاحب فرمانے لگے: لیجئے میجر صاحب! ۴ لاکھ روپے۔ کہیئے اب تو آپ بڑے مالدار ہو گئے۔ مال کا لفظ سن کر بے خیالی کے عالم میں اقبال کا یہ شعر میرے لبوں پر رواں ہو گیا ؎

مرد درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ
ہے کسی اور کی خاطر یہ نصاب زر و سیم

ایک فوجی میجر کی زبانی اقبال کا اتنا عمدہ شعر سننا قریشی صاحب کے لئے ایک خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔ وہ بے اختیار سر دھننے لگے۔ پھر مجھ سے مزید اشعار سننے کا مطالبہ کیا جسے میں نے متعدد بار پورا کیا۔ انہوں نے میرے حسنِ انتخاب کی داد دی جسے میں نے بصد شکریہ قبول کر لیا۔

مگر میرے ترکش کے تیر بہت جلد ختم ہو گئے۔ اب قریشی صاحب کی باری تھی۔ موصوف نے اقبال کے فارسی کلام سے منتخب حصے سنائے اور ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی پیش کی۔ یہ سلسلہ

کافی دیر تک جاری رہا۔ اس کے بعد میرا یہ معمول تھا کہ جب کبھی مجھے موقع ملتا ان کے ہاں ملنے ضرور چلا جاتا اور اقبال اور رومی کے افکارِ عالیہ سے اپنی جھولی بھر کر لوٹتا۔

داتا صاحب کے ہاں حاضری دینا بھی میرے معمولات میں شامل تھا۔ میں دربار سے لوٹتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے میرے ذہن کے تاریک گوشوں کو روشنی نصیب ہو گئی ہو۔ درویشوں کے کیا کہنے۔ ان کے انداز ہی نرالے ہیں۔

ویسے بسا اوقات مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا کہ چند بد وضع، جرائم پیشہ، لٹیرے ہیں چور "عقیدت مند" بھی مزار کے آس پاس منڈلاتے دکھائی دیتے۔ ان کی موجودگی سے اس مزار کا تقدس مجروح ہوتا دکھائی دیتا۔ جانے، ان لوگوں کو کس نے یہ باور کرا دیا ہے کہ داتا صاحب کے دربار پر حاضری دینے سے ان کے گناہ دُھل جائیں گے۔

میں ایک دن دربار سے لوٹا اور چوہدری احمد خان صاحب کی دکان پر پہنچا۔ میں نے ان "اللہ لوگوں" کے حوالے سے اپنے انقباض کا تذکرہ کیا۔ چوہدری صاحب فرمانے لگے۔ سرور! ہمارے ہاں لوگوں نے خیر و شر کے علیحدہ علیحدہ خانے بنا رکھے ہیں۔ لوگ جرم کرتے ہیں قتل کا ارتکاب کرتے ہیں دوسروں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور پھر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے داتا صاحب

کے ہاں حاضری دینے آجاتے ہیں ۔ اس طرح وہ سمجھتے ہیں کہ ان کے گناہ دُھل گئے ۔ اس ضمن میں انہوں نے ایک واقعہ بھی سنایا جو کچھ یوں تھا ۔

ایک جیب تراش رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ۔ اس نے جرم کا اعتراف کر لیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ۔ لیکن گرفتاری کی وجہ یوں بیان کی کہ وہ عرصہ دراز سے اس دھندے میں لگا ہوا تھا اور بڑی باقاعدگی سے "مالِ غنیمت" کا ایک مخصوص حصہ داتا صاحب کے دربار کی نذر کرتا رہا تھا ۔ پچھلے دنوں اس کی نیّت میں فتور آگیا اور اس نے مخصوص شرح کی بجائے اس سے کم رقم ادا کی ۔ اس گستاخی کی پاداش میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی ۔ ورنہ بقول اس کے، داتا صاحب اگر ناراض نہ ہو گئے ہوتے تو پھر پولیس کی کیا مجال تھی کہ وہ اس پر ہاتھ ڈالتی ۔

اور میں اس "عقیدت مند" کے طرزِ استدلال پر سر پیٹ کر رہ گیا ۔

میری اب لاہور سے دوبارہ راولپنڈی پوسٹنگ عمل میں آنے والی ہے ۔ آیئے جانے سے پہلے آپ کو اپنے گھر والوں سے ملواؤں ۔ پھر اپنے دوستوں سے فارغ ہو کر پنڈی چلیں گے ۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے ۔

بیٹی شفقت خالدہ اس زمانے میں ایم اے کا امتحان پاس کر

چکی تھی ۔ ملازمت ملنے کا امکان نہ تھا ۔ اس لئے ہم نے اسے بی ایڈ میں داخلہ دلوا دیا ۔ اللہ نے مدد کی ۔ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا ۔ ٹروپ بس پر وہ علی الصبح گھر سے چلی جاتی اور سرِ شام اسی پر لوٹ آتی ۔ یہ کورس دس ماہ کے اندر مکمل ہو گیا ۔ اب ایم اے کے ساتھ اس کی ڈگریوں میں بی ایڈ کا اضافہ ہو چکا تھا ۔

اب ہمیں فکر لاحق ہوئی کہ اسے جلد ملازمت دلوائی جائے ۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کا یوں گھر میں بیکار بیٹھے رہنا اچھا نہیں لگتا ۔ ان دنوں گیریژن اسکولوں کے انچارج سید فیاض شاہ تھے ۔ وہ میرے پرانے جاننے والے تھے ۔ میں نے سوچا، وہ ملازمت دلوانے میں ضرور مدد کریں گے ۔ مگر ان کے رویے میں مجھے بڑی سرد مہری دکھائی دی ۔ انہوں نے ایک عارضی آسامی پر اعظم گیریژن اسکول میں چند ہفتوں کے لئے بیٹی کا تقرر تو کر دیا، مگر بڑی پس و پیش کے بعد ۔

خیر! کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ گیریژن اسکول کی عارضی ملازمت ہونے سے چند دن پہلے بیٹی کو بطور این ۔ ڈی ۔ وی ۔ پی لیکچرار اسلامیہ کالج فار ویمن لاہور چھاؤنی میں جگہ مل گئی ۔ یہ کالج ہمارے گھر واقع طفیل روڈ سے چند گز کے فاصلے پر تھا ۔ یہ تقرر ہمارے لئے نیک فال ثابت ہوا ۔ کالج کی فضا میں پہنچ کر بیٹی کی قابلیت کے جوہر کھلے ۔ اس کی شاگرد لڑکیاں اس کے کام اور اس کے حسنِ سلوک سے اتنی زیادہ متاثر ہوئیں کہ کئی پرانی لیکچراروں کے برسوں کے طلسم ٹوٹ گئے ۔

کئی لڑکیاں عقیدت کے اظہار کے طور پر "اپنی مس" کو ہر روز گھر تک چھوڑنے آتیں ۔ ان بچیوں میں سے ایک صاحبزادی نسیم اختر محمد علی زیادہ ثابت قدم ثابت ہوئی ہے ۔ وہ آج تک "اپنی" مس" کو باقاعدگی سے خط لکھتی ہے اور پرانے دنوں کی یاد تازہ کرتی ہے ۔ اس کی باجی جواب نہ دے تو مجھے ثالث ٹھہرا کر باجی کی "سنگ دلی" کا رونا رونے لگتی ہے ۔ ادھر میں اپنی جان بچانے کی غرض سے "مس" اور اس کی شاگرد کے درمیان صلح کرا دیتا ہوں ۔

ندیم اور سہیل دونوں بوائز گریژن ہائی اسکول کے طالب علم تھے ۔ اسکول کا فاصلہ ہمارے گھر سے کوئی دو میل کے لگ بھگ تھا ۔ ندیم تو سائیکل پر اسکول چلا جاتا ۔ سہیل البتہ چھوٹا تھا ۔ اسے سکول تک موٹر سائیکل پر چھوڑنے اور لے آنے کی ذمہ داری میں نے قبول کر رکھی تھی ۔ خوش قسمتی سے یہ اسکول میرے دفتر کے راستے میں پڑتا تھا ۔ میں پورے دو سال یہ فرض سر انجام دیتا رہا ۔ اس سارے عرصے میں اللہ نے ہر حادثے سے محفوظ رکھا ۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ سہیل کا پاؤں بدقسمتی سے پہیئے میں الجھ گیا جس سے وہ بُری طرح کچلا گیا ۔ خون تھا جو تھمنے کا نام نہ لیتا تھا ۔ اس طرح اس غریب کو کئی دن لنگڑا کر چلنا پڑا ۔

شاہدہ کی ذہنی حالت کی تفصیل تو آپ سُن ہی چکے ہیں ۔ بیچاری ذہنی پسماندگی کی شکار ہے ۔ اس زمانے میں اُس سے ایک ایسی حرکت

سرزد ہو گئی جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

بیٹی شفقت کا جسم موٹاپے کی جانب مائل تھا۔ اس نے فربہی کو ختم کرنے کی غرض سے ڈائیٹنگ (DIETING) کا پروگرام بنایا۔ اور اس پر عمل شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم متناسب ہو گیا۔ موٹاپا ختم۔ شاہدہ غور سے اپنی باجی کی خوراک پر نظر رکھتی رہی۔ صبح کے ناشتے میں دودھ کا گلاس، دو ٹوسٹ۔ دوپہر کو اُبلی ہوئی سبزی اور ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا۔ رات کے وقت بغیر ملائی والے دودھ کی ایک پیالی وغیرہ وغیرہ شاہدہ دُبلی پتلی لڑکی ہے۔ اسے کیا ضرورت کہ ڈائیٹنگ کے چکر میں پڑے۔ مگر بیچاری کی ذہانت کا گراف بہت نیچے ہے۔ اس نے بھی بڑی بہن کی تقلید میں کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پہلے صبح شام وہ دو ایک پھلکے سالن کے ساتھ کھا لیا کرتی تھی۔ اب ختم۔ آپ یقین مانیں، گزشتہ سات سالوں سے اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ چائے کی پیالی اور ایک آدھ ٹوسٹ پر صبح شام اس کی گزر بسر ہوتی ہے۔ روٹی، مکھن، مٹھائی کا کوئی نام لے تو وہ سخت برہم ہو جاتی ہے۔ جانے وہ کس چیز کے سہارے زندہ ہے۔

لاہور قیام کے دوران میں نے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کرنے کا ارادہ کیا۔ اس غرض سے میں ایک دن پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ میں جا پہنچا۔ وہاں سب سے پہلے پروفیسر خالد علوی سے

میری ملاقات ہوتی۔ بڑی خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ان کی وساطت سے میرا تعارف پروفیسر ڈاکٹر امان اللہ صاحب سے بھی ہوا۔ جن کے خلوص سے میں اتنا متاثر ہوا کہ آج تک ان سے میرے ذاتی مراسم چلے آ رہے ہیں۔ انہیں میں نے بہت قابل، بہت مخلص اور بہت نیک فطرت انسان پایا ہے۔ دوسروں کی خدمت کرنے میں انہیں بڑی راحت محسوس ہوتی ہے۔ جید عالم ہیں مگر سادگی کا یہ عالم ہے کہ کبھی اپنے علم کی تشہیر نہیں کرتے۔ ٹیلی وژن کے پروگراموں میں آپ نے انہیں اکثر دیکھا ہوگا۔ چھوٹے جملوں میں بڑی بات کہنے کے فن میں ان کا جواب نہیں۔

دھیرے دھیرے شعبۂ اسلامیات کے دوسرے اساتذہ سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ اللہ بخشے، علامہ علاؤ الدین صدیقی ان دنوں بقیدِ حیات تھے اور گاہے گاہے ڈیپارٹمنٹ میں تشریف لایا کرتے تھے۔ میری ان سے دو چار ملاقاتیں وہیں پر ہوئیں۔ وہ بھی بڑی شفقت سے پیش آتے۔

ایک اور شخصیت جس کے خلوص نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا وہ تھی پروفیسر ملک محمد اسلم صاحب کی ذاتِ گرامی۔ موصوف اس وقت ہمارے درمیان موجود نہیں۔ ظالم موت نے آنکھ جھپکتے

انہیں ہم سے چھین لیا۔ مرحوم کے تبحّرِ علمی کی تو بات ہی اور ہے، عام معاملات میں بھی ان کا جواب نہ تھا۔ بڑے خلیق، بڑے خوش گفتار، بڑے معصوم۔ مجھے ان سے گہری عقیدت تھی۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ ان کا بڑا صاحبزادہ عبیدالرحمٰن کیپٹن کے عہدے پر فائز ہے۔ اسے دیکھتا ہوں تو ملک صاحب کی پیاری شخصیت اپنی مخصوص مسکراہٹ بکھیرتی مجھے دکھائی دینے لگتی ہے۔

ان احباب کے علاوہ مجھے حافظ اللّٰہ یار، بشیر احمد صدیقی، پروفیسر برہان احمد فاروقی اور دیگر ممبرانِ اسٹاف کے نیاز حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سب کرم فرماؤں نے میری مقدور بھر رہنمائی فرمائی۔ پھر امتحان کا مرحلہ آیا اور بخیر و خوبی گزر گیا۔ میں نے خدا کے فضل سے فسٹ ڈویژن سے صرف ایک نمبر کم حاصل کر کے امتحان پاس کر لیا۔ فسٹ ڈویژن ایک نمبر سے مِس کرنا ہماری پرانی ادا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا، ایم اے اُردو کے وقت بھی ہم فسٹ کلاس لینے سے بال بال بچے تھے۔

باب — ۲۲

پنڈی میں دوبارہ پوسٹنگ

سنہ ۱۹۷۵ء کے اوائل میں جنرل ہیڈ کوارٹر سے ایک سگنل موصول ہوا جس کا متن کچھ یوں تھا کہ میجر سرور کو نیشنل ڈیفنس کالج میں چھ ہفتوں کی (ATTACHMENT) پر بھیج دیا جائے۔ مقصد اس عارضی تقرر کا واضح تھا۔ این۔ ڈی۔ سی لائبریری میں میری موزونیت کا امتحان لینا مقصود تھا۔ لائبریری کے آفیسر انچارج ونگ کمانڈر (حال ایئر کموڈور) انعام الحق جون سنہ ۱۹۷۵ء میں کالج سے فارغ ہو رہے تھے۔ ان کے بدل کی تلاش مقصود تھی۔ میری خوش قسمتی! قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند۔ سنیارٹی کے اعتبار سے میں پانچویں نمبر پر تھا۔ پھر یہ خصوصی نظرِ کرم کیسی؟ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ ،،

میں ۷ ر مارچ ۱۹۷۵ء کی صبح کو نیشنل ڈیفنس کالج کی لائبریری میں آ پہنچا۔ انعام صاحب پہلے ہی سے میرے منتظر تھے۔ ایک آدھ منٹ کی رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے میری معلومات کا جائزہ لینا چاہا۔ میں نے جب برملا اپنی جہالت کا اعتراف کیا تو انعام صاحب پر ایک ناخوشگوار قسم کی خاموشی طاری ہو گئی۔ میرے کھلے اعترافِ شکست کے بعد میرے مزید امتحان کی کوئی ضرورت تو باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مگر انعام صاحب پر لائبریری کے معاملات کچھ اس حد تک سوار تھے کہ انہیں کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی دس منٹ نہیں گزرے ہوں گے کہ انہوں نے ایک "شافی" قسم کا امتحانی پرچہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا۔ اسے حل کیجئے۔ میں نے پرچہ دیکھا اور دیکھتے ہی چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ میں نے انعام صاحب سے عرض کیا۔ قبلہ! آپ میرے علمی حدودِ اربعہ سے تو واقف ہو ہی چکے ہیں۔ مزید رسوائی چہ معنی دارد؟ میں تو آپ کے حضور زانوئے تلمذ تہ کرنے آیا ہوں۔ آپ سکھائیں گے تو میں یہ سب "مسائلِ تصوف" سمجھ جاؤں گا۔ فی الحال تو میری معذرت قبول فرمایئے۔

میری یہ باتیں سن کر انعام صاحب کو بڑا دکھ ہوا۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے فرمانے لگے۔ یہ بیل تو منڈھے نہیں چڑھے گی۔ جو شخص لائبریری سائنس کی ابجد سے بھی نابلد ہو وہ اتنی

اونچی لائبریری بھلا کیسے چلائے گا؟

تو صاحب، یہ تھی ہمارے پہلے دن کی روداد۔ میں دفتر بند ہونے پر گھر پہنچا تو سخت پریشان تھا۔ تمام رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ معاملہ چوپٹ ہوتا نظر آرہا تھا۔ اپنی رسوائی اور جگ ہنسائی تو صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کوچۂ جاناں سے یوں بے آبرو ہو کر نکلوں گا۔ تو اپنے "کرم فرما"، بے ساختہ تالیاں بجائیں گے۔

اُس زمانے میں ND اور WAR دونوں کورس پورے جوبن پر تھے۔ کورس آفیسرز فارغ اوقات میں انعام صاحب کے ہاں حاضری دیتے۔ ور گوہرِ مراد سے جھولیاں بھر کر لے جاتے۔ اِدھر کسی صاحب نے کتاب انام لیا اُدھر انعام صاحب اُس کی انگلی پکڑے متعلقہ شیلف پر جا پہنچتے۔ انعام صاحب کی شہرت آسمان کی بلندیوں کو چھو رہی تھی، اور بلاشک، وہ اس اعزاز کے مستحق تھے۔

میں دوسرے دن بھی پریشانی کے عالم میں گھر لوٹا۔ اُس شام میں اپنے کرم فرما کرنل (حال بریگیڈیر) اعجاز سے ملنے اور انھیں حالِ دل سنانے ان کے گھر پہنچا۔ ان کے بڑے بھائی چوہدری اکرم بھی وہاں تشریف فرما تھے۔ پوچھنے لگے۔ بھیّا، پریشان کیوں ہو۔ میں نے اپنے مضطرب دل کی تمام کیفیات انھیں کہہ سنائیں۔ میں نے انھیں بتایا کہ سترہ ہزار کتب کے مندرجات سے آگہی، ایک سو چالیس ماہانہ

رسالوں اور پچیس روزناموں کا مطالعہ میرے بس کا روگ نہیں ؏

بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است

چوہدری صاحب خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے پھر بولے بھیّا، تمہیں کسی پنساری کی دکان پر جانے کا کبھی اتفاق ہوا ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگے۔ دیکھو، اس دکان میں موجود چھوٹے بڑے ڈبوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی ہے۔ مگر ایک نیم خواندہ پنساری ٹھیک اسی ڈبے کو جا دبوچتا ہے، جہاں سے مطلوبہ چیز درکار ہوتی ہے۔ یہ سب کام تجربے، لگن اور محنت کے بل بوتے پر ہی ممکن ہے ذرا سوچو تو۔ اگر ایک نیم خواندہ پنساری ہزاروں ڈبوں کے محل وقوع سے واقف ہو سکتا ہے تو تم اتنی اعلیٰ قابلیت کے مالک ہوتے ہوئے کیوں سپر انداز ہو رہے ہو حوصلہ کرو۔ تم انشااللہ اس پل صراط کو بخوبی عبور کر جاؤ گے۔

چوہدری صاحب کی خالص "جٹکی" مثال نے میری ڈھارس بندھائی اور میرے دل کی دھڑکنیں نارمل ہونا شروع ہو گئیں۔ میرا کھویا ہوا اعتماد بحال ہونے لگا۔ ماہرین نفسیات کسی.... نفسیاتی لمحے (PSYCHOLOGIAL MOMENT) کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ یہ نقطہ بس یونہی چوہدری صاحب کے ہاتھ لگ گیا۔ میں نے عہد کیا کہ ہمت نہیں ہاروں گا اور

چیلنج کا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا...... ہرچہ بادا باد۔

اب تیسرے دن کی کارروائی سنیئے۔ انعام صاحب نے ایک کتاب میری جانب بڑھاتے ہوئے فرمایا: برخوردار! یہ کتاب پڑھو اور پھر اس پر تبصرہ (REVIEW) لکھو۔ دیکھو، یہ کام ہفتہ عشرہ کے اندر ضرور مکمل ہو جائے۔ اگلے ماہ کے لائبریری بلیٹن میں تمہارا یہ تبصرہ شامل کیا جائے گا۔ میں کتاب لے کر دفتر سے ڈھائی تین بجے کے لگ بھگ گھر پہنچا۔ تھوڑی دیر بقول راشد قیلولہ "فرمایا" اور پھر تازہ دم ہو کر کتاب کے مطالعے میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ میرے مطالعہ کی رفتار، اللہ کے فضل سے ذرا تیز ہے۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے ڈھائی سو صفحے کی کتاب کو پچھاڑ دیا۔ چلیئے۔ معرکہ کا ایک حصہ تو سر ہو گیا۔ اب میں نے قلم، کاغذ سنبھال کر اپنے تاثرات کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ آپ یقین جانیں، لکھتے وقت مجھے انشراح کی روح پرور کیفیات کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے قلم نے یکلخت دوڑنا شروع کر دیا اور دو گھنٹوں کے اندر اندر میں نے اپنا تبصرہ مکمل کر لیا۔ مسودے پر نظر ثانی کی تو ایک خاص مسرت کا احساس ہوا۔ خاصے کی چیز نہ سہی مگر تبصرہ اتنا بے جان بھی نہ تھا۔ اس عمل سے بڑا سکون ملا۔

رات کا بقیہ حصہ بڑے مزے میں کٹا۔

اگلی صبح تبصرہ انعام صاحب کی خدمت میں پیش کیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ تبصرہ پڑھ لینے کے بعد ان کے لبوں پر "بہت خوب" کے الفاظ رواں تھے۔ لائبریری کی آزمائش گاہ میں قدم رکھنے کے بعد یہ میری پہلی کامیابی تھی۔ اس واقعے کے بعد میں دو تین ماہ تک "زیر مطالعہ" (UNDER STUDY) رہا۔ اس دوران میں نے لائبریری کے بارے میں مقدور بھر معلومات حاصل کر لیں۔ شروع میں جو چیزیں مجھے بوجھل دکھائی دیتی تھیں، اب آسان نظر آنے لگیں۔ دریں اثنا، اپنی "انگریزی دانی" کا شہرہ عام ہو گیا اور لائبریری کی ترتیب و تزئین میرے سپرد کر دی گئی۔ میں نے انعام صاحب کی زیرِ نگرانی بلیٹن کے تین شمارے تیار کیے۔ الحمد اللہ۔ بلیٹنوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔

جون کے اوائل میں انعام صاحب اور کورس آفیسرز ایک ساتھ فارغ ہوئے اور اس کے ساتھ ہی مجھے پرموشن کے احکام موصول ہو گئے۔ انتظار کی گھڑیاں اختتام پذیر ہوئیں۔ نئے کورسوں کا آغاز اگست کے شروع میں ہونا تھا۔ یہ دو ڈھائی ماہ کا وقفہ میرے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔ میں نے اس درمیانی مہلت سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ میرا معمول یہ تھا کہ صبح دفتر پہنچ کر گھنٹہ، دو گھنٹہ ڈاک سے نمٹتا۔ باقی

وقت کتابوں کی "جامہ تلاشی" کی نذر کر دیتا۔ میری توجہ زیادہ تر کتاب اور اس کے مصنف کے نام پر مرکوز رہتی۔ گردپوش کی پشت پر درج تبصرے کو بڑے غور سے پڑھتا۔ اس سے کتاب کے مرکزی خیال سے مجھے کسی حد تک شناسائی ہو جاتی۔

یہ عمل میرے لیے بڑا مفید ثابت ہوا۔ کتاب کے مندرجات سے آگاہی نہ ہونے کے باوجود میں بڑے وقار اور اعتماد کے ساتھ فلیپ پر لکھی ہوئی عبارت کے سہارے اپنا بھرم قائم رکھ لیتا۔ کیوں نہ ہو۔ پطرس کا شاگرد جو ٹھہرا!

دفتر میں موصول ہونے والے رسائل اور اخبارات کو میں گھر اٹھا لاتا اور رات گئے تک ان کے مطالعے میں مصروف رہتا۔ اس عمل سے میرے دماغ کی گرہیں کھلنا شروع ہو گئیں۔ اب میر کے سرہانے آہستہ بولنے والا کرنل سرور، گولیوں کی باڑھ اور توپوں اور میزائیلوں کی بارش کے تناظر میں اپنے آپ کو خوش اسلوبی کے ساتھ (ADJUST) کر چکا تھا۔ اللہ پاک نے انسانی دماغ میں (ADAPTABILITY) کی بے پناہ قوت رکھی ہے۔ کامیابی کا انحصار البتہ اس عطیے کے کامیاب استعمال پر منحصر ہے۔

اگست میں نیا کورس شروع ہوا تو میرا یہ پہلا عملی امتحان تھا۔ افسر صاحبان اپنے مسائل لے کر میرے پاس

تشریف لاتے ۔ مجھے ہنوز اتنی مہارت تو حاصل نہ تھی کہ میں موقع پر ہی ان کی مشکل آسان کر سکتا ۔ میرا معمول یہ تھا کہ ان کی فرمائش اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتا ۔ اور ان سے اگلی صبح تک مہلت طلب کر لیتا ۔ پھر شام کے وقت اپنا ہوم ٹاسک مکمل کر لیتا ۔ اس ضمن میں مجھے اپنے ساتھیوں کا بھرپور تعاون حاصل تھا ۔ ہم سب سر جوڑ کر بیٹھ جاتے اور اپنی بساط کے مطابق متعلقہ حوالہ جات تلاش کر کے اطمینان کا سانس لیتے ۔ اگلی صبح میں یہ مواد "متلاشیان" کی نذر کر دیتا ۔ اس طرح لائبریری اسٹاف اور کورس افسروں کے درمیان ہم آہنگی کی خوشگوار فضا پیدا ہونے لگی اور انعام صاحب کی غیر حاضری کو محسوس کرنے کی نوبت ہی پیدا نہ ہوئی ۔

لائبریری کے جملہ امور کے ساتھ میں نے لائبریری بلیٹن پر خصوصی توجہ دینا شروع کی ۔ ہر ماہ میں تین چار کتابوں پر تبصرہ لکھتا ۔ تبصرہ لکھنے کا عمل بھی بڑا دلچسپ ثابت ہوا ۔ میں بنیادی طور پر انگریزی ادب کا طالب علم ہوں ۔ مگر یقین مانیئے مجھے فنِ حرب سے متعلق کتابوں پر تبصرہ لکھنے میں قطعاً کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی ۔ NAPOLEANIC CAMPAIGNS پر رائے زنی کرتے وقت مجھے یوں احساس ہوتا جیسے میں T. S. ELIOT کی کسی کتاب کا تنقیدی محاکمہ کر رہا ہوں ۔

میں اپنے تجربے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں محنت اور خلوص کا کوئی بدل نہیں۔ محنت انسان کی بہت سی کمزوریوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اللہ نے اپنے خصوصی فضل وکرم سے مجھے جس کامیابی سے نوازا، اس کا راز بھی میری محنت میں مضمر ہے۔ لائبریری سائنس کی ابجد سے نابلد ہونے کے باوجود میں نے اپنی افادیت منوالی۔ یہ محض اس لئے ممکن ہو سکا کہ میں نے اپنے آپ کو کلی طور پر لائبریری کے کام میں جذب کر دیا۔ میری صبحیں بھی لائبریری کے لیئے وقف تھیں اور شامیں بھی۔ خدا کا شکر ہے، لائبریری کی شہرت روز افزوں ترقی پر ہے۔ کالج کے پرانے گریجویٹس جب لائبریری دیکھنے آتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے چھ سالہ قیام کے دوران متعدد ملکی اور غیر ملکی اہم شخصیتوں کو لائبریری دکھانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ الحمدللہ۔ سب حضرات اس کے اعلیٰ معیار پر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ باہر کے وفود جب لوٹ کر اپنے وطن واپس جاتے ہیں تو وہ اپنے لائبریری اسٹاف کو مطالعاتی دورے پر یہاں بھجوانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ ملکی لائبریریاں بھی اپنے اسٹاف کی صحیح ORIENTATION کی خاطر اپنے عملے کو ہمارے ساتھ ATTACH کرواتی ہیں۔ لائبریری کی ساکھ کا یہ عالم ہے کہ کسی مشکل حوالے کی ضرورت پڑے سیدھا این ڈی سی لائبریری کا رخ کیا جاتا

ہے ۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ہمیشہ کالج کے ایسے سربراہوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے جنہوں نے لائبریری کے لیئے جملہ فنڈز اور دیگر مراعات فراہم کیں اور مجھے اطمینان کے ساتھ کام کرنے کے مواقع فراہم کیئے ۔

اس لائبریری کی اہم خوبی یہ ہے کہ یہاں تازہ ترین کتب اور رسالہ جات دستیاب ہوتے ہیں ۔ ریفرنس کا طریق اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ مطلوبہ معلومات آنکھ جھپکنے کی دیر میں اسکالر کی میز پہ مہیا کر دی جاتی ہیں ۔ رسالوں کی INDEXING اور کتابوں کی CLASSIFICATION اس طرح کی جاتی ہے کہ انہیں ڈھونڈنے میں کچھ دیر نہیں لگتی ۔

کتابوں کے انتخاب میں ہم لوگ بہت احتیاط برتتے ہیں ۔ لائبریری کمیٹی کی جس کا میں ممبر سیکرٹری ہوں ، اوّلین خواہش یہ ہوتی ہے کہ کوئی نئی چھپنے والی کتاب ہماری نظروں سے بچ کر جانے نہ پائے ۔ جونہی کسی کتاب کا اشتہار یا ریویو ہماری نظروں سے گزرتا ہے ہم کمانڈنٹ صاحب سے آشیرباد حاصل کرنے کے بعد اس کتاب کو فوراً خرید لیتے ہیں ۔ کئی بار ایسا ہوا ، کہ ہمارے ہاں آنے والے وفود نے اپنے ملک میں چھپی ہوئی تازہ کتابوں کو ہمارے ہاں دیکھ کر خوش گوار حیرت کا اظہار کیا ۔

اس ضمن میں ایک لطیفہ سنیئے ۔ سید ایم انور میگرا اہل

(MAC-GRAW- HILL) کے ریجنل منیجر ہیں۔ دو سال پہلے وہ ہمارے ہاں تشریف لائے۔ وہ اپنے ہمراہ دو کتابیں بھی لائے اور انہیں دکھانے سے پہلے فرمانے لگے۔ کرنل صاحب آپ کی لائبریری کے لیئے تازہ ترین کتابیں لایا ہوں۔ آپ دیکھیں گے تو یقیناً خوش ہوں گے۔ میں نے تجسس کا اظہار کیا تو انہوں نے اپنے بریف کیس سے DYNAMIC THANKING FOR EFFCTIVE MILTARY COMMAND اور MANAGEMENT OF DEFENCE نکالیں۔ میں نے ان کتابوں کو دیکھا تو اپنے اسسٹنٹ لائبریرین صوبیدار میجر محمد عبداللہ سے کہا کہ وہ تازہ لائبریری بلیٹن اور ACCESSION رجسٹر لیتے آئیں۔ جب یہ دونوں چیزیں آگئیں تو میں نے بلٹین کی کاپی انور صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے ان کی توجہ اس ریویو آرٹیکل کی جانب مبذول کرائی جو میں دو ماہ قبل ان کی پہلی "تازہ ترین" کتاب پر لکھ چکا تھا۔ پھر ACCESSION RIGISTER دکھاتے ہوئے اس تاریخ کی نشاندہی کی جب ہم نے ان کی دوسری کتاب خریدی تھی یہ کتاب ہمارے پاس آٹھ ماہ پہلے پہنچ چکی تھی۔

انور صاحب یہ سب کچھ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ فرمانے لگے میگراہل کے ہم پاکستان میں باضابطہ ایجنٹ ہیں۔ اور یہ کتابیں حال ہی

ہی ریلیز ہوئی ہیں۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہوا کہ یہ آپ کے ہاں چھ، آٹھ ماہ قبل پہنچ گئیں۔ خیر۔ جب میں نے انہیں اپنے طریق کار سے آگاہ کیا تو انہیں اطمینان ہوا۔ کراچی پہنچ کر انہوں نے کالج کے کمانڈنٹ صاحب کو جو ڈی۔ او۔ لیٹر لکھا، اس میں یہ بات اہتمام کے ساتھ درج تھی کہ انہوں نے میگرا ہل سے گذشتہ ۱۵ سالہ رفاقت کے دوران ایسا کبھی نہیں دیکھا کہ کتاب اپنی رونمائی سے پہلے ہی کسی لائبریری میں نہ صرف پہنچ جائے، بلکہ ریویو کی لپیٹ میں بھی آجائے۔

خودستائی کی بات چل نکلی ہے تو اجازت دیں، تھوڑی سی لاف زنی اور کر لوں۔ میں نے لائبریری کی ترتیب و تزئین میں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا ہے کہ اس کام میں میرا کردار ایک فن کار (ARTIST) کا ہونا چاہیئے، ایک اہل حرفہ (ARTISAN) کا نہیں۔ آرٹسٹ کے ڈانڈے روحانیت سے جا ملتے ہیں۔ جب کہ بیچارا مستری یا بڑھئی صرف تنورِ شکم بھرنے کی خاطر کام میں جُتا رہتا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں کو بھی اس بات کی تلقین کرتا ہوں کہ وہ سچے جذبے اور لگن کے ساتھ کام کریں کیونکہ علم کا عام کرنا انتہائی مقدس عمل ہے اور اس پر پہرہ بٹھانا (EMBARGO) جاہلوں کا شیوہ ہے۔ میرا ایمان ہے کہ کوئی فعال لائبریری صرف پیسے کے بل بوتے پر پنپ نہیں سکتی۔

لائبریری چلانے کے لیئے خلوص، محنت، لگن اور وابستگی (INVOLVEMENT) کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیسے کے بل بوتے پر بہت عمدہ گودام (WARE HOUSE) تو کھڑا کیا جاسکتا ہے، لائبریری نہیں بنائی جا سکتی۔

اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اچھی لائبریری کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قارئین کے اندر خود اعتمادی کا احساس پیدا کرے۔ لائبریری استعمال کرنیوالوں کو اس امر کا پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ ان کی ہر مشکل حل کرنے کے لیئے لائبریری اسٹاف ہر لحظہ خدمت کے لیئے موجود ہے۔ اعتماد کو اس مقام تک پہنچانے کے لیئے بلا شک اسٹاف کو بڑی محنت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کے عوض انہیں روحانی آسودگی کی شکل میں جو انعام ملتا ہے، اس کا بھی کوئی بدل نہیں۔

لائبریری آفیسر پہ لازم ہے کہ وہ دوسری لائبریریوں سے براہ راست رابطہ (LIAISON) قائم رکھے۔ کوئی لائبریری تنہا خود کفالت SELF - SUFFIENCY کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اسے لامحالہ دوسری لائبریریوں کا تعاون حاصل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ بہت ضروری ہے کہ پیشہ ورانہ چشمک کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تمام معاصرین کے ساتھ انتہائی خوشگوار تعلقات استوار کیئے جائیں۔ میں اس لحاظ سے بڑا خوش قسمت ہوں کہ پنڈی،

اسلام آباد، لاہور، کراچی، بہاول پور اور فیصل آباد میں قائم اعلیٰ درجے کی لائبریریوں سے میرے بہت عمدہ مراسم ہیں۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی بروقت مدد کرتے ہیں اور اس طرح "ثواب دارین" حاصل کرتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ملک میں کئی ایسے مخیّر ادارے اور افراد موجود ہیں جو ہماری لائبریری کو کتابوں کی شکل میں تحائف سے نوازتے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں ایشیا فاؤنڈیشن، بیگم عائشہ باوانی ٹرسٹ، موتمرِ عالم اسلامی، الاحبا اور اسطرح کی دیگر تنظیموں نے اپنی گراں قدر مطبوعات ہمیں عطا فرمائی ہیں۔ عائشہ باوانی ٹرسٹ گروپ کے کارپردازان ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ انہوں نے دیگر مطبوعات کے علاوہ قرآن پاک کے تین سو سے زائد نسخے بھی مرحمت فرمائے۔ کالج کے تمام افسروں کو یہ نسخے تقسیم کر دیئے گئے۔ اس طرح صدقۂ جاریہ کا یہ سلسلہ بڑی پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا۔ یہاں ایک اور مخیّر صلاح الدین صاحب کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ موصوف نے اپنے مرحوم بھائی ایم اکبر خان کی یاد میں ہمیں چونسٹھ کتب عنایت فرمائیں۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس نیکی کی جزا دے اور ان کے مرحوم بھائی کو بلند درجات سے نوازے۔ اس طرح اٹامک انرجی کمیشن بھی ہمارے خصوصی شکریے کا مستحق ہے جس نے ہمیں تحفے کے طور پر دو عدد مائیکرو فش ریڈرز MICRO FISHE READERS عطا کئے۔

معزز قارئین! این ڈی سی لائبریری کے مجھ پر اتنے احسان ہیں کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں۔ میری ذہنی تربیت میں اس لائبریری نے جو کردار ادا کیا، اس کے مثبت نتائج اب سامنے آ رہے ہیں۔ میرے مطالعے میں جو وسعت اور تازگی پیدا ہوئی، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے مختلف قومی مسائل پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں یہ بات بڑے عجز اور انکسار کے ساتھ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ گزشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں میرے ایک سو پینتیس مضامین ملک کے مختلف معیاری رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔ اللہ کا کرم ہے۔ اس نے مجھے اُردو اور انگریزی ہر دو زبانوں میں لکھنے کی صلاحیت بخش رکھی ہے۔ آپ میرے مضامین کی فہرست پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو دکھائی دے گا کہ میں نے گوناگوں موضوعات پر "خامہ فرسائی" کی ہے۔ ان میں ملٹری سوشیالوجی اور ملٹری اسٹریٹجی جیسے ٹھوس مسائل بھی شامل ہیں اور ہلکے پھلکے مضامین بھی موجود۔ میرے کرم فرما جن میں بریگیڈیئر الیس کے ملک اور جناب اے ایچ سہروردی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں، مجھے عرصہ سے کسی ٹھوس موضوع پر کتاب لکھنے کی ترغیب دیتے چلے آ رہے ہیں اور میں نے ان کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے صیہونیت (ZIONISM) پر تحقیقی کام کرنا شروع بھی کر دیا تھا۔ پھر حالات نے یک لخت پلٹا کھایا اور مجھے اس موضوع کو پس پشت ڈال کر

یہ آپ بیتی والا ڈول پہلے ڈالنا پڑا۔ اس کی تفصیل بعد میں عرض کروں گا۔ اب آپ کو تھوڑی دیر اپنے گھر لیے چلتا ہوں۔

بیٹی شفقت خالدہ کا ذکر تو آپ پچھلے صفحوں میں کئی بار سن چکے ہیں۔ یہ بہادل نگر سے پوسٹ ہو کر پنڈی پہنچی تو ہم نے اسے اپنے "اصلی گھر" پہنچانے کی تیاریاں شروع کر دیں..... "بابل" کا گھر تو بچیوں کا عارضی ٹھکانہ ہے۔ اللہ نے کرم کیا۔ ایک مناسب رشتے کا انتظام فرما دیا۔ اور پھر ۱۴؍جولائی ۱۹۷۷ء کو ہم نے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اپنی لاڈلی، ناز و نعم میں پلی ہوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحبزادی کو ڈولی میں بٹھا کر اللہ کے سپرد کر دیا۔ رخصتی کے وقت احباب نے مجھے خلافِ توقع، صبر و سکون کا مظاہرہ کرتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اپنی طبیعت تو بڑی گداز واقع ہوئی ہے۔ اور پھر ایسے موقعوں پر..... دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔ بات ذرا راز کی ہے۔ چلیئے۔ بتلائے دیتا ہوں۔ آپ سے کیا پردہ۔ ہوا یوں کہ رخصتی سے گھنٹہ، دو گھنٹہ قبل میں اپنے اسٹڈی روم میں گھس گیا اور قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور پھر میرے دل کا نرم و نازک ساز، جو کافی دیر سے تشنۂ مضراب تھا، جھٹ مصروفِ عمل ہو گیا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو حالت یہ تھی کہ چراغوں میں روشنی نہ رہی۔

مسکراہٹ لبوں پہ دل غمگین
اس بہار و خزاں کو کیا کہیئے

باب — ۲۳

ایک خونی حادثے کی رُوداد

پیارے قارئین! ۱۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو بیٹی کی رخصتی عمل میں آئی۔ میں ہنوز اس کی جدائی کے صدمے سے عہدہ برا نہ ہونے پایا تھا کہ خود ایک خونی حادثے کا شکار ہو گیا۔ ہوا یوں کہ ۴ ستمبر ۱۹۷۷ء بمطابق ۱۹ رمضان ۱۳۹۷ھ کی شام کو میں نے پنڈی سے اسلام آباد جانے کا پروگرام بس یونہی بیٹھے بیٹھے بنا لیا۔ سوچا، موسم خوشگوار ہے۔ کرنل انور سے جا کر مل آتا ہوں۔ وہ اکثر شاکی رہتے ہیں۔ میں اپنے خول سے باہر نہیں نکلتا۔ کرنل صاحب کے ہاں حاضری دے آؤں گا۔ وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور اپنا روزہ بھی بہل جائے گا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

میں نے اپنا موٹر سائیکل گیراج سے نکالا اور تیل پانی چیک

کرنے کے بعد اسے سڑک پر ڈال دیا۔ میری ڈرائیونگ کی رفتار چشم بددور، کبھی پانچ میل فی گھنٹہ سے تجاوز نہیں کرتی۔ کوئی راہ گیر ہاتھ یا انگوٹھے کے اشارے سے لفٹ مانگ لے تو میرے اسکوٹر پر سوار ہوتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہونے لگتے ہیں۔ چیونٹی کی مانند رینگنے والی سواری پر بیٹھنا کون پسند کرے گا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ۴؍ ستمبر کی شام کو میں عازم اسلام آباد ہوا۔ چال وہی بے ڈھنگی جس کا حال آپ سن ہی چکے۔ زیرو پوائنٹ (ZERO POINT) تک سفر اچھا کٹا۔ میں مزے مزے سے چلا جا رہا تھا کہ پیچھے سے آنے والی گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی ایک دیو ہیکل بس نے ٹھوکر مار کر مجھے ریزہ ریزہ کر دیا۔ اسکوٹر اور بس کے مابین "معانقے" کی دیر تھی کہ میں ہوش و خرد کی بازی ہار بیٹھا ؎

کام تھے عشق میں بہت پر میرؔ
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ جب میں زمین پر گرنے کے بعد خاک اور خون میں تڑپ رہا تھا تو جائے حادثہ پر ایک کار رکی۔ نیک دل مالک نے یہ دلخراش منظر دیکھا تو اس کا دل پسیج گیا اور اس نے جھٹ مجھے گاڑی میں ڈال کر پولی کلینک اسلام آباد پہنچا دیا۔ زندگی، موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اس مردِ خدا کے بروقت

اقدام نے میری جان بچانے میں بڑا موثر کردار ادا کیا۔ میں اپنے اس نامعلوم محسن کے حضور سلام پیش کرتا ہوں۔

پولی کلینک کے ماہرین نے میرے ٹوٹے پھوٹے بدن کو دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ مریض جان کنی کے عالم میں ہے۔ انہوں نے میرا شناختی کارڈ تلاش کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ ناچار انہوں نے مجھے جھنجھوڑنا شروع کر دیا تاکہ میں انہیں نام، پتہ فون نمبر وغیرہ بتا سکوں۔ میں اُدھر دنیا و مافیہا سے بے خبر زندگی اور موت کی بھیانک کش مکش میں دوچار پڑا تھا۔ ایسے میں نام، پتہ بتلانے کا ہوش کہاں!

مگر نہ صاحب! یہاں ایک انہونی سی بات مجھ سے سرزد ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ڈاکٹر صاحب نے جو بات پوچھی، اس کا جواب میں نے صحیح صحیح دے دیا۔ انہیں اپنا نام بتایا، فون نمبر بتایا۔ غرض، انہوں نے جو کچھ پوچھا، اس کا صحیح جواب دیا۔ یہ کیوں کر ممکن ہوا، اس کا تو مجھے خود علم نہیں۔ شاید کوئی ماہر نفسیات عقدہ کشائی کر سکے۔

اب ہسپتال والوں کی مشکل آسان ہو چکی تھی۔ انہوں نے بیک وقت میرے گھر اور سی ایم ایچ راولپنڈی میں اس حادثے کی اطلاع کرا دی۔ سی ایم ایچ والوں نے اطلاع ملتے ہی ایک ایمبولینس گاڑی اسلام آباد روانہ کر دی۔ اُدھر میرے گھر والوں کا حال سنیئے۔ فون کی

گھنٹی بجتی ہے۔ میرا چھوٹا لڑکا سہیل سرور لپک کر ریسور اٹھاتا ہے۔

"ہیلو۔ کیا یہ کرنل سرور کا گھر ہے؟"

"جی ہاں۔ میں ان کا بیٹا سہیل بول رہا ہوں۔ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"جی بیٹے! میں پولی کلینک سے ڈاکٹر بھٹی بول رہا ہوں۔ آپ کے ابو کا ابھی ابھی اسلام آباد میں ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ وہ یہاں ہسپتال میں بے ہوش پڑے ہیں۔ انہیں کسی فوجی ہسپتال میں پہنچانے کا اہتمام کیجئے۔ اور ذرا جلدی۔"

سہیل، اہل خانہ کو یہ منحوس خبر سناتا ہے اور پورے گھر میں کہرام کی کیفیت بپا ہو جاتی ہے۔ نالہ و شیون، گریہ و فریاد، آہ و بکا ...... غرض قیامت کا سماں بندھ جاتا ہے۔ گھر میں کوئی ذمہ دار فرد موجود نہیں۔ بیگم خون کے دباؤ کی دیرینہ مریض ہے۔ چھوٹے بھائی، میجر ضیا کاکول میں تعنیات ہیں۔ بڑی لڑکی پروفیسر شفقت خالدہ اب اپنے گھر کی ہو چکی ہے۔ ایسے میں اب ساری ذمہ داری میرے بڑے لڑکے ندیم سرور کے سر آن پڑتی ہے جو خود دسویں جماعت کا طالب علم ہے۔

ندیم، ماشا اللہ، اپنے اعصاب برقرار رکھتا ہے۔ اپنی امی، اور بہن بھائیوں کی ڈھارس بندھاتا ہے اور انہیں گاڑی میں بٹھا کر اپنی باجی کے گھر جا پہنچتا ہے۔ وہ بے چاری حادثے کی خبر

سنتے ہی دیوانہ وار دیواروں سے سر پٹخنے لگتی ہے۔ وہ تو اپنے ابو کی چہیتی بیٹی ہے!

بیٹی شفقت اپنے میاں، محمد اقبال مغل کے ہمراہ، چیختی، پیٹتی، بالوں کو نوچتی اس دکھی قافلے میں آن شامل ہوتی ہے۔ ندیم اور اقبال اسے سہارا دیتے ہیں۔ مگر آنسوؤں کا سیلاب ہے جو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

یہ پریشان حال قافلہ، ہسپتال کی چار دیواری میں قدم رکھتا ہے تو ایک بھیانک خوف اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ جانے، کس قسم کی خبر اس کی منتظر ہو۔ خدانخواستہ، سرخیٔ عنوان سے اگر اپنی حیاتِ مستعار کا رشتہ کٹ جانے کی خبر ان کے کانوں میں پڑی، تو ان پر کیا گزرے گی۔ اسی ادھیڑ بن کی حالت میں وہ میرے قریب آن پہنچتے ہیں۔ اس وقت آنسوؤں کی جھڑی ہے جو ہر آنکھ سے رواں ہے۔ سب کے دل ہیں جو تیزی سے دھک دھک کر رہے ہیں۔

اُدھر میں انتہائی بے بسی کے عالم میں بے ہوش پڑا ہوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میرے خاندان کے افراد کب اور کیونکر وہاں پہنچے۔ مگر سنیئے! اب کی بار پھر میں اپنی آنکھیں کھول کر گھر کے ہر فرد کو اس کے نام سے پکارتا ہوں۔ اور یوں، بے ہوشی کے عالم میں بھی، انہیں اپنے ہوشمند ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہوں۔ بچوں کو تسلی دلاتا ہوں کہ حادثہ بہت سخت تھا، مگر اللہ نے بچا لیا۔ بس معمولی چوٹیں

آئی ہیں۔

بچے پوچھتے ہیں۔ "ابو! آپ تو روزے سے تھے۔ پھر افطار کیسے کیا؟"

جواب: "جی بیٹے! میں جب چوٹ کھا کر منہ کے بل گرا تو میرے سر اور ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ یہ خون میرے ہونٹوں کو مَس کرتا ہوا میرے حلق کو بھی تر کر گیا۔ آج میں نے اپنے خون ہی سے افطاری کی ہے۔"

اور بچے میری یہ بات سن کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے ہیں۔ "ابو! آپ تھوڑے سے انگور کھالیں۔ کچھ سہارا مل جائے گا۔" اور میں بے اختیار منہ کھول دیتا ہوں۔ بچے، انگور کا رس میرے منہ میں نچوڑنے لگتے ہیں۔ لیجئے، ہو گئی اب ہماری باضابطہ افطاری!!

باہر ایمبولینس گاڑی منتظر کھڑی ہے۔ ہسپتال کا عملہ اپنی رسمی کاروائی پوری کرنے کے بعد مجھے گاڑی میں ڈال دیتا ہے۔ بچے بتاتے ہیں کہ جب مجھے بستر سے اٹھایا جا رہا تھا تو میرے چہرے پر شدید کرب کے آثار اُبھر رہے تھے جو میری خستگی کی گواہی دے رہے تھے۔

بیٹی شفقت اور اس کی امی میرے ہمراہ ایمبولینس میں بیٹھ جاتی ہیں۔ باقی بچے گاڑی میں سوار ہو کر سی ایم ایچ جاتے ہیں۔

شفقت بتاتی ہے کہ میں راستے میں پیاس کی شدت کا ذکر کرتا ہوں اور پھر پانی کی چند بوندیں میرے حلق سے نیچے اتار دی جاتی ہیں۔ سی۔ ایم۔ ایچ پہنچ کر جب مجھے گاڑی سے نیچے اتارا

جا رہا ہوتا ہے تو میں اپنی بیٹی سے یوں مخاطب ہوتا ہوں :

"بیٹے! یہ جو لیڈی ڈاکٹر آ رہی ہیں، انہیں کہنا۔ ابّو کا علاج اچھی طرح کریں۔ ہم لوگ تو ویسے بھی آج ان کے گھر جانے والے تھے۔ اچھا ہوا، یہ خود ہی آگئیں۔"

میری یہ بات سُن کر شفقت پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ اسے پہلی بار شک گزرتا ہے کہ ابو ہوش میں نہیں ہیں اور یوں ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ حیران ہو کر بیٹی پوچھتی ہے "ابو آپ کس لیڈی ڈاکٹر کی بات کر رہے ہیں؟ ہمیں تو کسی کے گھر نہیں جانا تھا۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ ہوش میں تو ہیں؟"

"ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں۔ میں بالکل ہوش میں ہوں۔ میں تو بس یونہی کہہ رہا تھا کہ یہ بات اگر تم ڈاکٹر صاحبہ کو کہہ دو تو وہ خوش ہو جائیں گی۔ پتہ نہیں تم یونہی کن اندیشوں کا شکار ہو گئی ہو۔ کچھ تعلقاتِ عامہ کے گُر بھی سیکھو۔"

اس طرح میری بے ہوشی کا راز فاش ہوتے ہوتے رہ گیا اور سب لوگوں کو میری توجیہہ پر یقین آگیا۔

اور آئیے۔ اب سی۔ایم۔ایچ کے آفیسرز وارڈ میں چلتے ہیں۔ مجھے (DANGEROUSULY ILL) D.I. لسٹ پر رکھا جاتا ہے۔ ماہرین کا پورا بورڈ میری جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہا ہے۔ مجھے ایکسرے وارڈ میں پہنچایا جاتا ہے

جہاں میری ایک پرانے جاننے والے شاگرد سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ مگر میں اس کی ڈھارس بندھاتا ہوں۔ قارئین! یاد رہے یہ سب کچھ "عالم بے خودی" میں ہی ہو رہا ہے۔

دوسری صبح میرے حادثے کی خبر جنگل کی آگ کی مانند پوری چھاؤنی میں پھیل جاتی ہے۔ خبر سنتے ہی کالج کے کمانڈنٹ جنرل اعوان اور آرمی ایجوکیشن کے ڈائرکٹر، بریگیڈیئر سید نصیر الدین تیمار داری کے لیئے تشریف لاتے ہیں۔ میں آداب بجا لاتا ہوں، انہیں تسلی دیتا ہوں اور پھر آنکھیں موند لیتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحبان نے میرے ملنے والوں پر پابندی لگا رکھی ہے۔ مگر یہ سیلاب تھمنے والا کہاں ہے۔ ایک سیل رواں ہے جو بڑھتا چلا آ رہا ہے ہر آنکھ پُرنم ہے۔ میرے ملنے والوں کی صف میں افسر، ماتحت، چھوٹے، بڑے سبھی شامل ہیں۔ سب لوگ میرے دکھ کو اپنا دکھ سمجھ کر میری تیمار داری کرنے تشریف لاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ ہم "مرجع خلائق" جو ٹھہرے!

برادرِ عزیز میجر ضیا اگلی صبح کاکول سے انتہائی بے بسی، بے چارگی اور کرب کے عالم میں میرے سرہانے پر آن گرتا ہے۔ میں اُسے تسلی دیتا ہوں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ نے اپنے برگزیدہ بندوں کے صدقے میری جان بچا لی ہے۔

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت!

میں ہسپتال میں تین دن بے ہوش پڑا رہتا ہوں۔ اس دوران میرے ملنے والوں کی تعداد سینکڑوں سے تجاوز کر جاتی ہے۔ میں ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ان کے سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ اس طرح کسی کو خبر نہیں ہو پاتی کہ مریض ہوش و خرد کی بازی ہار چکنے کے بعد ہوشمندی کا خول اپنے اوپر چڑھائے بیٹھا ہے۔

ایکسرے کی رپورٹ کافی پریشان کن ہے۔ میری سات پسلیاں ٹوٹ کر پھیپھڑوں میں پیوست ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے، یہ پسلیاں اگر زیادہ دیر اسی طرح الجھی رہیں تو پھر سانس کا عمل بحال نہیں ہو سکے گا اور معاملہ خاصی پیچیدہ شکل اختیار کر جائے گا۔ اُدھر اپنا بایاں بازو بھی متعدد جگہوں سے ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔

میں سانس لینے کے عمل میں سنگین دشواری کا سامنا کر رہا تھا۔ اُدھر میری انگلیوں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور ماتھے سے خون رس رہا تھا۔ ٹھیک تین دن کے بعد جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو سی۔ ایم۔ ایچ کے آفیسر وارڈ میں پڑا ہوا پایا۔ بچوں کو اپنے قریب دیکھ کر میں نے حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ انہوں نے حادثے کی ساری

روئیداد کہہ سنائی اور میری پچھلی تین دن کی حرکتوں پر تبصرہ کیا۔ میں یہ سب باتیں سن کر حیران رہ گیا۔

میں ایک طویل عرصہ تک ہسپتال میں ایڈمٹ (ADMIT) رہا، تقریباً چھ ماہ۔ شروع شروع میں مجھے سانس لینے میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے، جلد ہی یہ تکلیف رفع ہونے لگی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے لمبے لمبے سانس لینے کی تلقین کی تھی، جس پر میں نے پوری طرح عمل کیا۔ اس ایکسرسائز سے میری ٹوٹی ہوئی پسلیاں پھر سے جڑنے لگیں اور سانس کی رفتار نارمل ہونے لگی۔ یہی حال دوسرے زخموں کا تھا۔ ایک ایک کرکے سب مندمل ہونے لگے۔ البتہ سب سے زیادہ سخت جان میرے بازو کا فریکچر ثابت ہوا۔ ٹھیک ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اس کی خاطر مجھے تین بار آپریشن کی صعوبتوں سے دو چار ہونا پڑا۔ GRAFTING BONE PLANTING جیسی انتہائی کاروائی عمل میں لانے کی ضرورت بھی پیش آئی۔ اس کے باوجود بازو اپنی اصل حالت میں ہنوز نہیں لوٹ سکا ہے۔ اس میں خمیدگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔

یہ حادثہ میری زندگی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے میرے ذہن میں کئی سوالیہ نشان ابھرتے ہیں اور کئی اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں۔ اس اجمال کی ہلکی سی

تفصیل آپ بھی سن لیں۔

بے ہوشی کے عالم میں پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ ہوش و خرد کا مظاہرہ کرنا میرے لئے ہنوز ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ دوست کہتے ہیں کہ میری چھٹی حس بہت بیدار ہے۔ کچھ ساتھیوں کا کہنا ہے کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ شعور جب اپنا کام چھوڑ دیتا ہے تو لاشعوری قوتیں آگے بڑھ کر اس کی ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہیں۔ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ یہ سب قوتِ ارادی کا کرشمہ ہے۔ میرے چند ساتھی مجھے باور کراتے ہیں کہ مجھ پر اللہ کے نیک بندوں کی خصوصی نظرِ کرم ہے۔

میں خود کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ مگر خیال ہے کہ آخری بات زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

دوسری بات: ڈاکٹر صاحبان میری صحت یابی کے امکانات سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ بات تھی بھی ٹھیک۔ مگر دیکھئے۔ اللہ تعالےٰ نے نہ صرف مجھے نئی زندگی عطا کر دی بلکہ میری تمام ذہنی جسمانی اور فکری صلاحیتوں کو برقرار رکھا اور کوئی صلاحیت متاثر نہیں ہونے پائی۔ شروع شروع میں یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ میری قوتِ حافظہ شائد متاثر ہو جائے۔ الحمد اللہ۔ میرے خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے۔

ان سب باتوں پر غور کرتا ہوں تو مجھے دعا کی بے پناہ تاثیر

اور اس کی بھرپور قوت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ آپ یقین جانیں، میری صحت یابی کی خاطر سینکڑوں ہاتھ بلند ہوئے، ہزاروں آنکھیں اشکبار ہوئیں اور ان گنت جبینیں سجدہ ریز ہوئیں۔ یہ ان دعاؤں کا اعجاز ہی تو ہے کہ میں آج حدیثِ دل سنانے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

باب — ۲۴

حرفِ آخر..... چند یادیں چند باتیں

پیارے قارئین! سچ کہتے ہیں مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی۔ گذشتہ دو تین سالوں میں مجھے بڑے جگر خراش حادثات اور صدموں سے دو چار ہونا پڑا۔ حادثے کی داستان تو ابھی آپ نے سنی۔ اب دوسرے صدموں کی ہلکی سی جھلک!

میری بدقسمتی، میرے والدین بہت پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ان سے جدائی کا احساس ہر لحظہ دامن گیر رہتا۔ مگر اس محرومی کی تلافی کسی حد تک میرے بڑے بھائی محمد صادق کر دیا کرتے تھے۔ موصوف میرے بڑے بھائی ہی نہ تھے۔ روحانی باپ کا درجہ بھی رکھتے تھے۔ حد درجہ خدا ترس، عبادت گذار، سادہ منش، رزقِ حلال پر قناعت کرنے والے انسان تھے۔ طبعاً خاموش طبع واقع

ہوئے تھے ۔ صرف کام کی بات کرتے ۔ غیبت اور بدگوئی سے کوسوں دور بھاگتے ۔ اپنے کام سے سروکار رکھتے اور بس ۔ اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور اپنی اولاد کے حصّے کا پیار میرے بچوں پر نچھاور کرتے ۔ گاؤں میں کاروبار کی معمولی سی صورت نکال رکھی تھی ۔ یہ دکان تو محض ایک مشغلہ تھا ۔ ان کا اصل کام تو تبلیغِ دین تھا جس میں وہ ہمہ تن مصروف رہتے ۔ وہ اپنی دینی کتب اور رسائل کو اپنے گاؤں کے پڑھے لکھے طبقے میں تقسیم کر دیتے ۔ اس طرح ان کی کوششوں سے دین پسند احباب کا ایک خاص حلقہ تیار ہو گیا ۔ انہیں اگر کسی شخص کے اندر دین کی تڑپ دکھائی دیتی تو وہ اس پر خصوصی توجہ دیتے ۔ اسے ایمان افروز باتیں سناتے اور اس کے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ فرماتے ۔

ان کی صحت قابلِ رشک حد تک اچھی تھی ۔ پھر کرنا خدا کا ایسا ہوا ۔ انہیں یک لخت کھانسی، زکام، اور بخار نے آن دبوچا ۔ پہلی بار جب وہ بیمار پڑے تو وہ ہمارے ہاں لاہور تشریف لے آئے ۔ میں نے ان کا مقدور بھر علاج کرایا جس سے انہیں افاقہ ہو گیا تھا ۔ مگر چند برس بعد ان کا مرض پھر پوری شدت سے عود کر آیا ۔ اب کی بار یہ مرض جان لیوا ثابت ہوا ۔

بھائی صاحب دو سال تک میرے ہاں پنڈی میں صاحبِ فراش رہے ۔ اب کی بار مرض یہ تشخیص ہوا کہ ان کا دل بڑھ چکا ہے ۔

دل کو بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے باز رکھنے کا ہم نے پورا جتن کیا مگر بے سود۔ ان کی حالت بگڑتی چلی گئی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ۲۷ رمضان ۱۳۹۸ھ کی شب وہ اپنے مولائے حقیقی سے جاملے۔ ان کے بچھڑنے پر ہم پر جو گزری اسے قلم کی زد میں لانا میرے بس کی بات نہیں۔

دوسرا صدمہ پہلے سے بھی زیادہ بھیانک اور خوفناک تھا۔ والدین اور بھائی صادق کے چل بسنے کے بعد گھر کے جملہ انتظامات کو بہن سکینہ نے جس خوبی اور سلیقہ شعاری سے سنبھالا، وہ اسی کا حصہ تھا۔ عزیزہ مجھ سے چھوٹی اور میجر ضیا سے بڑی تھی۔ خلوص، محبت اور عقیدت کا پیکر۔ ماں باپ کی اتنی فرمانبردار کہ ان کی خوشنودی کی خاطر اس نے اپنی تمام خوشیوں کو ان کے قدموں میں بکھیر دیا۔ ملنسار، کشادہ دل اور ہمدرد اتنی کہ اس کی شہرت پورے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ سب لوگوں کا خیال تھا سکینہ، اپنی امی کی تصویر ہے۔ اور لوگوں کا اندازہ کچھ غلط بھی نہ تھا!! بہن سکینہ کے اندر قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی عمر دوسروں کی خاطر قربانیاں دینے میں گزاری۔ اوائل عمر میں ہی ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ہم دونوں بھائیوں کو تلاشِ روزگار کے سلسلے میں گاؤں سے باہر آنا پڑا۔ ہماری غیر حاضری میں ہماری پیاری بہن نے گھر کے معاملات کو اتنی خوش اسلوبی سے نبھایا کہ ہم سب

حیران رہ گئے۔

بہن سکینہ، تفکراتِ زمانہ کے ہاتھوں مغلوب ہو کر اوائل عمر سے ہی بیمار چلی آ رہی تھی۔ ایک طویل عرصہ تک وہ نسوانی امراض کا شکار رہی جس کی وجہ سے اولاد کی دولت سے اس کی جھولی خالی رہی۔ پھر وہ دل کے مرض میں مبتلا ہو گئی۔ دل بڑھنا شروع ہو گیا اور ساتھ ہی مرض کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔

عزیزہ ہمشیرہ کو دل کا دورہ پڑتا تو وہ بے ہوش ہو جاتی۔ پھر کافی دیر بعد اس کی طبیعت سنبھلتی۔ ستمبر ۱۹۷۷ء کی بات ہے جب مجھے خونی حادثے سے دو چار ہونا پڑا تو بہن کی گرتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر یہ خبر اس سے چھپائی گئی۔ مگر اسے کہیں سے ہلکی" بھنک" پڑ گئی۔ پھر اس نے پنڈی آنے اور میری خیریت معلوم کرنے کا عزم کر لیا۔ مگر کرنا خدا کا یوں ہوا، جس صبح کو پنڈی آنا تھا۔ اسے اسی دن اوپر سے بلاوا آ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ ہمشیرہ اپنے محلے کے ایک گھر میں تعزیت کے لئے گئی۔ وہاں پہنچی ہی تھی کہ اسے دل کا دورہ پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اس خبر سے علاقہ بھر میں کہرام مچ گیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس اچانک، بے وقت اور حسرت ناک موت پر پُرنم نہ ہوئی ہو۔

بہن کو ہم سے جدا ہوئے دو سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہے۔ مگر میرا ذہن اپنی پیاری بہن سے ابدی جدائی کی حقیقت قبول کرنے پر

تیار نہیں، مجھے اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ اپنی معصومانہ، پیار بھری مسکراہٹ بکھیرتی ابھی میرے ساتھ آ کر لپٹ جائے گی۔ کاش تمنائیں اور خواہشیں کبھی حقیقت کا روپ بھی اختیار کر لیتیں!!

قارئین! میں نے اپنے دل کے زخمی تاروں کو چھیڑ کر آپ کو بھی پریشان کر دیا ہے۔ اب اجازت طلب کرنے سے پہلے میں آپ کو یاد کرانا چاہتا ہوں کہ میرا ارادہ پہلے صہیونیت پر کام کرنے کا تھا۔ میرے اس سلسلے میں دو ایک آرٹیکل چھپ بھی چکے تھے۔ میں ایک دن اپنے دفتر میں بیٹھا LILIENTHAL کی معرکۃ الآرا کتاب ZIONIST CONNECTION کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ میرے دیرینہ کرم فرما عبدالکریم خالد اپنے ایک عزیز ساتھی انوار قمر کے ہمراہ میرے دفتر میں تشریف لائے۔ پوچھنے لگے۔ آپ کی آپ بیتی کس مرحلے میں ہے؟ جواب میں عرض کیا۔ حضور! مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے۔ ارشاد ہوا۔ نہ صاحب۔ یہ بات ہمیں منظور نہیں۔ آپ یہ سلسلہ جلد شروع کیجئے۔ ہم اسے کتابی شکل میں دیکھنے کے لئے بے قرار ہیں۔

یاد رہے، کہ عبدالکریم خالد، میری آپ بیتی کی وہ قسطیں، جو اظہار کراچی میں چھپی تھیں۔ پڑھ چکے تھے اور ان پر کئی بار اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کر چکے تھے۔

میری یہ عادت ہے کہ میں زیادہ دیر پس و پیش سے کام نہیں کر سکتا

جلد ہی سپر انداز ہو جاتا ہوں۔ دوستوں کے حضور سرنگوں ہو جانا تو عین برحق! خالد صاحب کے "بھرپور" اصرار کے پیشِ نظر میں نے سردست صہونیت پر کام روک دیا ہے اور اپنی آپ بیتی سنانے بیٹھ گیا ہوں۔ میری یہ طویل داستان سن کر آپ بھی کہہ رہے ہوں گے۔

سوداؔ، خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

برقی کتب (E_books) کی دنیا میں خوش آمدید

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں

مزید اس طرح کی شاندار، مفید اور نایاب کتب کے
حصول کے لیے ہمارے واٹس ایپ گروپ کو جوائن
کریں

ایڈ من پینل

محمد ذوالقرنین حیدر : 03123050300

محمد ثاقب ریاض : 03447227224

سدرہ طاہر : 03340120123